مرثیہ نظم کی اصناف میں...

جدید مرثیہ

اور

آغا سکندر مہدی

سید عاشور کاظمی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

بہ اجازت و تعاون

انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر

مرثیہ نظم کی اصناف میں...

جدید مرثیہ

اور

آغا سکندر مہدی

سید عاشور کاظمی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

جملہ حقوق محفوظ ہیں

MARŚIYA NAZM KI ASNAF MEIN _ _ _

JADEED MARSIYA AUR AGHA SIKANDAR MEHDI

By

SYED ASHOOR KAZMI

1996

ISBN : 0-948977-28-0

Price Rs. 200/

اشاعت اول ------------------------------ ۱۹۹۶

قیمت ------------------------------ ۲۰۰ روپے

برطانیہ میں ------------------------------ ۱۰ پونڈ

دیگر ممالک ------------------------------ ۱۵ ڈالر

مطبع ------- عفیف پرنٹرس لال کنواں دہلی-۶

ناشر

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Gali Azizuddin Vakil, Kucha Pandit

Lal Kuan, Delhi-6 Ph: 526162, 7774965

بہ اجازت و تعاون

INSTITUTE OF 3rd. WORLD ART & LITERATURE

16 Winder Mere Road London W5

آغا سکندر مہدی کی رفیق سفر

سیدہ نثار فاطمہ ایم اے، بی ٹی (مرحومہ)

کے نام

جو اس کتاب کو خود شائع کرنے پر مصر تھیں

لیکن

اس کی تکمیل کا انتظار کئے بغیر

سکندر مہدی کے پاس چلی گئیں

(عاشور)

مثنوی ہو کہ رباعی کہ قصیدہ کہ غزل
مرثیہ نظم کی اصناف میں سب سے اوّل

(آغا سکندر مہدی)

زندگی کے تپتے صحرا میں برسنے والے بادل کی طرح سایہ فگن
آغا سکندر مہدی کے بھائی جان
سید حیدر مہدی رضوی
کی محبت، شفقت اور حوصلہ افزائی کا اعتراف
جنہیں اُن کے اپنے بچّوں، شاہین - رضوانہ (بلّو) - سلیم - اسد کی طرح
میں بھی ببّا کہتا ہوں تو مجھے چین ملتا ہے

(عاشور)

ترتیب

عنوان | صفحہ

*****

مرثیہ نظم کی اصناف میں-----

.بلا کا میدان ہے۔
سادات بنی ہاشم کا قافلہ دریائے فرات کے کنارے خیمہ زن ہے۔ حسینؑ ابن علیؑ اس قافلے کے
بر کارواں ہیں۔ حسینؑ کے بھائی، قمرِ بنی ہاشم عباسؑ ابنِ علیؑ خیموں کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ عباسؑ کی
باعت پوری دنیائے عرب میں ضرب المثل کی طرح مشہور ہے۔
۱ محرم الحرام۔ خیموں کے باہر ایک شور سا بلند ہوتا ہے اور عباسؑ کی آواز سنائی دیتی ہے۔
"کس کی ماں نے اسے دودھ پلایا ہے جو میرے آقا حسینؑ کے خیمے دریا کی ترائی سے اُٹھوا
سکے۔"
سیدہ زینبؑ نے اپنے غیور بھائی کی آواز سنی تو خادمہ کو حالات جاننے کے لئے بھیجا۔ فضہؑ نے آکر بتایا کہ
یزید کی فوج نے سادات کے خیموں کو دریا کی ترائی سے ہٹانے کا مطالبہ کیا تھا، شہزادہ عباسؑ نے فوج کو
للکارا ہے۔ بی بی کسی لمحہ بھی عباسؑ کی تلوار نیام سے باہر آسکتی ہے۔
زینبؑ گھبرا کر اپنے ماں جائے حسینؑ کے خیمے کی طرف دوڑیں۔
"بھیا۔ آپ یہاں بیٹھے ہیں اور عباسؑ کا ہاتھ تلوار کے قبضے تک پہنچ چکا ہے"
حسینؑ نے غیض و غضب میں ڈوبے ہوئے عباسؑ کو بلایا اور وجہ دریافت کی۔
"میرے آقا، میرے جیتے جی کس کی یہ مجال کہ آپ کے خیمے دریا کی ترائی سے ہٹانے کا لفظ
اپنی نجس زبان پر لائے۔ میں ان کی زبانیں قلم کر دوں گا مولا"
حسینؑ نے بپھرے ہوئے شیر کو دیکھا اور بہت نرمی سے کہا۔
"خیمے ہٹا لو عباسؑ۔ ہمیں لڑائی میں ابتداء نہیں کرنی ہے"
اور وہ عباسؑ جس کی رگوں میں فاتح خیبر و خندق کا لہو گردش کر رہا تھا۔ وہ عباسؑ جس کی ایک گرج پر
پوری فوج لرزہ براندام سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہو گا۔ وہی عباسؑ، سر جھکائے ہوئے حسینؑ کے خیمے سے
باہر آئے اور فوجوں سے کہا۔
"میرے آقا کا حکم ہے، خیمے ہٹا لئے جائیں گے۔"
بڑے بھائی کے حکم پر اپنے جذبات، احساسات اور کمالات کی نفی کرنے کی یہ شاید پہلی مثال تھی
جو آج بھی تاریخ میں تابندہ ہے۔ حسینؑ اور عباسؑ کا یہ رشتۂ وفا آج نوع انسانی کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ یہ

قعہ ۶۱ ھجری کا ہے ۔ روشن ضمیر لوگ کربلا کے ہر واقعہ سے سبق لیتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہونے کی وشش کرتے ہیں ۔ اسی پیروی کی ایک زندہ مثال دیکھئے ۱۹۴۴ء میں ، ورثہ دارانِ شیوۂ سادات میں سے ایک سیّد زادہ سکندر مہدی رضوی لکھنؤ کے شیعہ کالج میں بارہویں جماعت کا طالب علم شیعہ کالج ہوسٹل میں قیام پذیر ہے ، اس کے بڑے بھائی سید حیدر مہدی رضوی لکھنو یونیورسٹی کے ہیوٹ ہاسٹل (Hewett) میں رہتے ہیں اور ایم کام کے سالِ اوّل میں زیر تعلیم ہیں ۔ اس دور میں جب راجہ مہاراجاؤں کے بچے ہی ہیوٹ ہوسٹل میں رہ سکتے تھے ، سکندر اور حیدر مہدی کے والد سید ظفر مہدی رضوی اپنے بچوں کو بہتر سے بہتر ماحول میں تعلیم دلوا رہے ہیں ۔ سکندر مہدی نویں جماعت سے شاعری کر رہے ہیں ۔ ان کے کالج پہنچتے پہنچتے ان کی شاعری کو ادبی حلقوں نے تسلیم کر لیا ہے اور " آجکل " ، دہلی اور " افکار " بھوپال جیسے معیاری پرچوں میں ان کا کلام شائع ہو رہا ہے ۔

اچانک ان کے والد کا انتقال ہو جاتا ہے ۔ دیندار لوگ عام طور پر زر و مال کی ذخیرہ اندوزی پر توجہ نہیں دیتے ۔ سید ظفر مہدی رضوی کا انتقال ہوا تو پتہ چلا کہ اس معزز گھرانے میں خوفِ خدا اور محبتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے علاوہ کوئی اثاثہ نہیں ہے ۔ بڑے بھائی حیدر مہدی رضوی نے تعلیم ترک کر کے ملازمت کر لی ۔ اور سکندر مہدی کو بلا کر کہا ۔

" آغا میاں ابّا میاں کے بعد تم اپنی اور میری ذمہ داریوں کو بھی سمجھتے ہو اور حالات کو بھی میں نے تعلیم ترک کر دی ہے لیکن تمہیں تعلیم مکمل کرنی ہے اور جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے ۔ جس طرح ابا نے سب کچھ ہماری تعلیم پر صرف کیا اسی طرح میں خود کو بیچ کر بھی تمہاری تعلیم مکمل کراؤں گا ۔ اب تم ساری توجہ اپنی تعلیم کی طرف دو یہ شاعری اور آرٹ لٹریچر کی باتیں چھوڑ دو اور سائنس اور حساب کے مضامین لو " ۔

اور آغا میاں نے شاعری چھوڑ دی ۔ گویا اپنے جدّ کی تاسّی میں فراتِ شعر و ادب سے فکر و عمل کے یے بنا ئے ۔ بیسویں صدی عیسوی میں بڑے بھائی کے حکم پر اپنی آرزوں ، امنگوں اور طرزِ فکر کو تج دینے ، شاید یہ بھی واحد مثال ہو ۔

جس وقت سکندر مہدی نے شاعری ترک کی اس وقت وہ ادب میں اپنا مقام بنا چکے تھے ۔ شاعری ہوڑنے کے ساتھ ساتھ شاید انہوں نے اپنے اس دور کا کلام بھی ضائع کر دیا ۔ سکندر کی بہن پروفیسر حشمت ماں ناز کے ایک مضمون " آغا بھائی جان " سے پتہ چلتا ہے کہ جب وہ نویں جماعت میں تھے اس وقت اس م کے اشعار کہا کرتے تھے ۔

دریا کے اُبلنے سے پہلے موجوں کے مچلنے سے پہلے
طوفانِ حوادث لے ڈوبا ، کشتی کو سنبھلنے سے پہلے
ساقی کے سنبھلنے سے پہلے ، محفل کے بدلنے سے پہلے
ہم جام و سبو کو توڑ چکے سورج کے نکلنے سے پہلے

اللہ اللہ وہ دیتے ہیں دعا جینے کی زندگی اور بھی دشوار ہوئی جاتی ہے
ہم خاک بن کے رہ نہ سکے کوئے یار میں اُڑتے پھرے ہیں گردشِ لیل و نہار میں
کہتے کیا داستانِ جوروستم اس میں ان کا بھی نام آ جاتا
کب کسی سے طلب گوارا کی ورنہ مجھ تک بھی جام آ جاتا
بات آغاؔ کی کاش سن لیتے تم کو طرزِ کلام آ جاتا

عشق کے مارے بیکل دیکھے اپنے بھی بیگانے بھی
شمع بھی جل کر ختم ہوئی اور خاک ہوئے پروانے بھی
بعد میں ہم کو یاد کرینگے اپنے بھی بیگانے بھی
شہروں شہروں ماتم ہو گا روئیں گے دیوانے بھی

سید حیدر مہدی رضوی ملازمت کرتے رہے اور سکندر تعلیم مکمل کرنے میں لگے رہے ۔ ۱۹۴۷ء میں سکندر نے بی ۔ اے پاس کیا ۔ دونوں بھائی پھر اکٹھے بیٹھے اور سکندر میاں نے بھائی سے کہا ۔

" بھائی جان ، آپ نے ہمارے لئے اپنا مستقبل داؤ پر لگا دیا ۔ اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں ملازمت کروں اور آپ اپنا ایم کام کا آخری سال مکمل کر لیں ۔ حیدر مہدی نے کہا میاں بی ۔ اے کی ڈگری کے بعد تم کلرکی کے علاوہ کیا کر سکتے ہو ۔ تم کم از کم بی ۔ ٹی کر لو " ۔

آخرکار اس شرط پر سکندر میاں کو بڑے بھائی نے ملازمت کی اجازت دی کہ سکندر ایک سال کے لئے ملازمت کر لیں اور حیدر مہدی رضوی ایم کام مکمل کر کے سکندر کو پھر داخلہ دلا دیں گے .... چنانچہ سکندر میاں نے ملازمت کر لی اور حیدر مہدی تعلیم مکمل کرنے میں لگ گئے اور ۱۹۴۸ء میں انہوں نے ایم کام مکمل کیا ۔

جون ۱۹۴۸ء میں حیدر مہدی پاکستان کے لئے رختِ سفر باندھ کر بمبئی کے لئے روانہ ہوگئے ۔ بمبئی پہنچے تو پتہ چلا کہ صرف تین دن قبل پرمٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور وہ بمبئی میں اٹک کر رہ گئے ۔

نوکری کی تلاش کی تو انہیں دو سو روپے ماہوار کی ملازمت ملی ۔ انہوں نے سو روپے ماہانہ والدۂ گرامی کی خدمت میں اور سو روپیہ ماہوار سکندر مہدی کو بھیجنے شروع کر دئے ۔ اور خود بیس روپے ماہوار کی ایک ٹیوشن کی آمدن پر زندہ رہے ۔ سکندر مہدی نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ۔

جنوری ۱۹۵۰ء میں حیدر مہدی کو پاکستان میں ملازمت اور پرمٹ مل گیا اور وہ پاکستان آ گئے ۔ سکندر مہدی نے بی ٹی کا امتحان دیا اور جون ۱۹۵۰ء میں اہل خاندان سمیت پاکستان میں بڑے بھائی کی خدمت میں پہنچ گئے ، جہاں حیدر مہدی رضوی انڈین ہیوم پائپ کمپنی کے چیف اکاؤنٹنٹ اور .Int Auditor تھے ۔ سکندر مہدی نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم ۔ اے کیا اور پھر محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے ۔ سب سے پہلے ان کی تعیناتی حسن ابدال میں ہوئی ۔ پھر جوہر آباد آئے اور پھر ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز کی حیثیت سے بہاولپور آ گئے ۔

حیدر مہدی رضوی نے بتایا کہ سالہا سال سے سکندر مہدی کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی ۔ پاکستان آئے تو یہ سوچ کر ان کی شادی کر دی گئی کہ شاید ان کی صحت سنبھل جائے لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ۔ ۱۹۵۵ء میں حیدر مہدی رضوی نے لاہور کے ایک ماہر نفسیات سے رجوع کیا اور سکندر مہدی کو ان کے سپرد کر دیا ۔ ماہر نفسیات نے چھان بین اور ماضی کو کریدنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ جس وقت ۱۹۴۵ء میں سکندر مہدی نے شاعری ترک کی تھی اس وقت ان کے اندر کچھ کہہ گزرنے کا جو لاوا پک رہا تھا اس کے اظہار کا راستہ بند ہوا تو اس کا اثر ان کے اعصاب پر پڑا ۔ ہرچند کہ اس عرصے میں سکندر مہدی نے مجالس پڑھنی شروع کر دی تھیں اور وہ صفِ اوّل کے خطیبوں میں شمار ہونے لگے تھے مگر نظم کا اُمڈا ہوا طوفان خطابت یا نثر کے سمندر میں نہ سما سکا ۔

ایک دن حیدر مہدی رضوی نے سکندر مہدی کو بلایا اور کہا ۔

" سکندر میاں میری مراد یہ تو نہ تھی کہ تم شاعری اس حد تک ترک کر دو کہ تمہارے اعصاب اسے برداشت نہ کر سکیں ۔ میں نے تو یہ سمجھ کر کہا تھا کہ تم کہیں شاعری اور شاعروں کے چکر میں پڑ کر اپنی تعلیم سے غافل نہ ہو جاؤ .... میں اپنے فیصلے پر شرمندہ اور تمہاری سعادت مندی پر نازاں ہوں ۔ اب تم شعر کہا کرو " ۔

اور سکندر مہدی نے بڑے ادب سے جواب دیا ۔

" بھائی جان ، میں نے اپنے مولا عباسؑ سے یہ سیکھا ہے کہ اطاعت کی منزل میں چونکہ ، چنانچہ یا اگر مگر کی گنجائش نہیں ہوتی ۔ حکم ماننا ہے تو ماننا ہے ۔ رہا سوال شاعری کا تو اب

نہ وہ ولولہ ہے اور نہ عمر کہ عشق و محبت یا ہجر و وصال کے قصے نظم کروں ۔ "

" میں چاہتا ہوں کہ تمہارے اندر کے جوہر سامنے آئیں ۔ " حیدر مہدی رضوی نے کہا ۔ " تم حمد و نعت ، قصائد و سلام کہہ سکتے ہو ۔ ناقص محبوب کی بجائے کامل ممدوح کی توصیف کر سکتے ہو ۔ تمہاری شاعری تمہاری خطابت کے شانہ بشانہ چلے گی " ۔

اور سکندر مہدی نے شعر کہنے شروع کر دئے ۔ بات حمد ، نعت ، سلام اور قصائد سے شروع ہوئی ۔ بہت جلد اہل فکر و نظر نے تسلیم کر لیا کہ سکندر مہدی آغا کے قصائد میں روایت کی بھرپور پاسداری کے ساتھ ساتھ جدت بھی ہوتی ہے اور ان کی مضمون آفرینی ۔ الفاظ پر گرفت ، چُست بند شیں آغا کی پہچان بن گئیں ۔

آغا سکندر مہدی کے قصیدے سے مرثیہ تک کے سفر کو حضرت نفیس فتح پوری نے " مرثیہ نور کے سانچے میں ڈھلا جاتا ہے " کے زیر عنوان یوں لکھا ہے ۔

اکتوبر ۶۷ء کا ذکر ہے ۔ حضرت شہاب دہلوی کے دولت کدہ پر ایک طرحی نعتیہ مقاصدہ کی محفل منعقد ہوئی ۔ میں نے بھی قصیدہ کہنے کی سعادت حاصل کی ۔ حضرت تابش الوری ، شہاب دہلوی ، نشتر لکھنوی نے بھی گل افشانی کی ، مجید تمنا بھی گہرہائے آبدار نچھاور کر گئے مگر قصیدہ جو آغا صاحب نے پیش کیا وہ حاصل مشاعرہ رہا ۔ جس زمین میں آغا صاحب نے قصیدہ کہا اول تو یہ اساتذہ متقدّمین کی پامال زمین اور دوسرے یہ کہ جس ذاتِ گرامی کے لئے کہا گیا اس کی شان ایسی کہ " باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار " حضرت سوؔدا تو اس زمین کو آسمان بنا ہی گئے تھے اور حضرت محسن کاکوروی اس زمین میں تردّد کر کے بامِ شہرت پر جا پہنچے ۔ اب اس زمین میں نئی راہیں نکالنا اور تسخیر ماہ تاباں کرنا آغا صاحب کا کام تھا ۔ میں نے آغا صاحب سے کہا " آغا صاحب آپ مرثیہ کہیئے ۔ مرثیہ تو آپ میں جھلک رہا ہے ۔ "

قصیدے سے مرثیے تک کے اس سفر کو آغا سکندر مہدی نے بڑی دیانت داری اور انکساری سے بیان کیا ہے جس کا عنوان خود سکندر آغا نے " جو ملا مجھ کو وہ توفیق الہیٰ سے ملا " رکھا تھا ۔

" معراج کی بابرکت رات کو میں نے ایک محفل مقاصدہ میں سوؔدا کی زمین میں ایک قصیدہ پڑھا جس کا مطلع تھا

حمد اللہ کی کرتا ہوں میں اوّل اوّل

ایک طرف ممدوح ذاتِ واجب کی ثنا خوانی ، دوسری طرف شدّت جوش ایمانی ، قصیدہ بڑی شان سے اُبھرا اور جانِ محفلِ مقاصدہ قرار پایا ۔ کچھ مخلصوں نے سوؔدا اور محسؔن سے تقابل کرنا چاہا مگر میں بصد عجز و نیاز اس سے گریز کر گیا ۔ نقش اوّل ، اوّل ہے اور نقشِ ثانی ، ثانی ۔ ہاں میں نے ایک جزو کا اضافہ اجزائے قصیدہ میں کیا تھا جس کا فخر ہے اور وہ ہے سراپائے شب ۔ محفل مقاصدہ کے بعد میرے دوست حضرت نفیس فتح پوری نے ارشاد فرمایا " آغا صاحب اس قصیدے کے پیچھے مرثیہ بول رہا ہے آپ مرثیہ بھی کہئے " ۔ اسی اثناء میں صاحبِ محفلِ مقاصدہ سید مسعود حسین شہاب دہلوی تشریف لائے ۔ میں نے ان سے مرثیہ کہنے کی درخواست کی اور گزارش کی کہ ۱۷ رمضان کو یہ مرثیہ میرے غریب خانے پر پڑھیں اور میں ۲۱ رمضان کو سیٹھ رمضان علی وزیر کے دولت خانے پر مرثیہ پڑھوں گا " ۔

(مرثیہ معلی ۔ جلد اول مطبوعہ ۱۹۷۰)

یہاں پھر سکندر مہدی آغا اپنی خاندانی انکساری سے کام لے گئے ۔ بات دراصل یوں ہوئی تھی کہ جب سکندر آغا نے شہاب دہلوی سے درخواست کی کہ وہ مرثیہ کہیں اور آغا صاحب کے گھر پر ۱۷ رمضان کو پڑھیں تو شہاب دہلوی نے ازرہ محبّت اور اس تعلقِ خاطر کے حوالے سے جو اُنہیں سکندر آغا سے تھا یہ فرمایا کہ میں تو مرثیہ ضرور کہوں گا لیکن آپ تو ذاکرِ اہلبیت ، سیدزادے ہیں ۔ آلِ رسولؐ سے نسبت رکھتے ہیں ۔ آپ تو دعوی کرتے ہیں کہ حسین ہمارے ہیں پھر آپ بھی اپنے جد کے لئے مرثیہ کیوں نہیں کہتے ۔ یہ بات سکندر آغا کے دل کو لگ گئی اور وہیں وعدہ ہو گیا کہ سکندر آغا ۲۱ رمضان کو اپنا پہلا نو تصنیف مرثیہ پڑھیں گے ۔ چنانچہ سکندر مہدی نے پہلا مرثیہ حسبِ وعدہ پڑھا جو بہت مقبول ہوا ۔

آغا سکندر مہدی کے مزاج میں جدّت طرازی تھی ۔ وہ پرانی روشوں پر نئے نئے پھول اُگاتے تھے ۔ چمنستانِ مرثیہ میں بھی انہوں نے یہی پھول کھلائے ۔ سالہا سال سے مرثیے کے مروّجہ اور مسلّمہ بہتے ہوئے دھارے کا رخ بہ یک جنبش قلم موڑ دیا اور لطف کی بات یہ کہ سب نے اسے تسلیم کر لیا ۔ جوؔش نے جب مرثیہ کی مقررہ اور مروّجہ حدود کو توڑا تو اسے تسلیم نہ کیا گیا اور جوش کی ساری عظمتوں کے باوجود اہل الرائے نے اسے مسدّس کہہ کر مرثیے کی صنف سے نکال دیا اور آج تک یہ بحث ہو رہی ہے کہ جوؔش کے مرثیوں کو مسدّس کہا جائے یا مرثیہ لیکن آغا سکندر مہدی کی نئی روش کے خلاف ایک بھی آواز بلند نہ ہوئی یہ معجزہ ہے یا آغا سکندر مہدی کے فن کا کمال ، یہ فیصلہ ابھی ہونا ہے ۔

جوش کی مرثیہ نگاری پر بات کرتے ہوئے راقم الحروف نے " چمن بولتا ہوا " کے زیرِ عنوان ایک بار لکھا تھا جسے آج حوالے کے طور پر دہرایا جا رہا ہے۔

" قدیم مرثیے کے کچھ اصول ہیں، یعنی مرثیے میں چہرہ، ماجرا، سراپا، رخصت، آمد، جنگ، شہادت، بین وغیرہ کا التزام ضروری سمجھا گیا۔ حتیٰ کہ اس میں ڈرامہ کا عنصر بھی کم و بیش لازمی سمجھا گیا۔ چنانچہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے اس فن کو تمام اقدار کے ساتھ اتنی بلندیوں تک پہنچا دیا کہ وہاں تک پہنچنا تو در کنار اس نقطۂ عروج تک دیکھنے کے لئے دستار سنبھالنی پڑتی ہے۔ چنانچہ شادؔ عظیم آبادی، مرزا جعفر اوجؔ، ناظر حسین ناظمؔ اور دلّو رام کوثری جیسے حضرات جدید مرثیے کے پیش رو ہونے کے باوجود مرثیے کو روایت کے حصار سے باہر نہ لا سکے۔ جوش کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے روایت سے بغاوت بھی نہیں کی، روایت سے انحراف بھی نہیں کیا لیکن روایت کے سامنے سر بھی نہیں جھکایا اور مرثیے کو ترّقی کے ان منزلوں تک لے آئے جہاں علامہ جمیل مظہری اور نسیم امروہوی سے آل رضا تک صاف ستھرے لوگ مرثیہ کے کارواں میں شریک ہو گئے۔ روایت کا شکنجہ اتنا سخت تھا کہ برسوں ترقی پسند مرثیے کو مرثیہ تسلیم نہیں کیا گیا اور مسدّس کہا جاتا رہا اور شاید آج بھی لکھنؤ میں اس مکتبۂ فکر کے لوگ ہوں جو جدید مرثیے کو مسدّس ہی کہتے ہوں

جوش کی مخالفت کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ جوش نے کبھی اہلِ نقد و نظر کو نہیں گردانا اور " دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر " کیا۔ بات بڑی واضح ہے۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے وہ اپنی طاقت اور چُستی کے بل پر حکومت کرتا ہے۔ چرند، پرند، شجر، حجر، درندے اور انسان، کوئی اس کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن یہی کمزور انسان منصوبہ بندی کر کے اس شیر کو لوہے کی کمزور سلاخوں سے بنے پنجرے میں قید کر لیتا ہے اور شیر سمجھ نہیں پاتا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا۔ کم و بیش یہی کچھ غالباً نیستانِ شعر و سخن کے شیرِ ببر جوشؔ کے ساتھ بھی ہوا۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جوش سرکش تو تھے، کسی کو خاطر میں بھی نہیں لاتے تھے کیا وہ ہر شخص کے سامنے سرکش تھے۔ کیا وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے کیا وہ اپنے علاوہ کسی کے فن یا فضیلت کو تسلیم نہیں کرتے تھے یا پھر مدمقابل کے معیارِ دانش و ہنر کے مطابق اپنے رویے کا اظہار کرتے تھے اس لئے کہ وہ اگر کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے تو پھر ان تحریروں کے متعلق کیا کہا

جائے جو جوش نے دوسروں کے لئے لکھی ہیں۔
مثلاً جوش نے مجاز کو زندہ پیغمبرِ بہار کہا۔ علامہ اقبال کو ان کے انتقال کے بعد بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اپریل ۷۱ء میں آغا سکندر مہدی نے صد سالہ یادگارِ انیس کے سلسلے میں بہاولپور میں جشن منایا، جو برصغیر میں پہلا جشن تھا۔ جوش اس میں بہ نفسِ نفیس شریک ہوئے۔ اس موقع پر جوش نے انیس کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا وہ جوش کا طرۂ امتیاز تھا اور کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایک ایک فقرہ انیس کی طرح عظیم اور جوش کی طرح لازوال ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ جوش فرماتے ہیں۔

"اے انیسِ اعظم

اے طلوعِ صبح کے زرّیں محراب کے مطربِ زمزمہ خواں

اے غروبِ آفتاب کے اُداس خیمے کے شاعرِ اشک افشاں

اے کعبۂ ذوقِ سخن کے معمار، اے تشنہ لبوں کے واقفِ اسرار

اے ٹوٹے دلوں اور بلکتے بچوں کے ترجمان

اے میان سے اُبلی ہوئی تلوار کے اداشج

اے مینارۂ صداقت کے خطیب، اے زلفِ نفسیات کے گرہ کشا

اے عدیم النظیر مورّخِ کربلا، تجھ پر کروڑوں سلام

تو اس فاتح حسینؑ کا مداح ہے جس نے سر دیدیا، لیکن قرآن پر یزیدیت کو پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں دی۔

اے کعبۂ لکھنؤ کے کلید برادر! تو نے قصرِ کردارِ حسینؑ کا باب کھول کر یہ بات ثابت کردی کہ اگر چراغِ حسینیت کو اٹھالیں تو ایوان تاریک گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوب کر رہ جائے۔

اے انیس، تیری شاعری کی مہکتی اور گھنی چھاؤں میں اس قدر معنی و بیان کے شہر آباد ہیں کہ جب انہیں گنا جاتا ہے تو اعداد کی سانس رک جاتی ہے، تیرے پروازِ تخیّل کی رو میں سلیمان کا تخت ہوا کے دوش پر چکرانے لگتا ہے۔ تیری زبان کی روانی کی سامنے دجلہ و نیل کی موجوں میں زنجیر پڑ جاتی ہے۔ تیرے قلم کے سامنے تلوار تھرتھرانے لگتی ہے اور تیری سلمائے سخن کے مکھڑے کی چھوٹ کو دیکھ کر تڑپتی ہوئی بجلیوں کی نبضیں ڈوب جاتی ہیں، تیری صریرِ کلک میں جبریل کے پروں کا ترنم ہے اور ذوالفقار کی جھنکار! موتیوں

کے دریا ہیں اور آنسوؤں کے سمندروں کا جزر و مد!

اے انیس! اے کشورِ گفتار کے رئیس، اے افکار کے دیوتا اے ابلاغ کے امام، اے الفاظ کے پیغمبر اور اے معانی کے پروردگار انیس، انسِ آفاق کا سلام قبول کر

اے مفکرِ کربلا انیس، تو نے اپنے میدانِ سخن میں عباسؑ کی وفائے لا ثانی، حبیب کی رجز خوانی، شبابِ اکبر کی سوختہ سامانی، گہوارۂ اصغر کی ویرانی اور خونِ حسینؑ کی رنگ افشانی کے ایسے لازوال خیمے نصب کردیئے ہیں کہ روحِ کائنات قیامت کے دن تک ان کا طواف اور مسلسل طواف کرتی رہے گی، اور کون و مکاں کی عظمت کا آفتاب ان خیموں پر حشر کی بعد بھی غروب ہونے کا نام نہیں لے گا۔

ہر تارِ نگاہ ذوالفقارے کردی
واللہ اے انیس کہ کارے کردی

(جوش - ۲۵ اپریل ۷۱ - بہاولپور)

آغا سکندر مہدی کے لئے جوش نے لکھا،

"فخر دارا و سکندر، آغا سکندر مہدی ہرچند دھان پان اور ناتواں انسان ہیں مگر جب ان کے کارناموں پہ نگاہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رائی پربت کو اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے ہے .... آغا سکندر مہدی سکندر اعظم سے زیادہ عظیم ہیں کہ اس نے پتھر تراش کر آئینہ بنایا اور یہ ہیرا تراش کر الماس بنا رہے ہیں میں ان کو اور ان کی کاوشوں کو سلام کرتا ہوں"۔

(جوش ملیح آبادی) ۲۳ اپریل ۷۳ء

ملاحظہ فرمایا آپ نے بقول جوش رائی نے پربت اٹھا رکھا تھا، گویا آغا سکندر مہدی جیسے بظاہر ناتواں انسان نے حمد و نعت و سلام اور پھر مرثیہ کی ذمّہ داری قبول کی تھی لیکن یہ کیا کہ علم و آگہی اور شعر و سخن کا پربت ایک رائی کی عظمت کو سلام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جوش کے الفاظ کی وضاحت اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی کہ ان کی نگاہِ دوربیں نے آغا سکندر مہدی میں چھپے جواہر کو دیکھ لیا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ جوش جوہرِ فن کے شناسا بھی تھے اور اس کا اقرار کرنے والے بھی۔

آغا سکندر مہدی کے مراثی کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک بات اور بھی واضح ہوئی کہ آغا جی نے مرثیہ کے خدوخال سے زیادہ مرثیے کی روح کو سمجھ لیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے جو نقوش بنائے اس میں وہی رنگ بھرا

جو روح مرثیہ کہلایا جا سکتا ہے پھر ان کی جدّت طرازی ، فکری اُپج اور لفظیات کو برتنے کے سلیقے اور اسلوب نے وہ سحر قائم کیا کہ قاری یا سامع اس سحر کے حصار میں آتے ہی ان کے ساتھ قدم بہ قدم گامزن نظر آیا۔

آغا سکندر مہدی کی مرثیہ نگاری پر بہت سے اہل قلم اور صائب الرائے اکابرین نے گفتگو کی ہے جو کم و بیش ساری کی ساری میری نظر سے گزری ہے۔ اس ساری گفتگو میں بالعموم برصغیر اور بالخصوص پاکستان میں مرثیے کے تناظر میں بات کی گئی ہے جبکہ میری رائے میں ان کی مرثیے کے عالمی اُتار چڑھاؤ پر بھی نظر تھی ، مثلاً قبل مسیح کے رومی شعراء اووڈ (OVID) یا ہوریس (HORACE) سے لے کر آرگیو (ARGIVE) یا ای کم بروٹس (ECHEM BROTUS) نے چھٹی صدی قبل مسیح میں ایک خاص بحر میں نوحہ گری کی اور مرثیہ (ELEGY) کو صنفِ ادب میں ایک مخصوص مقام دیا ، ان مرثیوں میں ذاتی غم و اندوہ کے علاوہ شادی بیاہ کی رسومات ، سیاسی حالات پر اشک افشانی ، اخلاقیات اور پند و نصائح ہوتے تھے ، لاطینی زبان کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے اگر اور ماضی کی طرف جائیں تو یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ نوحہ گری کی حد تک تو تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح میں اپنے شوہر اوسائرس (OSIRIS) کی موت پر ای سس (ISIS) نوحہ گری آج کے مرثیہ کے معیار پر مواد کے اعتبار سے خاصی حد تک پوری اُترتی ہے۔ رہا سوال مرثیے کے اتار چڑھاؤ کا تو اس سلسلے میں چھٹی صدی قبلِ مسیح سے لے کر پانچویں صدی کے آخر تک مرثیہ انہیں حدود میں رہا جو عہدِ قدیم کے یونانی اور اطالوی شعراء نے قائم کی تھیں لیکن پانچویں صدی کے اختتام کے قریب اینٹی مارکس آف کلوفون ANTI MARCUS OF COLOPHON نے مرثیے کی بحر میں بھی یکایک تبدیلی کی اور مواد میں بھی ، کلوفون نے کسی حادثے پر اشک افشانی کے ساتھ ساتھ عشق و محبت کے تذکروں کو بھی مرثیے میں جگہ دی اور اس کا نام LYDE رکھا۔ اور اہل ادب نے اس تبدیلی کو قبول کر لیا۔ پھر مرثیے کو عصری حالات کا آئینہ دار بنانے والوں میں آرچی لوکس (ARCHI LOCUS) اور مم نارنس (MIM NARNUS) کے نام نظر آتے ہیں۔ پھر عہد سکندری (ALEXANDRIAN PERIOD) میں بیانیہ مرثیہ اپنی پوری آب و تاب اور اسلوب و لہجے کے ساتھ مقبول صنفِ شاعری بن گیا۔ گویا چھٹی ساتویں صدی قبل مسیح سے لے کر نویں صدی عیسوی تک لگ بھگ ڈیڑھ ہزار برسوں میں مرثیے میں نمایاں تبدیلیاں آتی گئیں سوائے ایک بات کے کہ مرثیہ کا مزاج اور زبان لاطینی رہی۔ ان تبدیلیوں میں آخری نام ٹبولس (TIBULLUS) اور پراپرٹیس (PROPERTIUS) کے شامل ہیں جنہوں نے عہد سکندری کے مروجہ بیانیہ مرثیوں میں نوحہ گری کو نویں صدی میں از سرِ نو

وارداتِ قلبی اور معاملاتِ عشق و محبت کے بیان سے ہمکنار کیا اور مرثیہ پھر ایک نئے رجحان سے آشنا ہوا ۔
مرثیے کے ماضی کے اس تناظر میں آغا سکندر مہدی کے حوالے سے بات کی جائے تو دو صورتیں سامنے آتی ہیں ۔ اگر یہ مانا جائے کہ مرثیے کے ماضی پر ان کی نظر اتنی دور تک نہ تھی تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس طرح انیسؔ اور شیکسپیئر کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ دونوں عظیم شاعروں میں کوئی باہمی رابطہ نہ تھا پھر بھی دونوں کے یہاں بند کے بند یکساں موضوعات پر ، یکساں لہجے میں نظر آتے ہیں اور اہل نظر کے پاس یہ کہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ GREAT PEOPLE THINK ALIKE ۔ اسی طرح آغا سکندر مہدی بھی ان بڑے لوگوں میں سے ہیں جو مختلف ادوار اور زمانوں میں یکساں سوچتے چلے آئے ہیں لیکن اگر اسے میرا " حسن ظن " قرار دیا جائے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی نظر ان ساری تبدیلیوں پر بھی تھی اور اس امر پر بھی کہ وقت کی بدلتی ساعتوں کے تحت ، روایتوں سے یکسر بغاوت کئے بغیر بھی ان میں تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں ۔ انہیں لاطینی مرثیے کے تموّج کا بھی شعور تھا اور مغربی مرثیے کی روایت پرستی کا ادراک بھی ۔ عربی مرثیہ نگاری کے عروج و زوال پر بھی اُن کی نظر تھی اور فارسی اور اردو مرثیے کے مختلف ادوار پر بھی ۔

مغربی مرثیہ تو یوں بھی ماضی قریب کی بات ہے ۔ مغرب میں مرثیہ نگاری کا آغاز تو سولہویں صدی سے ہوا ہے اور یہ روایت بھی یونانی شاعر تھی یوکری ٹس (THEOCRITUS) سے لی گئی ہے جس نے قدرتی نظاروں سے بھرپور دیہی ماحول میں کسی گڈریے کی موت پر کسی دوسرے گڈریے کی حزن بیانی کی روایت کو مقبول عام کیا تھا ، یہی وجہ ہے کہ ٹینی سن TENNYSON کے ان میموریم (MEMORIUM) کے علاوہ انگریزی زبان کے کم و بیش سارے مرثیے فطری اور دیہی ماحول سے بھرپور ہیں ۔ ایڈمن سپنسر (EDMOND SPENCER) سے لے کر رابرٹ برجیز تک (ROBERT BRIDGES) تک ہر شاعر گڈریے کے روپ میں نظر آتا ہے ۔ سپنسر کو THE POET,S POET کہا جاتا ہے اس لئے اس نے جو اندازِ نوحہ گری اختیار کیا اسی کی تقلید میں ملٹن نے ایک کامیاب (ELEGY) حزنیہ نظم یا مرثیہ کہا جو LYCIDES کے نام سے زبان زدِ خواص و عوام ہے ۔ ملٹن نے اس نظم میں روایت کی بھرپور پاسداری کے ساتھ ساتھ اپنی ذہنی اپج شامل کی اور عام نظموں سے ہٹ کر جن میں ایک گریز ہوتا ہے ملٹن نے دو جگہ گریز اختیار کیا نیز کلیسا کی روش پر اس ڈھنگ سے اعتراضات کئے کہ اہلِ نظر کو یہاں تک گمان ہوا کہ ایڈورڈ کنگ کی موت تو بہانہ تھی جبکہ ملٹن کا مقصد ہی اربابِ کلیسا کو نشانہ بنانا تھا ۔

میرا مقصد آغا سکندر مہدی اور ملٹن کا موازنہ نہیں لیکن بہرحال ان دونوں کی شاعری میں ایک بات تو ضرور مشترک ہے کہ ملٹن نے یہ نظم تقریباً بیس برس کی خاموشی کے بعد لکھی تھی جبکہ آغا سکندر مہدی نے بھی کم و بیش اتنی ہی مدت تک شاعری کو ترک کئے رکھا اور جب اس میدان میں آئے تو بھرپور مرثیہ نگار بن کر آئے ۔

" جب راہ نہیں پاتے تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور "

ملٹن نے روایتوں کی پاسداری کے ساتھ ساتھ اپنا نیا لہجہ تراشا ۔ آغا سکندر نے بھی روایتوں کے پورے احترام کے ساتھ ساتھ مرثیے کے لوازمات میں نمایاں تبدیلی کی اور چہرہ ، سراپا ، آمد ، جنگ ، بین وغیرہ سے ہٹ کر اصول دین توحید ، عدل ، نبوت اور شہادت کو مرثیے میں شامل کیا ۔ خاص طور پر جب وہ قیامت کی جگہ شہادت کہتے نظر آتے ہیں تو یہ بات بھرپور استعاراتی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ کربلا کی شہادت ، بنی نوعِ انسان کے لئے قیامت ہی تو ہے ۔

میرا موضوع مغربی مرثیہ نہیں ہے اس لئے میں ملٹن کے بعد الیگزنڈر پوپ ، تھامس گرے ، شیلے ، میتھیو آرنلڈ وغیرہ پر گفتگو نہ کرتے ہوئے بھی ایک نام اسی حوالے سے ضرور لوں گا ، اور وہ ہے جیرالڈ مینلے ہاپ کنز GERALD MANLEY HOPKINS کا نام جس نے نوحہ گری کو فکر و ادراک کا شعور ہی نہیں دیا بلکہ علامتوں ، اشاروں اور کنایوں کو طنز کا وہ لطیف لباسِ حریر پہنایا جس میں حال اور مستقبل کا بدن جھلکتا نظر آتا تھا ۔ اس نے ایک جرمن جہاز ڈیوچ لینڈ DEUTSCHLAND کے غرقاب ہونے اور اس پر سوار پناہ گیر راہباؤں کے ڈوبنے کے حادثے پر اپنی نظم THE WRECK OF DEUTSCHLAND میں جرمن نسل پرستی کی طرف جو لطیف اشارے اور طنز کئے ہیں وہ لازوال ہیں کلیسائی اقتدار کی وجہ سے یہ نظم اس کی زندگی میں کہیں شائع نہ ہو سکی لیکن جب دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے وہ سب کچھ سچ کر دکھایا جس پر ہاپ کنز نے طنزیہ اشارے کئے تھے اور رابرٹ برجز ROBERT BRIDGES کی کوششوں سے یہ نظم چھپی تو لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ایک صاحبِ فہم و ادراک شاعر کس طرح آنے والے طوفانوں کو محسوس کرتا ہے ۔

لطیف ہوا کی مہک میں آنے والے طوفانوں کی بُو سونگھنے کا شعور آغا سکندر مہدی میں بدرجہ اتم موجود ہے ۔ یہی شعور تو ایسے شعر کہلواتا ہے ۔

بزمِ جہاں میں آج عجب خلفشار ہے ہر فرد پر جنونِ قیادت سوار ہے
بادِ خزاں میں دامنِ گل تار تار ہے پابندیٔ اصول مگر ناگوار ہے
عالم میں خودنمائی ہر ایک سر کا تاج ہے
بوجہل حکمراں ہے ، جہالت کا راج ہے

شہرت کی آرزو کہیں دولت کی جستجو کاسہ گدائی کا لئے پھرتا ہے کوبکو
ہر اک سے کر رہا ہے لجاجت سے گفتگو سیلابِ آرزو میں ہوئی غرق آبرو
بنیادِ قصرِ زیست جو غیروں کا مال ہے
پھیلا ہر اک کے سامنے دستِ سوال ہے

دولت کے ہیر پھیر سے خیرہ ہوئی نگاہ زعمِ اَنا نے کر دیا انسان کو تباہ
پھیلی ہے دشت و بحر میں ابلیس کی سپاہ انسان کا کوئی نہیں دنیا میں خیرخواہ
لاشیں پڑی ہیں خنجرِ قاتل کے سامنے
انسان سر جھکائے ہے باطل کے سامنے

غارت گروں کے ہاتھ میں ہے عالمی ضمیر اک دوسرے کو کرتا ہے انسان خود حقیر
خنجر بکف ہے کوئی ، کوئی ظلم کا اسیر دل کو ہلائے دیتی ہے آوازِ داروگیر
دامن ہے تار تار جہاں کے نظام کا
زنداں میں بے کفن ہے جنازہ عوام کا

ان اشعار میں عالمی صورت حال کا بے لاگ تجزیہ بتا رہا ہے کہ شاعر کو پورا ادراک ہے کہ زندگی کا لُٹا پٹا قافلہ تباہی ، بربادی اور ہلاکت کی سمت رواں دواں ہے ۔ ان اشعار کی وقعت اور بھی فزوں ہو جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مارشل لا کے دنوں میں جنرل ایوب خان کے جاہ و حشم اور اقتدار مطلق کے دور میں سکندر مہدی نے کہا تھا ۔

"بوجہل حکمراں ہے جہالت کا راج ہے"

صاحبو کسی زمانے میں احساسِ کمتری اور مرثیہ نہ کہہ سکنے کی بے بسی نے کسی سے یہ کہلوایا تھا کہ " بگڑا شاعر مرثیہ گو " لیکن وقت کے دھارے نے ثابت کر دیا ہے کہ مرثیہ کہنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ۔ یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ کوئی مرثیہ گو شاعر ایسا نہیں ہوا جو دوسرے اصناف سخن میں شعر کہنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو البتہ ایسے بہت سے شعراء ہیں جو دوسری اصناف سخن میں شاعری کے درجۂ کمال

تک پہنچ گئے مگر مرثیہ کے میدان میں جوہر نہ دکھا سکے ۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ آغا سکندر مہدی کو قدرت نے یہ جوہر ودیعت کیا تھا ۔ نویں جماعت کی طالب علمی سے لے کر انٹرمیڈیٹ میں پہنچتے پہنچتے آغا سکندر غزل اور نظم میں اپنا لوہا منوا چکے تھے ۔ اسی لئے مرثیہ کے میدان میں آئے تو تغزل کی چاشنی ، ان کے مرثیوں میں نمایاں رہی ۔

زلفیں ہیں یا کہ سایۂ شمشیرِ حیدری
مثلِ گلِ شگفتہ ہیں رُخسارِ نقرئی
آنکھیں ہیں یا کہ نور کی کلیاں کھلی ہوئی
صبحِ یقین ہے چہرۂ اقدس کی تازگی

ذرا انصاف کیجئے ۔ کتنے غزل گو شاعر ایسے ہیں جو سراپا کو اس انداز سے نظم کرسکتے ۔ ہم جب آغا سکندر مہدی کو غزل گو شاعر کہتے ہیں تو ہماری یہ مراد قطعاً نہیں کہ (بقول میرے اپنے) وہ غزل کی جگالی کرنے والے شاعر تھے ، بالکل نہیں کوئی زبان سے اقرار کرے یا نہ کرے ، لیکن ترقی پسند تحریک کے بعد دل سب کے مانتے ہیں کہ شاعر اگر مشاہدہ نہ کرسکے ۔ ماضی سے مسلسل رہ کر حال اور مستقبل پر نظر نہ رکھ سکے تو وہ اچھا غزل گو شاعر بھی نہیں ہوتا ۔ آغا سکندر مہدی کے لئے غزل گو کہلانا کوئی اعزاز کی بات بھی نہیں ۔ لیکن اگر کوئی اضافی صلاحیت ہے تو اس کا ذکر نہ کرنا بھی بڑا ظلم ہے ۔ آغا سکندر مہدی کی قوتِ مشاہدہ ، شدّتِ احساس ، وسعتِ نظر کا واضح اعلان اُن کے مراثی میں ملتا ہے ۔ چند اشعار دیکھئے ۔

ہے عقل گُم کہ کیا ہوا قدسی صفات کو انسان کیسے بھول گیا حُسنِ ذات کو
کر بیٹھا غرق آپ وقارِ حیات کو منزل سے دور کھو دیا راہِ نجات کو
بے مقصد حیات سفر کر رہا ہے آج
جینے کی آرزو میں بشر مر رہا ہے آج

پھیلا ہوا جہاں میں سیاست کا جال ہے پھندے پڑے ہیں ایسے نکلنا محال ہے
وہ تلخ زندگی ہے کہ جینا وبال ہے مکر و فریب باعثِ جنگ و جدال ہے
پتھر پڑے جو عقل پہ ، راہوں میں کھو گیا
انسان نسل و رنگ میں تقسیم ہو گیا

آغا کی مرثیہ گوئی پر بے شمار مضامین شائع ہوئے جن میں سے مندرجہ ذیل تو راقم الحروف کی نظر سے بھی گزرے ہیں ۔

فخر دارا و سکندر، آغا سکندر مہدی	جوشؔ ملیح آبادی
مرثیے کے ارتقاء سے متعلق	میر نجف علی
جدید مرثیے کا پیش رو	پروفیسر سیدہ حشمت جہاں ناز
نئے مرثیے کا نقیب	سید مرتضیٰ حسینؔ فاضل لکھنوی
مرثیے کے عہد کا جدید استعارہ	ڈاکٹر اسد اریب
آغا ایک عظیم شاعر، عظیم انسان	عباسؔ نظیر
مختصر مرثیے کی تحریک اور آغا سکندر مہدی	صدیق طاہر
ہے گرفتار انا روز ازل سے انسان (آغا کا ایک مصرع)	تابش الوری
نوشاہِ فکر حُسنِ عروسِ سخن ہوا	سجاد باقر رضوی
مرثیہ معلیٰ	ڈاکٹر اسلم فرخی
آغا سکندر مہدی	ارمان عثمانی
مرثیہ نور کے سانچے میں ڈھلا جاتا ہے (آغا کا ایک مصرع)	نفیس فتح پوری
مرثیہ نظم کی اصناف میں سب سے افضل (آغا کا مصرع)	ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی
حاملِ رایتِ اقلیمِ وفا ہیں عباسؑ (آغا کا ایک مصرع)	پروفیسر سید علی اختر زیدی
جدید مرثیے کا منفرد شاعر	حبیب محمد حبیب
آغا سکندر مہدی کی مرثیہ گوئی	پروفیسر بانو ہاشمی
آج پھر مائلِ پرواز ہے شہبازِ قلم (آغا کا ایک مصرع)	شمیم ترمذی
انسان کو آج امن و سکون کی تلاش ہے (")	ڈاکٹر ایم ڈی چودھری
ایماں کی ضیاء مطلع انوار سخن ہے (")	پروفیسر عاصی کرنالی
زینت ہیں دیں کی عابد بیمار کربلا (")	پروفیسر مہدی مخدوم
جدید مرثیہ نگاری کا تاجدار	طاہرہ رضوی

ان مضامین کے علاوہ بھی کچھ اور مضامین لکھے گئے تھے جنہیں حاصل نہ کیا جا سکا۔

مولانا حامد حسین بلگرامی ، حضرت عاصی کرنالی ، ڈاکٹر اسد اریب ، حشمت جہاں ناز اور نفیس فتح پوری نے ایک سے زیادہ مرتبہ آغا سکندر مہدی پر لکھا ہے ، یہ سارے مضامین آغا کے مرثیوں کی تین جلدوں مرثیہ معلی میں اور اخبارات و رسائل کے علاوہ ماہنامہ " قیام " کراچی ۔ آغا سکندر مہدی نمبر جلد ۔ ۴ شمارہ ۔ ۱ ۔ جنوری ۸۷ء میں شائع ہو چکے ہیں ۔ منظوم نذرانۂ عقیدت میں بھی آغا سکندر مہدی کے چاہنے والے پیچھے نہیں رہے ، حسینؔ اعظمی ، تاباں عابدی ، تاثیر نقوی ، ارمان عثمانی ، ثمر ہوشنگ آبادی اور دیگر حضرات محبت کرنے والوں کی فہرست میں نمایاں ہیں ۔ ان سارے مضامین میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ آغا سکندر مہدی نے مرثیے کو روایت اور جدّت کا وہ فنیّ اور فکری امتزاج دیا ہے جو انہیں بھی ایک جداگانہ مقام دیتا ہے اور جدید مرثیے کو بھی ۔ وہ توحید ، عدل ، نبوت ، امامت اور شہادت کے عنوانات کے تحت زندگی کی ساری سچائیاں ، ساری تلخیاں ، سارے غم ، حتیٰ کہ سیاسی اور سماجی مسائل کا اس چابکدستی اور مہارت سے احاطہ کرتے ہیں کہ ان کی انفرادیت اور عظمت کے سامنے سر جھک جاتے ہیں ۔ ان مضامین میں سجاد باقر رضوی کا مضمون ایک جداگانہ روش لئے ہوئے نظر آتا ہے جسے پڑھ کر " قربونت شوم " بلکہ جدید فارسی کی رو سے " ای قربانت بریم " کہنے کو جی چاہتا ہے مثلاً وہ فرماتے ہیں ۔

> " آغا سکندر مہدی کے مرثیے ، مرثیوں کی نئی روایت کی توسیع ہیں ۔ یہ روایت جوش ، آل رضا ، نسیم امروہوی اور اسی قبیل میں شامل دیگر حضرات کی کاوش قلم سے پیدا ہوئی ۔ مرثیے کی نئی روایت پرانی روایت سے اس لئے مختلف سمجھی جاتی ہے کہ اس میں حال کا مواد ، ماضی کے مواد سے مختلف ہے ۔ نئے مرثیے میں عصری موضوعات کو سمونے کی کوشش کی جاتی ہے ، فکری اور اخلاقی عنصر کا اضافہ کیا جاتا ہے .... گویا نئے مرثیے میں قدیم مرثیے کے قالب میں روح پھونکنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ "

صاحبو ۔ سجاد باقر رضوی صاحب کی یہ بات سولہ آنے کھری ہے ۔ اتنی کھری کہ ہم پنس اور پاؤنڈ والے لوگ بھی اسے " سولہ پنس کھری " کہنے کی بجائے " سولہ آنے کھری " سمجھتے ہیں ۔ چلئے آگے بڑھتے ہیں ارشاد ہوتا ہے ۔

> " میری ادنیٰ رائے یہ ہے کہ نئے مرثیے نئے نہیں پرانے ہی ہیں " نیا " محض ایک " شوشہ ہے جو زمانے کی نودولتی اقدار میں سے ایک قدر ہے ۔ " نیا نو دن ، پرانا سو دن کا " یہ کہاوت آج کی نہیں ہے اور آج اگر زندہ ہے تو بھی یہ محض مجبوری کی آواز ہے ۔ ہر عہد اپنی ضروریات کے مطابق بعض قدروں کو بیدار کرتا ہے ۔ تاجر پیشہ طبقہ مندرجہ بالا

کہاوت کی ترویج کرنے لگے تو لوگوں میں نئی چیزوں کی ضرورت یعنی اپنا مال بیچنے کی گنجائش کے لئے پیدا کرے۔"

درج بالا سطور کو پڑھنے والے معزز صابرین، ان سطور میں کوئی ابہام نہیں ہے بلکہ یہ تنقیدی زبان ہے۔ اگر ابہام ہوتا تو یہ سطور جدید شاعری کے زمرے میں شامل کی جا سکتی تھیں اس لئے کہ شاعری کی ہر کوتاہی کاتب صاحبان کے نامۂ اعمال میں درج کر کے شاعر کی عصمتِ تحریر بچائی جا سکتی ہے لیکن سجاد باقر رضوی کی ہی نہیں بلکہ ہماری اور آپ کی بھی بد قسمتی کہ یہ سطور ایک نثری مضمون کا حصہ ہیں، پس اسے تنقیدی زبان قرار دینا ضروری ہے تاکہ پڑھنے والے پر یہ ایقان و ایمان لازم ہو جائے کہ اس تنقید میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حرفِ آخر ہے اور اگر کہیں کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو یہ پڑھنے والے کا قصور ہے، بالکل اسی طرح جیسے تجریدی آرٹ کو دیکھنے کے بعد صدائے تحسین بلند نہ کی جائے تو ناظر کے لئے بدذوقی اور حماقت کا فتویٰ جاری ہو سکتا ہے اسی طرح تنقیدی تحریروں کو نہ سمجھنے والے "ان پڑھ" کہلائے جا سکتے ہیں۔ تنقید اگر کسی اہلِ زبان نے لکھی ہو تو صورت حال اور بھی سنگین ہو جاتی ہے اس لئے کہ اہل زبان کی ہر بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے پس اس ناقدانہ بحث سے ثابت ہوا کہ زیرِ حوالہ تحریر میں کوئی ابہام نہیں ہے حتیٰ کہ لفظ "شوشہ" پر بھی اگر کوئی رُکتا ہے تو وہ میری طرح زبان کی باریکیوں سے ناواقف کوئی عجمی ہو سکتا ہے۔ یوں بھی اہل زبان نے اردو کو اپنی کنیز کا درجہ عطا کیا ہے اور آقا اپنی کنیز سے جو بھی سلوک کرے، اپنے حقِ تصرّف کے تحت اسے جس طرح چاہے استعمال کرے اس پر انگشت نمائی نہیں کی جا سکتی۔

صاحبو، سیانوں نے کہا ہے کہ خواص کی ہاں میں ہاں ملانے کا ہُنر آئے تو عام آدمی بھی خواص میں نہیں تو مقرّبینِ خواص میں ضرور شامل ہو سکتا ہے۔ یہ عظمت بھی کم نہیں ہوتی۔ عوام کے لئے تو مقرّبینِ خواص ہی اَن داتا ہوتے ہیں۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے مثلاً میں اپنے محلّے کے بدمعاش کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں اور محلّے کے شرفاء میرے مطیع رہتے ہیں، محلّے کا بدمعاش شہر کے بدمعاش کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ شہر کا بدمعاش ملک کے سب سے بڑے اَن داتا کے سامنے سر جھکاتا ہے اور ملک کا سب سے بڑا اَن داتا عالمی بدمعاش کے اشاروں پر چلتا ہے اور ملک پر اپنی حکومت چلاتا ہے۔ یہ بات کم و بیش ہر شعبۂ حیات پر صادق آتی ہے۔ پس میں بھی ایک بڑے ادیب کی ہاں میں ہاں ملا کر چھوٹا موٹا ادیب ہونے کا لاحقہ حاصل کرنے کی غرض سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مرثیہ ہی کیا کوئی بھی ادب پارہ نیا نہیں ہے بلکہ پرانا ہے۔ ثبوت کے طور پر ایک مثال پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں اور وہ یہ کہ سفر ایک قدم عمل

ہے نیا نہیں ۔ سفر کی ابتداء پاپیادہ سفر سے ہوئی ، پھر گھوڑے ، خچر ، گدھے اور اونٹ سواری کے لئے استعمال ہونے لگے ۔ پھر پہیہ ایجاد ہوا تو بیل گاڑی میں سفر ہونے لگا اور بات سائیکل ، موٹر کار ، ہوائی جہاز اور اب سپوتنک تک پہنچ گئی جسے سجاد باقر رضوی کی زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سفر نیا نہیں بلکہ پرانا ہے ۔ موٹر کار ، ہوائی جہاز وغیرہ تو زمانے کی نودولتی اقدار کے " شوشے " ہیں ۔

محترم سجاد باقر رضوی نے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید فرمایا ہے ۔

" میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سونا وہی رہتا ہے اور عہد بہ عہد کھوٹ بدل جاتا ہے ۔ ہر عہد ایک مغربی نقاد کے بقول ، اپنے کھوٹ کو دوسرے ادوار کے کھوٹ سے بہتر سمجھتا ہے سو اب مرثیے کے سونے میں نیا کھوٹ شامل ہو رہا ہے یعنی آج کا مواد ۔ "

" بڑوں کی بات " چھوٹوں کی طرزِ فکر کو بدل دیتی ہے ۔ لہذا سجاد باقر رضوی کی مندجہ بالا " جدید نظم " پڑھنے کے بعد آج اس کا یقین ہو گیا چنانچہ ہمیں اپنی فکر میں ترمیم کرنی پڑ رہی ہے ۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ سونا وہی ہوتا ہے اس کے استعمال کے طریقے ، ڈیزائن یا صنّاعی بدلتی ہے یہ اندازہ نہ تھا کہ ہر جدید ڈیزائن صناعی یا ندرت کو جو وقت کی ضرورت کے مطابق ہو دانشور حضرات کھوٹ کہتے ہیں ۔ جس مغربی مفکر کا حوالہ دیا گیا ہے اگر اُس کا نام سامنے ہوتا تو اس کی تحریریں پڑھ کر استفادہ کیا جا سکتا تھا ، اور متذکّرہ قول کا سیاق و سباق معلوم کیا جا سکتا تھا ، لیکن اے بسا آرزو .... ؟

سجاد باقر رضوی نے اپنے مضمون میں ایک تشویش کا ذکر کیا جو " لائق تشویش " ہے ۔ ملاحظہ کیجئے ۔

" البتہ ایک بات بہت تشویشناک ہے اور وہ ہے مرثیہ میں کسی خاص مقصد یا افادیت یا اخلاقیات کی پیشکش ۔ یہی مرض اردو شاعری کو پہلے لاحق ہو چکا ہے ۔ سرسیّد تحریک کے زیرِاثر اُردو نظم اسی بدعت کا شکار رہ چکی ہے "

صاحبو ۔ اس سے پہلے " بدعت " کی بہت سی اقسام ہمارے سامنے تھیں جو علماء کرام کے فتاویٰ کی روشنی میں ہم نے دیکھی تھیں ۔ آج ایک نئی بدعت کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں ، یعنی یہ کہ شاعری میں کوئی مقصد ، افادیت یا اخلاقیات در آئیں تو وہ بدعت ہوتی ہے ۔ بالفاظ دیگر شاعری کو بے مقصد اور اخلاقیات سے مبّرا ہونا چاہئے اور اس میں کوئی افادیت بھی نہیں ہونی چاہئے ۔ کاش سجاد باقر رضوی کچھ ایسے اشعار بھی نقل کر دیتے جو " بدعت " کی زد میں نہ آتے ہوں ۔

رضوی صاحب کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ ابھی ان کے ارشادات کے پھولوں کی بارش جاری ہے لہذا آئیے اپنے دامن پھیلا کر یہ پھول اس میں بھر لیں ۔ ارشاد ہوتا ہے ۔

" شاعری میں اگر فن کی حیثیت اوّلین اور مقصد ثانوی ہو تو کوئی بات نہیں مگر نئے مرثیے کا نسخہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرانی ہیئت میں کچھ تراش خراش کی جائے اور پھر اس میں کچھ جدید موضوعات اور کچھ اخلاقیات ڈال دی جائے تو وہ نیا مرثیہ ہو جائے گا ۔ میرا خ
یہ بات مرثیے کی روایت کو آگے نہیں بڑھا سکتی ۔ "

صاحبو ۔ ایک بار پھر " پوائنٹ آف آرڈر " (POINT OF ORDER) اگر پرانی ہیئت میں تراش خراش نہ کی جائے اور جدید موضوعات اس میں شامل نہ کئے جائیں تو پھر لفظ جدید بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے ۔ اس صورت میں تو روایتی مرثیہ روایتی مرثیہ رہے گا ۔ اس میں کسی ترقی یا جدّت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

برطانیہ میں ایک رواج ہے کہ اکثر و بیشتر کچھ ڈاکٹر حضرات " ایشین کمرشل ریڈیو " پر ۳۰ منٹ خرید لیتے ہیں ، ر اس عرصہ میں ریڈیو پر آکر مختلف امراض کی ہولناکیاں بیان کرتے ہیں ۔ بسا اوقات تو ان حضرات کو سن کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر آئندہ چوبیس گھنٹوں میں ہم نے ان ڈاکٹر صاحب سے رجوع نہ کیا تو انتقال پرملال لازمی ہے ۔ پروگرام کے آخر میں ایسے ڈاکٹر صاحبان اپنی مصروفیات کا ذکر کر کے اپنے کلینک یا اپنے کسی نائب کا ٹیلیفون نمبر دیتے ہیں تاکہ امراض کی ہولناکیوں سے لرزیدہ لوگ ان کے نائبین سے رابطہ کر کے زندگی خرید سکیں ۔ یہ اور بات ہے کہ جب کوئی ٹیلیفون کرتا ہے تو یہی ڈاکٹر صاحبان " اتفاق سے " ہمیشہ کلینک میں موجود ہوتے ہیں .... بس مرثیے کے سلسلے میں یہی کچھ " سید بادشاہ " کر رہے ہیں ۔ اب یہ مرثیے کے شائقین کا کام ہے کہ وہ ان کے نائبین سے یہ معلوم کریں کہ مرثیے میں مقصدیت نہ ہو ، افادیت نہ ہو ۔ اخلاقیات نہ ہو ، جدید موضوعات نہ ہوں تو پھر کیا ہو ؟

سجاد باقر رضوی نے مندرجہ بالا تجزیہ ، آغا سکندر مہدی کے مرثیوں پر گفتگو کرتے ہوئے کیا ہے ۔ سجاد باقر رضوی خود مرثیہ نہیں کہتے تھے ۔ اس لئے انہیں پورا استحقاق تھا کہ وہ مرثیے کے اجزائے ترکیبی ، اس کی ہیئت ، مواد اور دیگر امور پر فیصلہ صادر فرما سکیں ۔ پس آغا سکندر مہدی کے لاکھوں چاہنے والوں اور جدید مرثیہ کی عظمت کو ماننے والوں کا ایمانی فریضہ ہے کہ وہ ایسے مرثیوں کی عزت و ناموس بچانے کے لئے جن میں روایت کی بقا کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کی ضروریات ، مشاہدات اور جدید فکر کی روشنی ہو کسی دوسرے نقاد سے " حمایت نامہ " حاصل کریں سبب اس کا یہ ہے کہ ہر دور میں ایمان کی سند دشمن رسولؐ ابوسفیان سے نہیں ، محافظِ رسولؐ ابوطالبؑ سے طلب کی جاتی رہی ہے ۔

صاحبو کبھی کبھار یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی " بدعت " کی افادیت ثابت ہونے پر فتویٰ دینے

کا استحقاق رکھنے والی شخصیتوں نے اس بدعت کو بدعت کے خانے سے نکال کر " مباح " کے زُمرے میں شامل کر لیا ۔ مثلاً ایک عرصہ تک تصویرسازی یعنی فوٹوگرافی حرام قرار دی جاتی رہی ہے ، لیکن جونہی اخبارات و رسائل کی اشاعت کا دور آیا اور بڑے بڑے علماء کرام کی تصاویر اخبارات و رسائل میں شائع ہونے لگیں تو یہ بدعت بھی مباح ہو گئی ۔ سبب اس کا بڑا واضح ہے یعنی علماء کرام ترویج دین کے لئے جو تقاریر کرتے ہیں انہیں میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچانا ضروری بھی ہے اور " کار ثواب کا کام " بھی ۔ اسی طرح ریڈیو اور بالخصوص ٹیلی وژن پر " ترویجِ دین " کے سلسلے کی بقا کے لئے علماء کرام کا ٹیلی ویژن پر آنا دینی ضرورت ہے ۔ میک اپ اگر زیبائش کے لئے ہو تو بدعت بھی ہے اور حرام بھی لیکن ٹیلی وژن کیمرے کے سامنے آنے سے قبل جو ہلکا میک اپ ہوتا ہے وہ تو کیمرے کی " ضرورت " ہوتی ہے ، اسے زیبائش قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ اور کہاوت ہے کہ " ضرورت " ایجاد کی ماں ہے ، اس لئے اس ماں نے بغیر باپ کی مدد کے ، ایک ایجاد کی ہے جسے " قانونِ ضرورت " کہا جاتا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ قانون ضرورت کے تحت دربان حاکم اور حاکم مقتول ہو سکتا ہے ۔

شاید ایسے ہی کسی قانونِ ضرورت کے تحت سجاد باقر رضوی کے زیر حوالہ مضمون کے آخری حصے میں ان کا لہجہ یکایک مثبت ہو گیا ہے ، وہ تحریر فرماتے ہیں ۔

> " پس آج کے مرثیہ نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان قوتوں کی شناخت کرے جو مسلمانوں کا مال غصب کر رہی ہیں یا اخلاقیات کو تباہ کر رہی ہیں .... محض مردانِ حق نگاہ کی موت ہی اہم نہیں ہے ، اس سے زیادہ اہم وہ اصول ہیں جن کے لئے وہ باطل سے ٹکرا گئے اور اسے پاش پاش کر دیا ۔ موت سے خوفزدہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو زندگی کی ہمہ وقت توسیع میں لگے رہتے ہیں ۔ "

قصہ مختصر ، سجاد باقر رضوی کا پورا مضمون پڑھنے کے بعد جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ کچھ اس قسم کا ہے

ضد کی ہے اور بات مگر خُو بری نہیں
بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

میں نے اکثر سوچا کہ مرثیہ پر کڑی نظر رکھنے والے اکابرین نے سجاد باقر رضوی کے اس دلچسپ مضمون پر توجہ کیوں نہیں دی اور سوچتے سوچتے اس فیصلے پر پہنچا کہ جو لوگ سکندر مہدی کو بھلا دینا چاہتے تھے ان کی نظر میں ان پر لکھے گئے کسی مضمون کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی ۔ سکندر مہدی کے قدردان

تو جوش ملیح آبادی تھے جو خود چلے گئے اور جو صاف طلب دل تھے انہوں نے بہرحال لکھا اور خوب لکھا۔ سجاد باقر رضوی آج ہم میں ہوتے تو چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد کا لطف آتا۔ اس لئے کہ وہ ایسے سچے قلمکار تھے جو لمحہ لمحہ کیفیات کو سپرد قرطاس کر دیتے تھے، بڑی سچائی اور دیانتداری کے ساتھ۔ شاید اسی لئے کبھی کبھار مختلف فکری لہریں بحرِ معنی میں تضاد کا تموّج پیدا کر دیتی تھیں۔ سجاد باقر رضوی کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا اور ہم بے بسی سے دیکھتے رہ گئے۔ اب ان سے کیا کہیں، کیسے کہیں؟ ان کا ایک جملہ ذہن کو جھنجھوڑتا رہتا ہے۔

"موت سے خوفزدہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو زندگی کی ہمہ وقت توسیع میں لگے رہتے ہیں۔"

موت کے موضوع پر آغا سکندر مہدی کا موقف بھی واضح ہے جو سجاد باقر رضوی کے موقف سے متصل ہے، وہ کہتے ہیں کہ موت ہر شخص کا مقدر ہے لیکن آج کا انسان موت کے خوف میں کچھ زیادہ ہی مبتلا ہے مگر کربلا کے مجاہدین حق کے پاس جو موت کا تصور تھا وہ ابدی زندگی کا نشان تھا، ان مردانِ حق سے موت بھی خائف تھی۔

کس درجہ ہولناک تصوّر ہے موت کا　　جی چاہتا ہے اس کا نہ ہرگز ہو سامنا
پایا ہر ایک فرد کو اس سے گریز پا　　لیکن مفر نہ اس سے کسی ایک کو ملا
جبڑوں میں جابروں کو دبایا ہے موت نے
دنیا میں خودسروں کو مٹایا ہے موت نے
لیکن ہوئے ہیں ایسے بھی مردانِ حق نگاہ　　مانگی ہے جن سے خود ملک الموت نے پناہ
جن کی شہادتوں کا ہے اللہ خود گواہ　　جن کا لہو ہے باعثِ نورِ چراغِ راہ
جو زندگی کا جادہ سمجھتے تھے موت کو
شیریں شہد سے زیادہ، سمجھتے تھے موت کو

ڈاکٹر اسد اریب نے سکندر آغا پر گفتگو کرتے وقت خدا لگتی باتیں کی ہیں۔ مرثیے کے جدید عہد کا استعارہ کے زیر عنوان وہ لکھتے ہیں

"مرثیے کی مضبوط اور مستحکم شعری روایت میں آغا سکندر مہدی نے جو نئے تجربے کئے ہیں وہ نہ صرف مرثیے کا نیا قالبِ اظہار ثابت ہوئے بلکہ جدید اردو نظم نگاری میں ایک نئی ہیئت ترکیبی کا نمونہ بھی ہیں۔ انہوں نے مرثیے کے نظامِ تشکیل کو نئے سراپا سے متعارف کیا۔ انہوں نے مرثیے سے ڈرامائیت کم کر کے فنکارانہ دل پذیری سے کام لیا، یہی سبب

ہے کہ ان کے مرثیے کا ہیرو جنگ کے مرحلے سے گزرتا ہے تو اس کے ہاتھوں میں تلوار دکھائی نہیں دیتی اور وہ اس لئے کہ اب جنگ اور تلوار میں کوئی قابل یقین نسبت قائم نہیں رہی - آغا سکندر مہدی نے اپنے مرثیے سے واقعات کے ناقابل یقین پہلوؤں کو بڑی حد تک نکال دیا ہے - وہ زندگی کو بھی جغرافیائی اور موسمی (صبح شام ، گرمی سردی ، دریا صحرا) پس منظر میں محدود نہیں دیکھنا چاہتے - ان کے خیال میں زندگی کوئی ایسا احساس بھی نہیں تھا جسے فقط انسانی رشتوں کے باہمی تعلقات کی مختلف حالتوں پر تقسیم کر دیا جائے - وہ جدید دنیا کی طبقاتی اور جغرافیائی روش کو اس تاریخی پس منظر میں دیکھ رہے تھے جسے واقعۂ کربلا کہا جاتا ہے - "

صاحبو ، ڈاکٹر اسد اریب بذات خود آغا سکندر مہدی کے بہت قریب رہے ہیں - ان کے اس تجزیے میں آغا کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے زندگی کے مطالعہ کا ثبوت بھی ملتا ہے - وہ آغا کی شاعری کو دل سے تسلیم کرتے ہیں اور آغا کی ذات سے والہانہ محبت بھی کرتے ہیں - انہوں نے آغا کی موت پر ایک خاکہ لکھا تھا جس میں مختلف کیفیات کا اظہار تھا - اس خاکے کا ایک اقتباس دیکھئے -

" میں نے اس کے بدن پر پڑی ہوئی منوں مٹی کے انبار میں اپنی انگلیاں گاڑ دیں - مجھے یوں لگا جیسے میری انگلیاں اس کے بدن کو چھو رہی ہوں - وہ بدن جسے میں اب کبھی نہیں چھو سکوں گا .... رات ہو گئی تھی ، ہم نے اسے وہیں کالے اور خوفناک اندھیروں میں چھوڑ دیا - ہاتھوں کی مٹی جھاڑی ، آنکھوں سے آنسو پونچھے ، سب لوگ حسب معمول پلٹ آئے ، میں نے آتے آتے اس کے تعویذ قبر سے ایک چٹکی خاک اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی .... اس مٹی سے اب تک مجھے اس کے بدن کی خوشبو آتی ہے - "

آغا سکندر مہدی کے بدن ہی میں نہیں ان کی فکر میں بھی اک خوشبو تھی جسے حرمتِ قلم کی خوشبو بھی کہا جا سکتا ہے اور محبتِ آلِ رسولؐ کی خوشبو بھی - انہیں حرمتِ قلم کا ادراک بھی تھا اور عظمتِ قلم کا شعور بھی - ان کے قلم کی جولانیاں دیکھئے -

فانوسِ اعتقاد کی ضو خضرِ راہ ہے
اوجِ فلک پہ آج قلم کی نگاہ ہے

عنواں بیاں کا قصرِ سپید و سیاہ ہے
فوسِ نظر میں سلطنتِ مہر و ماہ ہے

پوشیدہ ہیں قلم میں جو جوہر کمال کے
آغوش شب سے لائے گا دن کو نکال کے

آفاق سے نکال کے لائے گا چار چاند — رُخ پر عروسِ فن کے سجائے گا چار چاند
آئینہ جو فلک کو دکھائے گا چار چاند — اندازِ گفتگو میں لگائے گا چار چاند
روشن کرے گا یہ سخنِ تابدار کو
بخشے گا نور ذکرِ شبِ مشکبار کو

نوکِ قلم پہ آتا ہے ذکرِ بہارِ شب — قرطاس پر مہک اٹھے نقش و نگارِ شب
آفاق پر محیط ہوا گلغدارِ شب — عکسِ غلافِ کعبہ ہے حُسنِ دیارِ شب
پازیب جھنجھناتی ہے زہرہ کے پاؤں میں
آتی ہے شب دلہن بنی تاروں کی چھاؤں میں

خوف خدا اور محبت محمدؐ و آل محمدؐ کا خزینہ آغا سکندر مہدی کو اپنے گھرانے سے ورثے میں ملا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں وہ رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ رائے بریلی کو دارالاجتہاد بھی کہا جاتا ہے، اس لئے کہ ہندوستان میں ناصرالملت کے علاوہ کم و بیش اس دور کے سارے مجتہدین کا تعلق رائے بریلی سے ہے۔ سنسکرت کے عظیم شاعر ملک محمد جائسی کا تعلق بھی اس شہر سے گہرا تھا ان کی شہرہ آفاق تصنیف پدماوت ہے جو سنسکرت زبان میں ہے۔ جس طرح اردو کا ذکر آتے ہی میر و غالب کے نام سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح سنسکرت کے حوالے سے کالیداس اور ملک محمد جائسی کے نام ہیں۔ ان بہت سے حوالوں سے رائے بریلی کو علم و ادب کا گہوارہ کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ آفتاب شعرو سخن آغا سکندر مہدی جس سرزمین سے اُبھرا اس کے ذرّے ذرّے میں علم و آگہی کی شعاعیں بسی تھیں، اس کا خمیر اس مٹی سے بنا تھا جس میں تولّا کی مہک تھی۔ انیس و دبیر کے مراثی کا مطالعہ بچپن ہی سے شروع ہو گیا تھا اور زمانہ طالب علمی تک پہنچتے پہنچتے انہیں میر انیس کے کئی مرثیے زبانی یاد ہو گئے تھے۔ انیس کے مرثیوں نے جہاں آغا کی فکر کو جلا بخشی وہاں انہیں زبان دانی پر بھی اس قدر اعتماد دیا کہ بقول ڈاکٹر اسد اریب وہ کہا کرتے تھے "لغت ہم سے بنی ہے ہم لغت سے نہیں" اس اعتماد اور اسی فکر کا ایک مظاہرہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں ہوا۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے آغا سکندر مہدی بی۔ ٹی کا امتحان دے چکے تھے۔ پریکٹیکل کے لئے آغا کے ممتحن کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر اکبر حسینؒ، علی گڑھ آئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی بی۔ ٹی کالج کے شعبۂ اردو کے سربراہ نے سکندر مہدی سے کہا

"آغا میاں، پروفیسر اکبر حسینؒ میر انیسؔ پر سند مانے جاتے ہیں، تم آج کلاس میں لیکچر دو گے، میں اور پروفیسر اکبر حسینؒ تمہاری کلاس میں موجود ہوں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم

آج میر انیس نہ پڑھانا۔"

آغا سکندر مہدی نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ اور جب پروفیسر اکبر حسینؒ اور آغا کے اُستاد کلاس روم میں داخل ہوئے تو سکندر مہدی بڑی روانی سے میر انیس کا مرثیہ پڑھا رہے تھے۔

جب نوجواں پسر شہِ دیں سے جُدا ہوا روشن قمر سپہرِ بریں سے جُدا ہوا
نورِ نظر امامِ مُبیں سے جدا ہوا لختِ جگر حسینؑ حزیں سے جُدا ہوا
دل داغ ہو گیا دل و جانِ بتول کا
گھر بے چراغ ہو گیا سبطِ رسولؐ کا

اور جب سکندر مہدی نویں بند پر پہنچے اور انہوں نے "رخ زرد، دل میں درد، بدن سرد تشنہ کام" پڑھا اور تشنہ کام کو بالفتح پڑھا تو پروفیسر اکبر حسین نے آہستہ سے اپنے قلم سے ڈیسک بجایا۔ آغا ایک ساعت کے لئے رُکے اور پھر بولے

روتے ہوئے حرم میں گئے قبلۂ انام تر تھی لہو سے لختِ جگر کے قبا تمام
رُخ زرد، دل میں درد، بدن سرد، تَشنہ کام طاقت نہ قلب میں نہ بدن میں لہو کا نام

تَشنہ کام کو پھر بالفتح پڑھا۔ اس بار پروفیسر اکبر حسینؒ نے کہا "جناب، تِشنہ بالفتح نہیں بالکسَر ہے"

آغا نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور بلند آواز سے کہا شکریہ جناب والا میں بند پورا کرتا ہوں۔

رُخ زرد، دل میں درد، بدن سرد، تَشنہ کام طاقت نہ قلب میں نہ بدن میں لہو کا نام
یہ درد تھا بُکا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے تھے
یہ حال تھا کہ رونے پہ دشمن بھی روتے تھے

آغا نے تیسری بار ممتحن اور اپنے پروفیسر کے سامنے زور دے کر تَشنہ کام کو بالفتح پڑھا تو پروفیسر اکبر حسین نے کہا "میاں صاحبزادے لُغت منگوا کر تصدیق کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

آغا نے برجستہ کہا "سرکار اگر لُغت میں یہ لفظ بالکسر ہے تو بصد ادب عرض کر دوں گا کہ لغت کو بدلنا ہو گا۔"

بہرحال لغت منگوائی گئی۔ آدمی لُغت لینے گیا تو آغا سکندر نے مسکرا کر پروفیسر اکبر حسینؒ کی طرف دیکھ کر کہا "سرکار اجازت ہے" پروفیسر اکبر حسینؒ نے اثبات میں سر ہلایا تو آغا سکندر نے جو مرثیہ پڑھا رہے تھے اسے چھوڑ دیا اور "سماعت فرمائیے" کہہ کر دوسرا مرثیہ شروع کر دیا۔

نمکِ خوانِ تکلّم فصاحت میری ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں
پانچویں پُشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں بحرِ مواج فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں، ذرّوں کو انجم کر دوں گنگ کو ماہرِ اندازِ تکلّم کر دوں

درد سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

کیوں نہ ہو بندۂ موروثیٔ مولا ہوں میں قُلزمِ رحمتِ معبود کا قطرہ ہوں میں
جس میں لاکھوں دُر و مَرجاں ہیں وہ دریا ہوں مدح خوانِ پسرِ حضرتِ زہراء ہوں میں

وصف جوہر کا کروں، یا صفتِ ذات کروں
اپنے رتبے پہ نہ کیوں فخر و مباہات کروں

اور پھر کلاس سے مخاطب ہو کر کہا۔ اور میرے عزیز طالب علم یہ بھی سنیں

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّے کی چمک مہرِ منوّر سے ملا دوں خاروں کی نزاکت کو گُلِ تر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضمون ہو تو سو ڈھنگ سے باندھوں

آغا سکندر کی روانی جوش پر تھی کہ لغت آ گئی اور لغت میں لفظ تَشنہ بالفتح نکلا۔ پروفیسر اکبر حسین کلاس روم سے چلے گئے۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ آغا سکندر مہدی کو فیل کر دیا جائے گا لیکن خاندانی لوگ، واقعی بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ شام کو پروفیسر اکبر حسینؒ نے سکندر مہدی کو بلایا اور کہا۔

"سکندر میاں آج کا واقعہ اتفاق تھا یا تم شعوری طور پر سب کچھ کر رہے تھے"

آغا نے بڑی سچائی سے کہا۔

"سر! (SIR) زبان پر میرے اعتماد نے یہ سب کچھ کرایا، مجھے یقین تھا کہ میں صحیح ہوں اور حق پر ہوں۔ اس لئے کسی مصلحت کے سبب جھکنا میری طبیعت نے گوارا نہ کیا۔

پروفیسر اکبر حسین نے کہا" سکندر میاں اگر یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوتا تو میں تمہیں بیوقوف کہتا۔ لیکن تمہاری یہ

فکر کہ تم حق پر ہو تو کسی مصلحت کے سبب جھکنا گوارا نہیں کرتے یہ ثابت کرتی ہے کہ تم زندگی میں کچھ کر گزرو گے ۔ اللہ تمہیں کامیاب و کامران کرے ۔ "

پروفیسر اسد اریب نے آغا کی زبان دانی اور الفاظ کے تلفظ کے سلسلے میں ان کے اعتماد کے متعلق لکھا ہے ۔

" مجھ سے کہا

لغت تو ہند کے کائستھوں اور جلد سازوں نے مرتّب کی ہے مجھے تو لفظ کی سند گھر سے لا کر دیجئے .... مگر جب میرے گھر آتے تو میری تمام تر نادر اور ضخیم لغات کا مطالعہ کرتے اور جب میں حیرت زدہ ہو کر پوچھتا ، اے حضرت .... یہ کیا ؟

تو کہتے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں تمہارے ہی حربے سے ضرب لگاؤں ۔ اس کے بعد اب لغت دیکھنے کا مزا جاتا رہا ، میں نے صراح ، منتخب ، نوراللغات اور کشوری سے تمام نشانیاں نکال لی ہیں اور ان کتابوں کو الماری کے نچلے خانے میں ڈال دیا ہے "

زبان کے معاملے میں اس تمکنت کے باوجود سکندر آغا غرور اور خوداعتمادی کے فرق کو سمجھتے تھے ۔ اسی لئے تو ایک طرف کارگہ شعر و سخن میں رجز پڑھتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف جو ملا مجھ کو وہ توفیق الہی سے ملا کہتے دکھائی دیتے ہیں ۔

آج پھر مائلِ پرواز ہے شہبازِ قلم ساتھ ہے فکرِ رسا ہمدم و ہمرازِ قلم
بزمِ پاکیزہ میں ہے نغمہ سرا سازِ قلم لحنِ داؤدی ہے رعنائیِ آوازِ قلم
آج بالیدگیٔ روح کا ساماں ہو گا
دل کی کاوش عملِ نقشِ سلیماں ہو گا

قصرِ الفاظ میں روشن ہے لہو کی قندیل رشکِ فردوسی و خیّام ہیں افکارِ جمیل
ذکرِ پاکیزہ ہے آئینۂ عرفانِ خلیل ہے میرا طرزِ سخن خود میرے دعوے کی دلیل
گفتگو وقف جو ہے سیّدِ خوش خو کے لئے
شمعِ تدریس ہے یہ فکرِ ارسطو کے لئے

جو بھی کہتا ہوں بہ توفیقِ خداوندِ قدیر اس کو نقّاد سمجھ لیتے ہیں پتّھر کی لکیر
ذکرِ پاکیزہ سے روشن ہوئی میری تقدیر نامِ مولا سے امر ہو گئی میری تحریر

عظمتِ فکر جمالِ ابدی پاتی ہے
یہ پری وقت کے شیشے میں اُتر جاتی ہے

وہ قلم کی طاقت کو مولا کی عطا سمجھتے ہیں تبھی تو کہتے ہیں کہ نام مولا سے امر ہو گئی میری تحریر۔
اردو شاعری میں جہاں جہاں روایت کی حدود سے باہر نکلنے کی کوشش کی گئی ناقدان عہد نے ایسے شعراء کی راہیں مسدود کرنے کی کوشش کی اسی لئے ترقی پسند شاعری کا راستہ روکنے کی کوششیں تیز سے تیز تر ہوتی رہیں جبکہ ترقی پسند تحریک نے روایت سے بغاوت کی نہ ان قیود کو رَد کیا۔ ترقی پسند شاعروں نے شعر و سخن کے اس سفر کو نئی راہوں سے آشنا کیا۔ لہذا اس ادب کو امتیاز حاصل ہوا۔ آج کے دور میں کم و بیش ہر شاعر کو ممتاز شاعر، صاحب اسلوب اور صاحب طرز شاعر کہا جاتا ہے لیکن سچ پوچھئے تو صاحبانِ طرز وہی شعراء کہلائے جا سکتے ہیں جنہوں نے روایت کو نیا شعور و آہنگ دیا اور یہ وہی لوگ ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں جو زمانے کے محتاج نہیں ہوتے، سر جھکا کر دوسروں کے بتائے ہوئے راستوں پر نہیں چلتے بلکہ مشاہدے کے کرب سے گزرتے ہیں اور اپنے عہد کی سنگلاخ چٹانوں سے فکر کی نئی راہیں تراشتے ہیں۔ آغا سکندر مہدی وہ تیشہ بدست شاعر ہیں جنہوں نے روایت کے چراغ کو ماضی سے لیا اور اس میں اپنے شعور و ادراک کا تیل ڈال کر اسکے اُجالے کو زیادہ منور کر کے نئی نسل کے حوالے کر دیا۔

مرثیے کے سفر کی کہانی ہر خاص و عام کو معلوم ہے "کہ عرب سے مرثیہ نگاری ایران میں داخل ہوئی وہاں سے مرثیہ گوئی دکن پہنچی جسے والیان گولکنڈہ اور بیجاپور نے فروغ دیا وہاں سے دہلی میں مرثیہ گوئی کو فروغ ہوا پھر مرثیہ دہلی سے لکھنؤ آیا جہاں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے اسے بام عروج تک پہنچایا۔ قیام پاکستان کے بعد اہالیان کراچی نے مرثیہ گوئی کی سرپرستی کی .... مرثیے کے وہ حدود جو میر انیس اور مرزا دبیر نے قائم کئے تھے ان حدود کو ترک کرنا آسان بات نہیں تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کے عوام پر انگریز نے دہشت اور بربریت کے ذریعے جو قنوطیت اور جمود کی کیفیت طاری کر دی تھی اس میں انیس کے مرثیوں میں رجز، جنگ کے احوال، مایوس انسانیت کو زندگی کی روشنی دکھاتے تھے اور کربلا کے میدان میں ظلم کے خلاف قربانیوں کا تسلسل، دم توڑتی انسانیت کو جینے کا سلیقہ عطا کرتا تھا لیکن اس صورت حال نے مجبوری کو صبر کا نام دے دیا تھا۔

شاعر جذبوں کو وہی لباس عطا کرتا ہے جو اسے اپنے اطراف میں نظر آتا ہے۔ اپنے ماحول سے بے نیاز گرد و پیش سے ناآشنا اور بدلتی اقدار کے شعور سے بے بہرہ شاعری کبھی اچھی شاعری نہیں کہلائی سوائے اس دور کے جب انسانیت کے سر پر جبر کی اطاعتِ مطلق کا بارِ گراں رہا۔ یہ جبر قبائلی زندگی میں سردارِ قبیلہ کی

طرف سے ، شاہی دور میں شہنشاہیت کی طرف سے ، غاصبانہ تصرّف کے عہد میں غاصبوں کی طرف سے رہا ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ ایسے اَدوار میں یا تو وہ لوگ جو دم بخود آنکھیں بند کیے سانس لیتے رہے زندگی کی تہمت اٹھائے رہے یا پھر وہ جو تمنائے حصولِ طوقِ شاہی (جسے قُربِ شاہی کہا گیا) میں مبتلا رہے وہ مہذب اور اشراف کہلائے ۔ اچھے بھلے معزز گھرانے کے چشم و چراغ مرزا غالب جیسے اَناپسند کو بھی اس تمنّا نے اس وقت تک بے چین رکھا جب تک قلعۂ معلّیٰ کے مشاعروں تک ان کی رسائی نہ ہو گئی ۔ اس صورت حال کا تجزیہ کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یاسیت اور احساسِ بے کسی کی اس فضا میں جہاں سوچنے اور سمجھنے والوں کے دم گھٹ رہے تھے قلعۂ معلّی کے مشاعرے ہی وہ جگہ تھے جہاں کم از کم زبان کھولی جا سکتی تھی ، اسی لئے اس دور میں ذہن انسان میں انگڑائیاں لیتے شکوے محبوب سے شکایتوں میں بدل گئے تھے خود قلعۂ معلی کے بادشاہ بھی اس قابل نہیں تھے کہ زبان کھول سکیں ۔ بے یقینی اور مایوسی سے پریشان اور اُلجھے ہوئے ذہن رگِ گل سے بلبل کے پر نہ باندھتے تو کیا کرتے ۔ کلاسکی شاعری میں یاسیت انہی حالات کی عطا ہے ۔

یہی کچھ اردو مرثیے کے ساتھ ہوا ۔ قدیم مرثیے میں " بین " کا حصہ شاید اس مظلوم انسانیت کی فریاد و بکا کی علامت ہے جسے رونے کا بھی حق نہیں تھا ۔ جبر کی گرفت میں معاشرے کے افراد احتجاج کرنا چاہتے تھے لیکن نہیں کر سکتے تھے ۔ فریاد و بکا کرنا چاہتے تھے لیکن نہیں کر سکتے تھے ، گھٹن کے اس دور میں مرثیے نے مظلوم انسانیت کو ایسا راستہ دکھایا جہاں لب کشائی کی جا سکتی تھی ۔ کم از کم کھل کر رویا جا سکتا تھا لہٰذا اس لب کشائی نے بین کی صورت اختیار کر لی ۔ اس دلیل کو اس صورت حال سے تقویت ملتی ہے کہ عربی یا فارسی مرثیے میں بھی اگرچہ بین ہوتے ہیں لیکن وہاں حزن بیانی ، بین کی شکل اختیار کرتی ہے ۔ گویا شاعر یا مرثیہ گو " بین " کرتا ہے ۔ عام طور پر کردار بین نہیں کرتے ۔ یہی حال انگریزی مرثیے کا ہے ۔ صرف اردو مرثیے میں کردار بین کرتے ہیں اور اس حد تک " بین " کرتے ہیں کہ کردار مجروح ہو جاتے ہیں ۔ اور یہ " بین " مقامی رسم و رواج کے زیر اثر ہوتے ہیں ۔ چنانچہ بیجاپور ، گولکنڈہ ، دہلی اور لکھنؤ کے مرثیوں میں " بین " کے حصوں میں مقامی روایات نمایاں نظر آتی ہیں ۔

میں اس فکر کا بھی حامی نہیں ہوں کہ میر انیس اور دبستان لکھنؤ کے شاعروں نے حسینؑ کو امام حسینؑ لکھنوی بنا دیا ، لیکن ساتھ ہی ساتھ میں " بین " کے حق میں بھی نہیں ہوں ۔ پہلے اعتراض کے خلاف دلیل یہ ہے صاحب بصیرت و ادراک شاعر وہی ہے جو مشاہدے کا شعور رکھتا ہے اور اپنے ماحول کی مبنی بر حقیقت عکاسی کرتا ہے ۔ مفروضہ خیالوں کی منظر کشی FANTASY ہو گی ، شاعری نہیں ۔ شعراء دبستان لکھنؤ اور میر انیس نے بین میں وہی لب و لہجہ روا رکھا ہے جو وہ اپنے اطراف سنتے تھے ۔ مرزا دبیر

کے متعلق تو روایت ہے کہ لکھنؤ کے کسی اشراف گھرانے میں کسی کے جوان بیٹے کا انتقال ہوا تو اس گھرانے کی خواتین نے جو " بین " کئے وہ تین چار روز تک مرزا دبیر روزانہ اس گھر کے باہر کھڑے ہو کر سنتے رہے اور پھر حضرت علی اکبر کی شہادت پر مرثیہ لکھا ۔

رن میں جب بانو نے بیکس کی سواری آئی   لاشِ اکبر پہ یہ کرتی ہوئی زاری آئی
اُٹھ میرے لال یہ مشتاق تمہاری آئی   دیکھو کس شان سے مادر ہے تمہاری آئی
نہ تو ہودج ، نہ کجاوہ نہ عماری بیٹا
سر کھلے بلوے میں مادر ہے تمہاری بیٹا

تم کو اٹھارہ برس پالا تھا کر کے محنت   تم پہ سے صدقے کی کل میں نے جہاں کی حشمت
دل میں کہتی تھی بڑی دی ہے خدا نے دولت   کام آؤ گے میرے ہوگا جو وقتِ آفت
آئی آفت تو گلا تم نے کٹایا بیٹا
آپ آفت سے چُھٹے ماں کو پھنسایا بیٹا

اے میرے بانکے سپاہی تیری عظمت کے نثار   ان کُھلی آنکھوں کے اس چاند سی صورت کے نثار
شکل و صورت پہ فدا ، رعب و جلالت پہ نثار   تیری ہمّت پہ فدا ، تیری شجاعت پہ نثار
ہائے پھل برچھی کا مجھ کو تو دکھا دو بیٹا
ماں موئی جاتی ہے اب آ کے سنبھالو بیٹا

ایک دن تھا کہ تہیں گود میں ہہلاتی تھی   منتیں مانگتی تھی تب تمہیں نیند آتی تھی
دن تو کٹ جاتا تھا پر رات غضب ڈھاتی تھی   ساری شب گود لئے رہنے میں کٹ جاتی تھی
آج یہ ماں تیری میّت پر کھڑی روتی ہے
سچ ہے غربت کی عجب شام و سحر ہوتی ہے

اس مرثیہ میں مرزا دبیر نے وہی بین نظم کئے ہیں جو یوپی بالخصوص لکھنؤ کے اشراف گھرانوں کی مائیں اپنے جوان بچوں کی موت پر کرتی ہیں ، اسی لئے یہ بین لکھنؤ اور یوپی کے تہذیب کے سامعین و قارئین کو متاثر کرتے ہیں ۔ اس صورت حال میں میر انیس بھی اگر لکھنؤ کے لب و لہجے میں بین قلمبند نہ کرتے تو کیا برازیل ، کانگو یا ٹوکیو کے رہنے والوں کے لہجے میں بین لکھتے ۔ یہ تو ان کی قوتِ مشاہدہ اور عظمت کی دلیل ہے کہ انہوں نے مفروضہ یا غیرمانوس لب و لہجے کی بجائے ان شواہد کو نظم کیا جو سامعین و قارئین کا روزمرہ کا مشاہدہ تھے اور ان شواہد کو اپنی جولانی فکر سے جلا بخشی ۔ اب رہا یہ سوال کہ قدیم مرثیے میں بین

سے ہیں ، اور میری طرح کے دیوانے کیوں متفق نہیں ؟ اس سلسلے میں پہلے بھی کئی جگہ میں اپنا بیان قلمبند کرا چکا ہوں اس کی مزید توجیہ یہ ہے کہ مرثیہ سن کر کسی کی مظلومیت یا غم و الم پر رونا آئے ۔ یہ ایک صورت حال ہے لیکن اگر مرثیہ کہا ہی اس لئے جائے کہ سننے یا پڑھنے والوں کو رُلانا مقصود ہے تو یہ بالکل مختلف صورت حال ہوتی ہے ۔ نصب العین اگر رُلانا ہے تو پھر روایتیں اور صداقتیں بھی مسخ ہو سکتی ہیں اور بین کرنے والے کردار بھی اپنی عظمتیں کھو سکتے ہیں ۔ قدیم مرثیے میں یہی کچھ ہوا ۔ ان مرثیوں میں " بین " پر اتنا زور دیا گیا کہ کربلا کے شہداء اور ان کے ورثاء کی کردار کشی کی پرواہ بھی نہیں کی گئی ۔ شاعر کی پروازِ تخیل نے کرداروں کے مابین جو مکالمے تراشے وہی واقعہ کربلا کا جزو نظر آئے ۔ حسینؑ مظلوم تھے ، اسے بلااختلاف رائے تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ حسینؑ صابر تھے اس پر بھی کوئی اختلاف نہیں ۔ حسینؑ جیسا صبر کوئی نہ کر سکا لیکن " صبر " کے معنی پر گفتگو بہرحال ہو سکتی ہے ۔ ظلم کا جواب دینے کی طاقت ، انتقام لینے کی استطاعت کے باوجود اصولوں کے لئے ظلم کو برداشت کرنا صبر ہوتا ہے ۔ بے بسی یا مجبوری میں خاموش رہنے کو صبر نہیں کہہ سکتے ۔ حسینؑ بے بس بھی نہیں تھے ، اسی طرح رفقائے حسینؑ بھی لاچار و بیکس نہیں تھے ۔ حسینؑ کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا ۔ ان کی قربانی دیدہ و دانستہ تھی ، شعوری فیصلے کے تحت تھی ۔ حسینؑ کی برداشت اور صبر نے ظلم اور مظلومیت کے درمیان ایک حدِفاصل کھینچ دی ۔ حق و باطل میں تمیز پیدا کر دی ۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ مظلوم حق پر ہو تو ظلم پاش پاش ہو جاتا ہے ۔ قدیم مرثیوں میں حسینؑ مجبور ، لاچار ، بے بس نظر آتے ہیں ۔ بات بات پر روتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ اور ان کے رفقاء روتے پیٹتے ، بہ حالتِ مجبوری کربلا کی جنگ میں جھونک دیے گئے تھے ۔ ایک طرف تو جدید مرثیے کے نقیب آغا سکندر مہدی کی یہ فکر کہ

دشمن کی کڑی ضرب تھی پیغامِ نبی پر
عالم کی نگاہیں تھی حسینؑ ابنِ علی پر

اور وہ عظیم انسان جس پر عالم کی نگاہیں تھیں جب وقتِ رخصتِ آخر خیمے میں آتا ہے تو قدیم مرثیے کی زبان میں :۔

جب خیمے میں رخصت کو شہ بحروبر آئے ۔۔۔ چلائی سکینہ میرے بے بس پدر آئے
حضرت کو جو ناموسِ پیمبر نظر آئے ۔۔۔ رو کر کہا ہم قبر میں اصغر کو دھر آئے

لو بیبیو، شبیر جہاں سے سفری ہے
اب فاطمہ کا لال چراغِ سحری ہے

کہہ کر یہ سخن رونے لگے سیدِ اکرم ناموسِ محمدؐ میں بپا ہو گیا ماتم
سر پیٹ کے زینب نے کہا اے شہ عالم کس سے سخنِ یاس یہ فرماتے ہو اِس دم
کچھ میری بھی ہے فکر جو سر دیتے ہوئے بھائی
ہے ہے مجھے مرنے کی خبر دیتے ہو بھائی

ملاحظہ فرمایا آپ نے گریہ و زاری کا سلسلہ۔ بار بار امامِ عالی مقام روتے ہیں۔ زینبؑ سر پیٹ رہی ہیں۔ زینب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ حسینؑ شہادت کے لئے کربلا میں تشریف لائے ہیں۔ زینب بھی کون زینب؟ شریکۃ الحسین زینب! اور اب آغا سکندر مہدی کے الفاظ میں زینب کو دیکھئے۔

زینب علیؑ کے لال کی جو ہم سفر رہی اقدام سے حسینؑ کے جو باخبر رہی
اسلام کے وقار پہ جس کی نظر رہی دینِ مبیں کے واسطے سینہ سپر رہی
اہلبیت کو رکھ دیا جس نے جھنجھوڑ کے
جو کربلا میں آئی مدینے کو چھوڑ کے

چلئے آگے چلتے ہیں۔ امام کی رخصت کا منظر انیس کے الفاظ کے آئینے میں دیکھئے۔

خیمے سے برآمد ہوئے آخر شہِ صفدر سب بیبیاں ڈیوڑھی پہ رہیں کھولے ہوئے سر
کیا کہیے بیاں بیکسیٔ سبطِ پیمبر بیٹا، نہ بھتیجا، نہ علمدار، نہ لشکر
تھامے جو رکاب آپ کی اتنا نہ کوئی تھا
رہوار تھا، یا راکبِ دوشِ نبوی تھا

کس یاس سے ہر چار طرف تکتے تھے سرور دکھلائی نہ دیتا تھا کوئی مونس و یاور
رو کر کبھی چلّاتے تھے آؤ علی اکبر دل تھام کے کہتے تھے کبھی ہائے برادر
لو جلد خبر، بیکس و بے یار ہوں عباس
تم تھامو رکاب آ کے تو اسوار ہوں، عباس

"بے کس و لاچار" حسینؑ میدان میں تشریف لائے اور رجز پڑھا۔

اتنے میں ہوئے بڑھ کے رجز خواں شہ صفدر پہچانو میرے رُتبے و اے قوم ستمگر
نانا ہے پیمبرؐ، میری ماں بنتِ پیمبرؐ بھائی حسنؑ سبز قبا، عاشقِ داور

میں سروِ روانِ چمنِ شیرِ خدا ہوں
واللہ ڈرو مجھ سے ، میں شمشیرِ خدا ہوں

تم وہ ہو کہ لکھ لکھ کے خطِ شوق بلایا میں وہ ہوں کہ گھر چھوڑ کے اس گرمی میں آیا
تم وہ ہو کہ بے جرم و خطا مجھ کو ستایا میں وہ ہوں کہ شکوے کا سخن لب پہ نہ لایا
تم وہ ہو کہ تصویرِ پیمبرؐ کی مٹا دی
میں وہ ہوں کہ جس نے تمہیں بخشش کی دعا دی

اب ذرا اسی منظرنامے کو جدید مرثیے کی زبان میں دیکھئے ۔ آغا سکندر مہدی لکھتے ہیں ۔

رن میں تنہا تھے کھڑے بادشہِ عرش مقام نہ اعزّا تھے ، نہ انصار ، نہ یاور ، نہ غلام
تھی فقط فوجِ عدد گردِ شہنشاہِ انام کوئی اپنا نہ تھا موجود ، اکیلے تھے امام
سامنے خاک پہ تھا نورِ نظر کا لاشہ
جلتی ریتی پہ تھا اکبر سے پسر کا لاشہ

باوجود اس کے نہ تھی چہرۂ اقدس پہ شکن دل کے ٹکڑے تھے پڑے سامنے بے گوروکفن
منتشر خاک پہ تھا فاطمہ زہرہؑ کا چمن مطمئن قلب تھا ، تھی حق کی حمایت کی لگن
مظہرِ ذاتِ خدا ، ثانیٔ حیدر تھے حسینؑ
عزم کا کوہِ گراں ، صبر کے پیکر تھے حسینؑ

تیر آئے تو کیا فوجِ مخالف سے کلام مجھ سے پرخاش ہے کیا اے سپہِ کوفہ و شام
حق پرستوں پہ کئے جور زمانے کے تمام رکھ دئے تم نے پسِ پشت اصولِ اسلام
کیا عجب اجر ، محمدؐ کی رسالت کا دیا
آل کو اُن کی مودّت کے عوض قتل کیا

پیشِ نظر رہے کہ امام حسینؑ کی ساری گفتگو حق، اسلام، رسولؑ کے حوالے سے ہے کہیں اپنی فضیلت یا ذات کی برتری کا اظہار نہیں ہے جبکہ دشمن کے مقابل رجز پڑھنا عرب کا دستور تھا۔ سکندر مہدی نے روایتوں، حکایتوں اور واقعات کو نظم کرنے میں کس احتیاط سے کام لیا ہے اس کی مثال ان اقتباسات میں ملتی ہے جو حسینؑ کے خطبۂ آخر کے حوالے سے آغا کے مرثیے میں ہیں۔

پیش کرتا ہوں تمہیں حق کا پیام آخری بار سناتا ہوں محمدؐ کی شریعت کا نظام
فرض ہے نصرتِ حق سب پہ پکارے جو امام پھر بتاتا ہوں تمہیں اصلِ اصولِ اسلام
راہ پر اب بھی جو آ جاؤ بہل ہو تقصیر
درگزر خون سے ان سب کے کرے گا شبیرؑ

یہ تھا حسینؑ کا کلیجہ، یہ تھی امامت کی منزل، صبر حسینؑ کا مظاہرہ۔ حسینؑ یہ کہہ کر اتمامِ حجت کر رہے ہیں کہ اگر اب بھی اُمت راہ پر آجائے تو حسینؑ پورے گھرانے کا خون معاف کر سکتے ہیں۔ سلام ہو تم پر سکندر مہدی کہ تم نے شایانِ شانِ حسینؑ اس پورے منظرنامے کو نظم کیا ہے۔

مُہر تھی دل پہ لگی کچھ نہ ہوا اُن پہ اثر سن کے حضرت کے یہ الفاظ، ہنسے بانیٔ شر
آپ کا خون بہانے پہ تُلا ہے لشکر بولے ہم کو نہیں کچھ دینِ محمدؐ کی خبر
حق کسے کہتے ہیں ہم حق کے طلبگار نہیں
دینِ اسلام ہے کیا ہم کو سروکار نہیں

حد سے آگے نہ بڑھو کچھ تو کرو خوفِ خدا سرکشی دیکھ کے اعدا کی یہ سرور نے کہا
اس سے ہوتا نہیں کچھ تم کو خسارے کے سوا موجبِ قہرِ الٰہی نہ بنے جور و جفا
وارثِ شیرِ خدا، حیدرِؑ کرّار ہوں میں
موت کا خوف ہے کیا، حق کا طلبگار ہوں میں

بس سمجھ رکھا ہے تم نے ہمیں بے بس، مجبور امتیازِ حق و باطل کا نہیں تم کو شعور
سرِ تسلیم ہے خم اسکی مشیت کے حضور ہم تو ہیں تابعِ فرمانِ خداوندِ غفور
ورنہ دریا سے بھلا ہم کہیں ہٹ سکتے تھے
میرے عباسؑ کے بازو کہیں کٹ سکتے تھے

اور اب اتمامِ حجت اور دشمنوں کی سرکشی کے بعد حسینؑ کے پاس جنگ کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اپنی مظلومیت کو بے چارگی اور بے بسی کے الزام سے بچانے کے لئے بھی حسینؑ کا جنگ کرنا ضروری تھا، لہٰذا

امام ارشاد فرماتے ہیں

یاد تو ہو گا تمہیں بدر و احد کا میداں زعم میں طاقت و کثرت کے تم آئے تھے جہاں
جب چلی حیدرِ کرّار کی تیغِ برّان ایسے بھاگے تھے کہ ملتا نہ تھا قدموں کا نشان
پھر وہی زورِ یداللہ دکھاتا ہے ، حسینؑ
لو ، چلو آؤ ، کہ میدان میں آتا ہے حسینؑ

تاریخ پر سکندر مہدی کی کتنی نظر ہے ۔ کربلا میں امام حسینؑ کا بدر و احد کے میدان کا حوالہ دینا اور سکندر مہدی کا اسے نظم کرنا تاریخ کے پردے اٹھاتا نظر آتا ہے ۔ گویا امام حسینؑ جانتے تھے کہ بنی امیّہ اور آلِ ابی سفیان سوالِ بیعت کے پردے میں بنی ہاشم اور آلِ رسولؐ کو کیوں ہتہ تیغ کرنا چاہتی تھی ۔ اور جب جنگ کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا تو حسینؑ نے اچانک حملہ نہیں کیا بلکہ " لو چلو آؤ کہ میدان میں آتا ہے حسینؑ " کہہ کر للکارا: ۔

یا علیؑ کہہ کے کیا فوج پہ حملہ اک بار بن گئی قہرِ خدا ابنِ علیؑ کی تلوار
سامنے آ کے بچا کوئی نہ پیدل نہ سوار ہر طرف کشتوں کے پشتے تھے سروں کے انبار
شور اُٹھا ، سپہِ شام کی شامت آئی
آسماں چیخ پڑا رن میں قیامت آئی

خوف سے ہو گیا میدانِ دغا زیر و زبر شہ کی تلوار سے کٹ کٹ کے گرے بانیٔ شر
تن گرا ایک طرف ، ایک طرف کاسۂ سر خوں کا دریا تھا رواں بھاگ رہا تھا لشکر
شور تھا ، نوح کے طوفاں کی نشانی دیکھو
سر سے اونچا ہوا تلوار کا پانی دیکھو

ابتری پھیل گئی رن سے ستمگر بھاگے کھلبلی مچ گئی کفّار کے لشکر بھاگے
جاں بچانے کے لئے ظلم کے خُوگر بھاگے منتشر چھوڑ کے افواج کو افسر بھاگے
اپنی فوجوں کو کچلتے ہوئے اسوار گئے
پھینک کر تیر و کماں رن سے کماندار گئے

پیشِ مولا تھا مگر ، وعدۂ طفلی کا خیال یاد نانا کو کیا تھم گیا حضرت کا جلال
خون زخموں سے بہا ، ہو گئے سرکار نڈھال جلتی ریتی پہ گرے شاہِ زمن وقتِ زوال

سایۂ ظلمِ عدو نیّرِ دیں پر آیا
راکبِ دوشِ نبیؐ ، فرشِ زمیں پر آیا

بالکل اسی طرح قدیم مرثیے کے بین میں زینبؑ کا کردار مسخ ہوتا نظر آتا ہے۔ رات بھر اپنے بچوں کو دغا کے لئے تیار کرنے والی زینبؑ ، بچوں سے یہ کہنے والی زینبؑ کہ اگر رن میں جان قربان نہ کی تو دودھ نہیں بخشوں گی۔ بچوں کے لاشے خیموں میں آئے تو یہ کہہ کر منہ پھیر لینے والی زینبؑ کہ میں نے بچے حسینؑ پر فدیہ کئے تھے ، قدیم مرثیے میں کیسے بین کرتی نظر آتی ہیں۔

جب مر چکے زینب کے پسر فوجِ ستم میں اور گلشنِ ہستی سے گئے باغِ ارم میں
تاریک جہاں تھا نظرِ شاہِ اُمَمؐ میں زینبؑ نے برا حال کیا بیٹوں کے غم میں
چلاتی تھی دولت میری سب لٹ گئی لوگو
پردیس میں فرزندوں سے میں چھُٹ گئی لوگو

غم و الم کی اس کیفیت کو بیان کرتے وقت رلانے کی کوشش نے سیدہ زینبؑ کے کردار کو مجروح کر دیا۔ اب اسی تناظر میں جدید مرثیہ دیکھئے۔ آغا سکندر مہدی کہتے ہیں

لائے جو لاشے دونوں کی خیمے میں شاہِ دیں دیکھا کہ جانماز پہ ہیں زینبِؑ حزیں
شکر خدا ہے لب پہ تو سجدے میں ہے جبیں کہنے لگے حسینؑ کہ زینبؑ ہو آفریں
بھوکے بھی تھے ، پیاسے بھی تھے ، خوردسال تھے
لیکن دِغا میں بڑھ کے یہی نونہال تھے

سن کر سخن امام کے زینبؑ کا سر اٹھا پوری ہوئی نماز دعاؤں کا پھل ملا
خاموش تھیں زبان سے اپنی نہ کچھ کہا اللہ رے صبر آنکھ سے آنسو نہیں بہا
دیکھا جو ضبطِ گریۂ خواہر ، چلے گئے
مولا حسینؑ خیمے سے باہر چلے گئے

یہ ہے کردار زینبؑ کی صحیح تصویر۔ اب دیکھئے کہ زینبؑ کے کردار کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے سکندر مہدی کا بیانیہ زندگی بھر رونے کے لیے کافی ہے :-

مولا گئے تو کہنے لگی سوگوار ماں اے بیبیو بتاؤ میرے لال ہیں کہاں
لاشیں دکھاؤ تاکہ تصدّق ہو نیم جاں چھایا ہوا ہے آنکھوں کے آگے مری دھواں

سورج تو اتنی جلدی کبھی ڈوبتا نہیں
کیا رات ہو گئی ہے ، مجھے سُوجھتا نہیں
بتلاؤ بیبیو میرے خورشید ہیں کہاں مجھ کو بٹھا دو دونوں کے لاشوں کے درمیاں
اماں سے سرخرو کیا قربان جائے ماں ان پر زمیں بھی روئے گی ، روئے گا آسماں
میدانِ کارزار میں کیا نام کر کے آئے
میں جیسا چاہتی تھی وہی کام کر کے آئے

قدیم اور جدید مرثیوں کے مندرجہ بالا بند نقل کرنے کا مقصد ، انیسؔ اور آغا سکندر مہدی میں تقابل نہیں ہے بلکہ قدیم و جدید مرثیے کے رجحانات ، اور وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ بدلتی اقدار میں فکری تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے ۔ میر انیس کی عظمت کے سامنے تو آغا سکندر مہدی نے خود سر جھکایا ہے اور مرثیے میں جو جدّتیں آغا نے کی ہیں ان کا سہرا بھی یہ کہہ کر انیسؔ و دبیرؔ کے سر باندھ دیا کہ : ۔

" چونکہ میرے سامنے انیس و دبیر کے شاہکار تھے ، اس لئے میں نے اس گلزار فکر و سخن سے ہٹ کر ایک الگ راستہ اختیار کیا اور روایتی اجزائے ترکیبی ، یعنی چہرہ ، سراپا ، آمد ، جنگ ، شہادت اور بین کو ان کی قلمرو پاتے ہوئے اپنی راہ الگ متعین کی ۔ اجزائے ترکیبی میں توحید ، عدل ، نبوت ، امامت اور شہادت کو پیش نظر رکھا اور خدا نے کامیابی دی ۔ "

صاحبو ، ہمیں معلوم ہے کہ اقلیم مرثیہ میں دو بہت ہی جنگجو اور جفاکش قبائل رہتے ہیں جو انیسیے اور دبیرئے کہلاتے ہیں ۔ ایک زمانہ تھا کہ اقلیمِ مرثیہ کی حکومتِ مطلق حاصل کرنے کے لئے ان دونوں قبائل میں صبح و شام گھمسان کا رن پڑتا تھا ، لیکن جب سے جدید مرثیہ کا دور آیا ان قبیلوں کے آپس کے اختلافات میں شاید کچھ کمی آگئی ہے ۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ برسوں سے ان قبائل میں SEIZE FIRE " جنگ بندی " کی کیفیت ہے ، اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پرانے سردارانِ قبائل کے بعد نئی نسل نے وقت کا مزاج سمجھ لیا ہو یا پھر یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ " جدید مرثیے " کے حملے کا دفاع مشترکہ طور پر مقصود ہو ۔ سبب کچھ بھی ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجھ ایسا نحیف و ناتواں " جوشیا " ان قبائل کی موجودگی میں اپنے ممدوح کو ان کے ممدوح کے مقابل لانے کی جسارت نہیں کر سکتا خصوصاً ان حالات میں جبکہ ہمارے اپنے ممدوح نے ان کے ممدوحین کو خراج محبت و عقیدت پیش کیا ہو ۔

انیسؔ و دبیرؔ اور قدیم مرثیے کی عظمت کے اعتراف کے باوجود آغا سکندر مہدی میری طرح جوشیے تھے ۔ انہوں نے جوش کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ۔ جوشؔ نے جو چراغِ جدّتِ فکر و اسلوب روشن کیا تھا اسے اہل

نقدِ نظر نے مسدّس کے حصار میں قید کر کے مرثیے کی کائنات سے الگ کرنا چاہا ۔ ایسے میں آغا سکندر مہدی اس چراغِ فکر کو لے کر آگے بڑھے اور اس میں اپنی جدّتِ طبع ، جودتِ فکر اور روشن خیالی کا تیل ڈال کر اس کے نور میں اضافہ کر کے ایسی شاہراہ پر رکھ دیا جہاں اس چراغ سے چراغ روشن ہونے لگے اور آج اس فکر کے چراغ مرثیے کے ایوانوں میں قطار اندر قطار جگمگاتے نظر آتے ہیں ۔ سکندر مہدی کی عمر نے وفا نہیں کی اور پچاس سال کی عمر میں ۱۲ اپریل ۱۹۷۶ء اپنے مولا کی خدمت میں پہنچ گئے ۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ سکندر مہدی کی خلقت ہی شاید ایک مقصد کے لئے ہوئی تھی ۔ شاید اسی لئے انہوں نے ۵ سال کی مدت میں سولہ مرثیے لکھ ڈالے ۔ انہوں نے جوانی میں ہی یہ مقصد پورا کر دیا تو معبود حقیقی نے اپنے بندے کو واپس بلا لیا ۔ سکندر مہدی کے بعد قیصر بارھوی ، شاہد نقوی ، صفدر ہمدانی ، ڈاکٹر ہلال نقوی جیسے روشن چراغ اس سلسلے کی نمائندگی ہی تو کر رہے ہیں ۔

" قیام کراچی " آغا سکندر مہدی نمبر میں علامہ نجف علی نے قدیم مرثیے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

> " قدیم انداز بیان میں مرثیے کے وہ حدود جو انیس و دبیر نے قائم کئے تھے ان حدود کو ترک کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی لیکن انگریزوں کے دورِ غلامی میں جوش ملیح آبادی نے حسینؑ اور انقلاب کے عنوان سے اپنا پہلا مرثیہ لکھا اور قدیم اسلوب فکر سے ہٹ کر حسینؑ اور ان کے اصحاب کا کردار ملک و قوم کے نوجوانوں کے سامنے پیش کیا جس سے ان کے دلوں میں وہ انقلاب پیدا ہوا جس کی قوم و ملک کو ضرورت تھی لیکن دانشوروں نے مرثیہ کی کسوٹی پر کسا تو جوش کی انقلاب برپا کرنے والی کاوش کو مسدّس کہا اور مرثیہ کی صنف میں اس بے مثال کلام کو پیش نہیں کیا ۔ "

علامہ نجف علی نے آگے چل کر لکھا ہے ۔

> " جناب آل رضا اور نسیم امروہوی اور دوسرے جدید مرثیہ نگاروں نے مرثیے کے وہی حدود اپنائے جو انیس و دبیر نے قائم کئے تھے ، اس کے بعد ایک بار پھر رئیس امروہوی اور مصطفیٰ زیدی نے پرانی روایتوں کو توڑ کر مرثیہ کہنے کی نئی راہیں اختیار کیں لیکن دانشوروں نے ان کی کاوشوں کو ایک بار پھر مرثیے کی صنف میں شامل نہ کیا ۔ "

علامہ نجف علی کی اس تحریر میں اگرچہ انہوں نے آل رضا اور نسیم امروہوی کا تذکرہ جدید مرثیہ نگاروں کے ساتھ کیا ہے لیکن ان کا یہ کہنا کہ ان دونوں مرثیہ نگاروں نے مرثیے کے وہی حدود اپنائے جو انیس و دبیر نے قائم کئے تھے اس بات کی طرف لے جاتا ہے کہ نسیم امروہوی اور آل رضا کے مرثیوں کو قدیم مرثیوں کے

خزانے میں ہی رکھنا پڑے گا اس لئے کہ وہ اس حصار سے باہر نہ آسکے جو انیس و دبیر کا قائم کردہ تھا ۔ ہرچند کہ جس طرح انیس و دبیر کے دور میں اور بھی لوگ مرثیہ کہتے تھے لیکن اس دور کا ذکر آتے ہی انیس و دبیر کا نام سامنے آتا ہے اور بس ۔ بالکل اسی طرح آج کے دور میں مرثیہ کا نام اتے ہی آل رضا اور نسیم امروہوی کے نام سامنے آتے ہیں لیکن بات علامہ نجف علی نے بھی غلط نہیں کی ۔ نسیم امروہوی کے مرثیے ، قدیم مرثیوں کے برج شرف میں چمکتے دمکتے نظر آتے ہیں ۔

قصیدے اور مرثیے میں گریز شاعر کی اہم ضرورت اور مجبوری ہوتی ہے ۔ گریز کے بند یا اشعار کا مربوط ہونا بھی لازمی ہوتا ہے ۔ یہ تسلسل کلام کو حسن بخشتا ہے ۔ اللہ جانے یا پھر سکہ بند ناقدین جانیں کہ وہ میری رائے کو کس خانے میں ڈالتے ہیں جو یہ ہے کہ نسیم امروہوی کے ہاں اگر آپ چودھویں بند سے ایک دم اکیسویں بند پر چلے جائیں تو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ درمیان سے کچھ حذف ہوا ہے ، ان کے ہاں بند کے بند خود مختار نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے سے مسلسل ہونے سے زیادہ متحد ہوتے ہیں ۔ نئے مرثیہ نگاروں میں بالعموم اور آغا سکندر مہدی اور ان کے قبیلے کے دوسرے مرثیہ نگاروں کے ہاں گریز میں تسلسل ملتا ہے اور وہ بند جو خود مختار نظر آتے ہیں وہ بھی ایک دوسرے سے مسلسل ہوتے ہیں ۔

صاحبو ۔ میرا موضوع نسیم امروہوی نہیں بلکہ جدید مرثیے کے تناظر میں آغا سکندر مہدی پر گفتگو ہے ۔ اس ضمن میں جس حد تک جدید مرثیہ گو شعراء کے نام سامنے آتے ہیں ان پر ہلکی پھلکی گفتگو بہرحال لازمی ہو جاتی ہے ۔

مرثیے کی اصلاح کی طرف پہلا قدم مرزا اوجؔ نے اٹھایا تھا کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے مرثیہ کا رخ موڑنے کی کوشش کی ۔ انہوں نے مرثیہ میں ضعیف روایتوں کے اظہار پر اعتراض کیا اور مرثیے میں فکری مضامین داخل کرنے کی سعی کی اس کے باوجود جدید مرثیے کے تناظر میں ان کا نام اس حد تک سامنے نہیں آتا جتنا آنا چاہئے تھا ۔ اس کا ایک سبب تو شاید یہ ہوا کہ انہوں نے اصلاح سے زیادہ تنقید بلکہ تنقیص کو اپنا شعار بنایا ۔ کسی مروّجہ فن میں تبدیلیاں یا جدّت لانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس عہد کے فنکاروں کو ہدف ملامت بنایا جائے ۔ اس کے برعکس ضرورت اس بات کی ہوتی ہے، کہ جن تبدیلیوں کو بروئے کار لانا ہو ان کی افادیت پر زور دیا جائے اور ان تبدیلیوں کو عملی صورت میں پیش کیا جائے ۔ دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے جس عہد میں مرزا اوجؔ مرثیہ میں تبدیلیاں چاہتے تھے اس دور میں دبستانِ انیسؔ و دبیرؔ کی باہمی چپقلش عروج پر تھی ، لہذا مرزا اوجؔ کی تنقیص کو دبستانِ انیسؔ کے خلاف سمجھ لیا گیا اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ واقعی مرزا اوجؔ کا تخاطب دبستانِ انیسؔ ہی ہو ۔ اسی سلسلے میں اس دور کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ انیس کے چاہنے

والے " انیسیئے " اور کچھ علماء ایک جلوس کی شکل میں مفتی میر عباس صاحب قبلہ کے درِ دولت پر گئے تھے اور مرزا اوجؔ کے خلاف احتجاج کیا تھا، مفتی میر عباس صاحب ایک جیّد عالم تھے جنہوں نے " برہانِ قاطع " کا جواب لکھا تھا اور غالبؔ کو معذرت کرنی پڑی تھی ۔ ایک دلچسپ فسانہ یہ بھی مشہور ہے کہ کچھ " دبیریے " بھی وہاں آ گئے تھے اور تان یہاں ٹوٹی تھی کہ " دیوان حافظ " سے فال نکالی جائے کہ انیس و دبیر میں برتر مقام کس کو حاصل ہے ۔ کہا جاتا ہے مفتی میر عباس صاحب نے بھرے مجمع میں سب سے پہلے حافظ کے دیوان سے مرزا دبیر کے متعلق استصواب کیا تو ذیل کا شعر نکلا ۔

آں را کہ خواندی اُستاد گر بنگری بہ تحقیق
صنعت گر یست اما طبعِ رواں ندارد

پھر میر انیس کے متعلق استفسار کیا تو یہ شعر برآمد ہوا ۔

ستارۂ بدرخشید و ماہِ مجلس شد
دل رمیدۂ ما را انیس و مونس شد

مرزا اوجؔ کے خلاف احتجاج کا یہ واقعہ " ساختہ " ہے یا حقیقت ہے، اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ مرزا اوجؔ کی تنقید و تنقیص کو دبستانِ انیس کے خلاف سمجھا جا رہا تھا ، مرزا اوج میرزا دبیر کے فرزند ارجمند تھے ، پھر ان کا لہجہ بھی بہت درشت تھا ۔ انہوں نے جو فکری مولد مرثیے میں داخل کرنا چاہا وہ زندگی کی کتاب کے اوراق سے لینے کی بجائے تخیلاتی فلسفے سے لیا ۔ مرزا اوج اور پورا دبستان دبیر غزل کے خلاف رہا ہے ، لہذا ان کا ٹکراؤ غزل کی ڈکشن سے بڑا واضح ہے اس پر ان کے مزاج کی تلخی اور جارحانہ اسلوب کی وجہ سے ان کی علمیت اور فلسفہ طرازی اذہان تک تو پہنچی مگر دلوں کو نہ چھو سکی اور ایک منفی ردعمل کی صورت میں اختتام پذیر ہوئی ان کی تنقید کا " ہجویانہ " انداز ان کی بات سننے سے پہلے ہی تکدّر کی فضا پیدا کر دیتا تھا ۔

کوئی سنے گل و بلبل کی داستاں کب تک — محاوروں کی خوش آمد چنیں چناں کب تک
یہ سرد مہریوں کے ساتھ گرمیاں کب تک — غلط نمائی تخیّل کا بیاں کب تک

ردیف قافیہ کیا شے ہے جانتے ہی نہیں
فن ان کی طرح سے " لا " شے ہے مانتے ہی نہیں

اور ان کی براہ راست تنقید و تنقیص کے تیور اور ان کی برہمی دیکھیے ۔

کہا جو مرثیۂ قاسم و علی اکبر — تو اپنے دل سے مضامین غلط سلط گھڑ کر
دکھایا حدّتِ صغرا کا جوش رقّت پر — مآلِ طولِ سخن بس اسی قدر ہے مگر

وہ شاہزادے طلاقتِ زباں کی دکھلا کے
گئے جہاد کو قائل سبھوں کو فرما کے

لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے میں فقط عزاداری حسین کو نجات کا واحد حل سمجھ کر شرعی تقاضوں اور اصول و فروع دین سے لاپرواہی کے رویّوں کو مرزا اَوج ناپسند کرتے تھے اور ملّت کے اس احساسِ غیر ذمہ داری کا ذمّہ دار علماء کو سمجھتے تھے۔ لہذا انہوں نے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے (ان کی مراد دینی علوم کے طلباء سے تھی) عربی اور فارسی میں حصولِ علم کو رَد کرنے کے علاوہ مادری زبان میں علم حاصل کرنے پر زور دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے خلاف علماء کا ایک محاذ بن گیا، ان کے مخالفین کا استدلال یہ تھا کہ دین کی کتابِ اوّل، قرآن حکیم عربی میں ہے، نہج البلاغہ عربی میں ہے، ساری مستند کتابیں عربی میں ہیں تو علومِ دین اردو میں کیسے حاصل کئے جائیں۔ پھر اس نبی کی امّت جس نے کہا علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے اردو زبان پر اکتفا کیوں کرے۔ کیا قرآن حکیم کے اردو ترجمے اور نہج البلاغتہ کے اردو ترجمے کو اساسِ علم بنایا جاسکتا ہے؟ مزید برآں مرزا اوج اپنی تنقید میں اعتدال پر قائم نہ رہ سکے، جس سے نہ صرف انہیں بلکہ پورے دبستان دبیر کو نقصان پہنچا۔ دیکھئے طلباء / علماء سے خطاب کا لہجہ:۔

کہ پڑھنے لکھنے کا رہتا ہے جن کو شغل سدا
ہے جاہلوں کا تو کیا ذکر علم کے طلباء
ہے خانقاہ و مدارس کے دل میں جن کی جا
ہے جن سے مسجدوں کی زیب و زینِ نامِ خدا
نہ جانے کیسی وہاں تربیت یہ پاتے ہیں
سند وفورِ جہالت کی لے کے آتے ہیں

کچھ اپنے دین و شریعت سے بہرہ ور ہوتے
غرض تو یہ تھی فضیلت سے بہرہ ور ہوتے
ادب سے، خُلق سے، حکمت سے بہرہ ور ہوتے
فنون طبع و تجارت سے بہرہ ور ہوتے
مراحم اور مظالم کو یہ سمجھ لیتے
محاسن اور مکارم کو یہ سمجھ لیتے

سیاق/ خود غرضی و سباقِ طرّاری
نہ یہ کہ سیکھ کے آتے ہیں مردم آزاری
ہے غم خوری کے عوض ذوق و شوقِ میخواری
لحاظ ماں کا نہ کچھ باپ کی طرفداری
تمام شہر میں یکتا ہیں، گھر سے فاصل ہیں
قمار بازوں کے جرگے میں فردِ کامل ہیں

ان اشعار میں مرزا اورج کی برہمی نے ایک فیصلہ سنا دیا کہ تحصیل علم کے لئے جانے والے کیا کرتے

ہیں اور کیا سیکھ کر آتے ہیں ۔ گویا برہمی نے اعتدال کو چھوڑ کر افراط سے کام لیا ، یوں بھی جو ڈکشن استعمال کی گئی ہے وہ کس حد تک اخلاق کے دائرے میں ہے اس کا فیصلہ کرنا اہل زبان اور ان دانشوروں کا منصب ہے جو مرثیہ اور مسدّس کی جنگ کے شہسوار ہیں ۔ عربی اور فارسی میں علوم کی تحصیل کو رَد کرتے ہوئے مرزا اَوجؔ کہتے ہیں ۔

پڑھو تم اپنی زباں میں کہ فن کی ہو تسہیل — مترجموں کی ہو محنت ذریعہ تحصیل
تمہاری منزل مقصود کی یہی ہے سبیل — ہر ایک قوم کے پہلے یہی ہوئے ہیں کفیل
زبانِ غیر کو پڑھ پڑھ کے وقت کھوتے ہو
یہ تم ترقیوں کے حق میں کلنٹے بوتے ہو

اور اب شعراء سے خطاب دیکھئے

جو آج کل شعراء ہیں سرآمدِ آفاق — وہ کون مرثیہ گو ، بذلہ سنجیوں میں طاق
ہے فرضِ منصبی ان کا درستیٔ اخلاق — نہ یہ کہ ہوویں مضامیں لٹنے میں مشّاق
ہر ایک مرثیہ اپنا کلام اپنا ہے
قلم سے لپنے لکھا جب کلام اپنا ہے

یقیں نہ آئے تو معنیٔ شعر فرما دیں — ہے بحر کونسی تقطیع کر کے بتلا دیں
اب اور پوچھئے کیا وہ جواب اس کا دیں — مہذّبین سے تعریف اپنی سنوا دیں
غنی ہیں دل نہیں کچھ پیش و پس توارد کا
کہ منہ چھپانے کو پردہ ہے بس توارد کا

ہے صرف و نحوِ عرب تو بہت بڑی اک چیز — نہیں قواعدِ اردو بھی جانتے یہ عزیز
نہ فارسی میں نہ ترکی میں ہے کچھ ان کو تمیز — مگر سخن ہے غلام ان کا ، شاعری ہے کنیز
انہیں سے پیکر نظم و بیان بنتے ہیں
یہ وہ ہیں جانِ فصاحت کو جو کلپتے ہیں

مرزا اَوجؔ کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ اپنے عہد کے ناقد ہی نہیں تھے بلکہ ان میں سیاسی بصیرت بھی بدرجہ اتم موجود تھی لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ان کی تلخ گوئی اور ہجویانہ اسلوب نے انہیں بہت نقصان پہنچایا ۔ اس کا ایک یہی ثبوت کافی ہے کہ بہت سے موضوعات پر مرزا اوج نے بھی اظہار خیال کیا ہے اور جوش نے بھی ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن جدید مرثیے کے ضمن میں بھی اور ان موضوعات پر کلام کے

حوالے سے بھی، جوش کے گرد مسدّس کے حصار کے باوجود جوشؔ کا کلام زبان زدِ عوام ہے مثلاً؟۔
ذاکرِ حسینؑ سے خطاب مرزا اوج فرماتے ہیں ۔

ہے ذاکرین کے مجلس کے رقعے بھی نایاب   لکھے ہیں آپ نے اپنے بڑے بڑے القاب
وحید عصر نہیں جن کا شش جہت میں جواب   بلند مرتبہ کیواں شکوہ عرش جناب
پیمبری میں تو اصلا نہ پیش و پس ہوتا
خدا یہ آپ کو کہتے جو دسترس ہوتا

اگر کبھی یہ رہِ احتیاط پر آئے   کسی رفیق کی جانب سے رقعے چھپوائے
جہاں گئے بتفاخر یہ رقعے دکھلائے   یہ مدّعائے دلی ہے بغیر فرمائے
نظر سے آپ گرائے ہوئے ہیں کیوں ہم کو
وہ قدرداں ہیں، سمجھتے ہیں سب وہ یوں ہم کو

جو بات مرزا اوج کہہ رہے ہیں اسے یکسر غلط بھی نہیں کہا جا سکتا، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے کلیّہ بھی نہیں بنایا جا سکتا ۔ اب دیکھیے جوش کو جہاں زبان بھی تلخ ہے، لہجہ بھی درشت ہے، مصرعوں میں بھرپور طنز اور کاٹ بھی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ منصبِ ذاکری کے تقاضوں کی نشاندہی بھی ہے ۔

ہوشیار اے ذاکرِ افسردہ فطرت ہوشیار   مردِ حق اندیشہ، اور باطل سے ہو زار و نزار ؟
ضعف کا احساس اور مومن کو کیا یہ خلفشار   لافتی الّا علیؑ ، لا سیف الّا ذوالفقار
جو حسینی ہے کسی قوّت سے ڈر سکتا نہیں
موت سے ٹکرا کے بھی ساونت مر سکتا نہیں

سوچ تو اے ذاکرِ افسردہ طبع و نیک خو   آہ تو نیلام کرتا ہے شہیدوں کا لہو
تاجرانہ مشق ہے عالم میں تیری ہاؤ ہو   فیس کا دریوزہ ہے منبر پہ تیری گفتگو
عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہے تو
خونِ اہلبیت سے لقمے کو تر کرتا ہے تو

آہ تو اور سازِ برگِ عاقبت کا اہتمام   کیوں نہیں کہتا کہ باطل کی حکومت ہے حرام
تجھ کو اور زنداں کا ڈر کیوں اے غلامِ ننگ و نام   جانتا ہے رہ چکے ہیں قید میں کتنے امام ؟
تو مثالِ اہلبیتِ پاک مر سکتا نہیں
عشق کا دعویٰ ہے اور تقلید کر سکتا نہیں

کربلا کے موضوع پر مرزا اوج نے روایتی تصور سے الگ ہٹ کر سوچا ہے یعنی کربلا ایک ریگستان جس میں آلِ محمد کا خون بہا جس سرزمین پر جگہ جگہ لاشے بکھرے پڑے ہیں ۔ خاک و خون کی سرزمین پر مرزا اوؔج نے جو فکر کی کرنیں بکھیری ہیں اس کا اُجالا دیکھئے ۔

مشعلِ طور ہے جادہ تیرا ایمن صحرا　　بلکہ ایمن سے کہیں بڑھ کے ہیں روشن صحرا
بنِ عمراں کے خوزادے کا ہے مدفن صحرا　　بارشِ رحمتِ باری سے ہے گلشن صحرا
جان آ جاتی ہے خوشبو سے تیری ہر فن میں
جنت العدن کے ہیں پھول تیرے دامن میں

دل سے کیوں خلقِ خدا ہو نہ طلبگاروں میں　　عفو کی جنس ہے ارزاں تیرے بازاروں میں
مصر کے تخت پہ یوسفؑ ہے خریداروں میں　　چرخِ چارم پہ ہیں عیسیٰؑ تیرے بیماروں میں
چاک دامن ہے گل تر کہ تیری بو مل جائے
کیمیا چھانتی ہے خاک کہیں تو مل جائے

مرزا اوج نے بلاشبہہ جدّت کی کہ کربلا کو دوسرے زاویے سے دیکھا لیکن ان کی نظر میں کربلا ، بنِ عمران کے خوزادے کا مدفن ہے ۔ عفو کی جنس کربلا کے بازار میں عام ہے ، انہیں کربلا میں جنت العدن کے پھول نظر آتے ہیں ، جبکہ جوش نے کربلا کو ایک درسگاہ ، تربیت گاہ ، بنا دیا ۔

کربلا ایک تزلزل ہے محیطِ دوراں　　کربلا خرمنِ سرمایہ پہ ہے برقِ تپاں
کربلا طبل پہ ہے ضربتِ آوازِ اذاں　　کربلا جرأتِ انکار ہے پیشِ سلطاں
فکرِ حق سوز یہاں کاشت نہیں کر سکتی
کربلا تاج کو برداشت نہیں کر سکتی

آسمانِ زندگی پہ کہکشاں ہے کربلا　　فرقِ استبداد پہ گُرزِ گراں ہے کربلا
حفظِ ناموسِ بشر کی داستاں ہے کربلا　　خون کے دھارے پہ بہتی داستاں ہے کربلا
کربلا کی خاک میں اشکوں کی طغیانی بھی ہے
کربلا کی آگ میں تلوار کا پانی بھی ہے

جب تک اس خاک پہ باقی ہے وجودِ اشرار　　دوشِ انسان پہ ہے جب تک حشَم تخت کا بار
جب تک اقدار سے اغراض ہیں گرم پیکار　　کربلا ہاتھ سے پھینکے گی نہ ہرگز تلوار

کوئی کہدے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

اس بحث کو یہ کہہ کر مختصر کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ مرزا اوج نے مرثیہ میں تبدیلیوں کی طرف پہلا قدم اٹھایا مگر یہ بات تکنیک کی حد تک رہی اور عوامی نہ ہو سکی۔ انہوں نے جو بات کہی وہ عوام کے لئے ہی مگر ان کا تخاطب عوام سے زیادہ تخلیقی لوگوں یا علمائے کرام سے رہا۔ پھر وہ اپنی گفتگو کو دلپذیر لہجہ نہ دے سکے بلکہ وہ انداز اختیار کیا جو اصلاح سے زیادہ ہجویانہ تھا، اب یہ اور بات کہ خوش فکر ناقدین ہجو کے پیچھے بھی اصلاح کا جذبہ تلاش کرتے ہیں۔ جوش کے سر پہ سہرا اس لئے رہا کہ ان کا خطاب براہ راست عوام سے تھا، ان کا لہجہ انقلابی تھا۔ حسینؑ کو بیکس و لاچار سمجھنے سے جو یاسیت اور ناامیدی کی فضا پیدا ہوتی تھی جوش نے اسے امنگ، ولولے اور ظلم سے ٹکرانے کی ہمت میں بدل دیا۔ بقول مجتبیٰ حسین۔

"جوش مرثیہ کو امام باڑہ سے نکال کر عوام تک لے آئے"

کربلا کی تپتی دھوپ میں حسینؑ اور رفقائے حسینؑ پر پانی بند ہونا ایک بڑا سانحہ تھا جسے سن کر حسینؑ کی بے بسی کا احساس بڑھتا ہے، ان کی مصیبتوں پر محبّت کرنے والوں کی آنکھوں سے اشک رواں ہو جاتے ہیں۔ چاہنے والے رونے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں لیکن جوش نے اس ظلم کو کس رنگ اور کس تیور سے بیان کیا ہے۔

تاج نے آلِ محمدؐ پہ جو روکا پانی پیاس کے ابر سے یوں ٹوٹ کے برسا پانی
بے دھڑک قصرِ حکومت میں در آیا پانی ہو گیا سر سے شہنشاہ کے اونچا پانی
تاجداری، معہ اورنگ و نگیں ڈوب گئی
آسماں سے جو لڑی تھی وہ زمیں ڈوب گئی

پروفیسر سید محمد رضا کاظمی نے ایک فراخدل ناقد کی طرح جدید مرثیے کے ضمن میں مرزا اوجؔ کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور ان کے مراثی کو ہجویانہ مسدّس کہنے کی بجائے انہیں جدید مرثیہ شمار کرتے ہوئے جوش کے متعلق لکھا ہے کہ۔

"جوش کو ہم جدید مرثیے کا موجد تو نہیں کہہ سکتے اور اوج کے کمالات پر نظر ڈالنے کے بعد معاصر شعراء میں اوّلیت کی یہ بحث بے معنی ہو جاتی ہے لیکن وہ (جوش) پہلے شاعر تھے جنہوں نے مرثیہ میں انقلاب اور قومی آزادی کے تصور کو رواج دیا اور جنہیں جدید مرثیے کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ خود جوش کا بیان ہے کہ یہ مخالفت سیاسی وجوہ کی بناء پر تھی۔"

ان سطور سے ذرا پہلے محمد رضا کاظمی کے صداقت پسند قلم نے یہ بھی لکھا ہے۔

"..... یہ حالات تھے جب مرثیہ کا مستقبل بن کر جوش سامنے آئے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۵ء تک جدید مرثیہ کو ادبی تجربے پر محمول کیا جا سکتا تھا مگر ۱۹۳۵ء میں ایک ایسا سانحہ درپیش ہوا جس نے اس طرز مرثیہ کی افادیت مسلم کر دی۔ یہ جارج پنجم کی جوبلی کا سال تھا اور اس جشن کے موقع پر برطانوی سامراج نے ایام عزا کی پرواہ کئے بغیر لکھنؤ کے امام بارگاہ میں چراغاں کا حکم دیا۔ جب اس حکم کی تعمیل مؤثر مدافعت کے بغیر ہو گئی تو جوش اور جمیل مظہری ایسے شعراء نے خواب کو جذبۂ بیدار، اور قوم کے ہاتھ میں تلوار دینی چاہی۔ مرثیہ میں قومی مضامین کی شمولیت پر اعتراض اس زمانے میں ہوئے مگر اس کا احساس کسی کو نہ ہوا کہ یہ جدت ان شعراء کی جودتِ طبع کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ایک عظیم قومی حادثے نے خود درِ حسینؑ پر دستک دی تھی" (ص۔ ۸۸)

صاحبو، جوش اس دستک کو بہت پہلے سے سن رہے تھے، ان کا پہلا مجموعہ کلام "روحِ ادب" کے نام سے ۱۹۱۸ء میں شائع ہو گیا تھا جس کی پہلی ہی نظم میں جوش کہہ رہے تھے۔

دوسرے عالم میں ہوں دنیا سے میری جنگ ہے
تاجِ شاہی سے قدم بھی مس کروں تو ننگ ہے

پھر ۱۹۲۱ء میں ان کا مرثیہ آوازِ حق سامنے آ چکا تھا، جس سانحہ کا ذکر درج بالا سطور میں کیا گیا ہے اس کے فوراً بعد "شعلہ و شبنم" شائع ہوئی۔ اب تک جوش کی آواز واضح ہو چکی تھی، غاصبوں کے جبر سے کچلی ہوئی انسانیت جوش کے "نعرۂ انقلاب" سے آشنا ہو چکی تھی۔ جوش نے حسینؑ کو انقلاب کی علامت بنایا تھا اور غلامی کی یاسیت سے پژمردہ دلوں کو گرمایا تھا۔

یہ جھجک اچھی نہیں اے سوگوارانِ حسینؑ
باندھ کر سر سے کفن میداں میں آنا چاہیئے
آفریں اے ہمتِ مردانۂ ابنِ رسولؐ
صاحبِ عزت کو یونہی موت آنا چاہیئے
جن کے سینوں میں ہو جوشِ تشنگانِ کربلا
ان جواں مردوں کی تلواروں میں پانی چاہیئے
جوشؔ ذکرِ جرأتِ مولا پہ شیون کے عوض
رخ پہ شانِ فخر و نازِ کامرانی چاہیئے

اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کے لئے جوش کی آواز ناقوس آزادی بن گئی۔ سوئے ہوئے ذہن بیدار ہونے لگے۔ آزادی کے خوابوں کی تعبیر کے امکان روشن نظر آنے لگے۔ جوش نے کہا۔

اک روز ہوا شوق میرے دل میں یہ پیدا　　اس راہ سے گزرے ہیں جو نام آور و یکتا
حالات بھی دیکھوں ذرا ان کے کہ تھے وہ کیا　　اس شوق میں تاریخ کے اوراق کو اُلٹا
فہرست میں اک نام تھا جو سب سے جلی تھا
مژدہ ہو کہ وہ نام حسینؑ ابن علیؑ تھا

پاکستان میں سید ضمیر اختر نقوی نے مرثیے پر بہت کام کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کی بہت سی کتابیں مثلاً تاریخ مرثیہ نگاری۔ میر انیس (زندگی اور شاعری) جوش ملیح آبادی کے مرثیے۔ شعراء اردو اور عشق علیؑ، اردو مرثیہ پاکستان میں۔ خاندان انیس کے مرثیہ نگار۔ اردو ادب میں واقعہ کربلا کے تاثرات وغیرہم شائع ہو چکی ہیں۔ جدید مرثیہ کے ضمن میں انہوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ مرزا اوج نے مرثیے کو جدید نہج پر لے جانا چاہا تھا اور شاد عظیم آبادی اور اکا دکا شاعروں نے اس راستے پر چلنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود مرثیہ میر انیس اور مرزا دبیر کے حصار سے باہر نہ نکل سکا تا آنکہ ۱۹۱۸ء میں جوش کا پہلا مرثیہ آوازۂ حق سامنے نہ آیا۔ ضمیر اختر نقوی کے الفاظ میں صورت حال کی وضاحت یوں ہوتی ہے:۔

> "جدید مرثیے کا آغاز لکھنو میں مرزا اوج کی مرثیہ نگاری سے شروع ہو چکا تھا۔ لیکن بہت کم شعراء اس طرف متوجہ ہوئے تھے، اس کے باوجود ہم اگر اس عہد کے مرثیہ نگاروں کے مرثیوں کا گہرا مطالعہ کریں تو ہم کو ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جیسے دولہا صاحب عروج نے ایک مرثیہ میں کہا ہے۔
>
> ظلمت کدے میں ہوں پہ تجلّی پسند ہوں
> میں ہوں عروج کیوں نہ ترقّی پسند ہوں
>
> لیکن اس دور میں مرثیے کے مقصد اور عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے ۱۹۱۸ء میں سب سے پہلے جوش ملیح آبادی نے مرثیے کا انداز بدل دیا۔ پہلا مرثیہ "آوازۂ حق" لکھنے کے بعد ۱۹۴۴ء میں جب جوش نے "حسینؑ اور انقلاب" لکھا تو جوش کے دوش بدوش جدید مرثیہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں لکھا جانے لگا۔ پٹنہ میں جمیل مظہری نے اس طرف توجہ دی لیکن جدید مرثیہ کا مرکز لکھنؤ رہا سید آل رضا، زائر سیتاپوری، نسیم امروہوی نے اس تحریک میں حصہ لیا"
>
> (اردو مرثیہ پاکستان میں)

صاحبو، خطائے بزرگان گرفتن خطا است لیکن کیا کریں بن کہے بھی رہا نہیں جاتا۔ لکھنؤ مرثیہ کا مرکز تو یقیناً رہا لیکن جدید مرثیہ لکھنؤ میں کب پروان چڑھا۔ اور کب لکھنؤ جدید مرثیے کا مرکز بنا، یہ ہمارے محدود مطالعہ

سے باہر کی بات ہے ۔ ہو سکتا ہے (اور یقیناً ایسا ہو گا) کہ لکھنؤ میں جدید مرثیہ گو شعراء کے جدید مرثیے ضمیر اختر نقوی کے وسیع مطالعے کی زد پر آگئے ہوں ۔ لیکن ہم ایسے عام قاری کی چشم نابینا ان تک نہ پہنچ سکی ہو ۔ اس لئے کہ ہم نے تو جدید مرثیے کو لکھنؤ میں ہمیشہ مسدس کے قفس میں اسیر دیکھا ۔ حتیٰ کہ سید آل رضا نے جب اپنا مرثیہ (جو قدیم مرثیے کی حدود سے باہر نکلنے کی ایک قابل ستائش کوشش تھی) لکھنؤ میں پڑھا تو خود مسدس کہہ کر پڑھا ۔ رہا سوال کہ سید آل رضا اور حضرت نسیم امروہوی کس حد تک جدید مرثیے کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے ۔ اس پر گفتگو بعد میں ہو گی ۔ اس وقت تو بات یہاں سے آگے بڑھائی جاتی ہے کہ جوش کی آواز پر علامہ جمیل مظہری نے لبیک کہا اور ۱۹۳۰ء میں پہلا مرثیہ " عرفان عشق " ، " عشق کیا ہے غم ہستی سے رہا ہو جانا " کہا ۔ اس مرثیے میں جہاں غالب و اقبال کے فکری اثرات تھے وہاں جوش کے نعروں کی گونج بھی تھی اور جوش سے رجحاناتی ہم آہنگی بھی تھی ۔

کربلا میں نظر آتا ہے اک اُجڑا ہوا باغ — ایسے لوگوں کا جو تاریخ لگاتی ہے سُراغ
سینہ مادرِ گیتی پہ غمِ ہجر کا داغ — چند قبریں شبِ تاریک میں منزل کا چراغ

گوشِ دل میں ابھی آوازِ درا باقی ہے
قافلہ بڑھ گیا نقشِ کفِ پا باقی ہے

(جمیل مظہری)

نجم آفندی اس دور میں اپنی نظموں اور بالخصوص نوحوں میں وہی بات کہہ رہے تھے ، ان کے نوحوں میں غم و الم کے ساتھ ساتھ انقلاب اور آزادی کی گونج شامل ہو گئی تھی ۔ ان کے نوحوں کا مجموعہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تو جوش کی آواز کو تقویت پہنچی ۔

بحمدللہ محفل کی فضا میں نے بدل ڈالی
اٹھا دو اب مجھے اب میرے اٹھ جانے سے کیا ہو گا
کہو اے نجم ہمدردوں سے زنداں کی ہوا دیکھیں
درِ زنداں تک تکلیف فرمانے سے کیا ہو گا

حیدرؑ کا گھرانا بھی شیروں کا گھرانا ہے — یہ خون بھرے چہرے یہ کفر شکن نظریں
سوئی ہوئی ملت کی غیرت کو جگانا ہے — کوثر کے یہ مالک ہیں پانی کی طلب کیسی
سجادؑ کو ظالم کے دربار میں جانا ہے — لفظوں سے حکومت کی بنیاد ہلانی ہے

شبیرِ ظلم کلیجے ہلا دئے تو نے
حسینؑ درد کے دریا بہا دئے تو نے
جراحتوں میں نمک بھر دیا تشکر کا
اذیتوں میں تبسم گھلا دئے تو نے

جوش نے شعلہ و شبنم میں حسینؑ کو جانِ سیاست کہا تھا۔ نجم آفندی نے بھی حسینؑ کے عمل کو کمال سیاست قرار دیا ہے ایسی سیاست جو نگاہوں سے پردے ہٹا دے۔

زہے کمالِ سیاست کہ زیرِ تیغ آ کر
نگاہِ خلق سے پردے ہٹا دئے تو نے
ہر ایک ذرۂ بے حس میں اک تڑپ بھر دی
دماغ وضع کئے، دل بنا دئے تو نے

جوش نے "ذاکر سے خطاب" میں جو تنقید کی تھی، نجم آفندی نے اسے نوحوں اور بالخصوص رباعیات کا عنوان بنا لیا۔

جزوِ تن اچھی سے بھی اچھی غذا
زیبِ تن بہتر سے بھی بہتر لباس
ذکر لب پر فقرِ اہلبیت کا
مرحبا - اے واعظِ معنی شناس

اور پھر نجم کے سفر کی تکمیل اس وقت ہوئی جب انہوں نے ۱۹۴۳ء میں "فتح مبین" کے عنوان سے مرثیہ کہا۔ جوش کے "حسینؑ و انقلاب" کے بعد نجم آفندی کا "فتحِ مبین" اسی گرج چمک کا مظہر ہے جو جوش کا خاصہ تھی لیکن نجم کا اپنا اسلوب محفوظ بھی ہے اور نمایاں بھی۔

وہ شاندار موت، وہ بنیادِ انقلاب
بیعت کا وہ سوال وہ دندان شکن جواب
مجبوریٔ حیات سے کونین کو حجاب
نیزے پہ سر حسینؑ کا مغرب میں آفتاب
صدقے ضیائے مہر و قمر آن بان پر
تارے درود پڑھتے ہوئے آسمان پر

نجم نے شہادت حسینؑ کو براہ راست فتح حسینؑ قرار دیا ہے۔

جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا
بدلا لہو سے رنگِ بیابانِ کربلا
تھا وقتِ عصر اور یہی عنوانِ کربلا
سوتا تھا فرشِ خاک پہ مہمانِ کربلا
بے سر تھا قتل گاہ میں لاشہ پڑا ہوا
بالیں پہ فتحِ حق کا تھا جھنڈا گڑا ہوا

اب فکر کا یہی سلسلہ آغا سکندر مہدی کے ہاں دیکھئے کہ وہ حسینؑ کو کربلا کا فاتح کہہ کر بات ختم نہیں کرتے بلکہ اس فتح کے نتائج کی بات کرتے ہیں۔

بے شک حسینؑ ہی سے ہے پیغامِ مصطفیٰ
جو کربلا میں باعثِ فتحِ مبیں ہوا
روشن ہے جس سے نورِ ہدایت کا سلسلہ
حق کر رہا ہے فتنۂ باطل کا سامنا

آوازہ گونجتا ہے پیامِ حسینؑ کا
سکہ رواں ہے آج بھی نامِ حسینؑ کا

حسینؑ کربلا میں مفتوح ہوتے تو باطل ہمیشہ کے لئے سربلند ہو جاتا ۔ آج بھی حق اگر فتنۂ باطل کا مقابلہ کر رہا ہے تو یہ حسینؑ کی فتح کا نتیجہ ہے ۔ کربلا میں حق کی فتح کا اثر ہے ۔ آغا سکندر مہدی نے اس فتحِ مبیں میں شریکۃ الحسین زینبؑ کے کردار کو بھی اجاگر کیا ہے ۔

انسانیت کا درس ، پیامِ حسینؑ ہے کیا لازوال نقش دوامِ حسینؑ ہے
محفوظِ لوح ذکرِ امامِ حسینؑ ہے زینبؑ ، مگر محافظِ نامِ حسینؑ ہے
فتنہ اٹھا تھا کفر کا ناکام ہو گیا
زینبؑ سے ذکرِ شاہِ ہدیٰ عام ہو گیا

ہنگامِ عصر سرخ تھا میدانِ کربلا گھوڑوں کی زد میں راکبِ دوشِ رسولؐ تھا
انسانیت کی لاش کچلتے تھے اشقیاء زینبؑ نے بڑھ کے پرچمِ دیں کو اٹھا لیا
مثلِ حسینؑ ، آہنی دیوار بن گئی
بیٹی علیؑ کی قافلہ سالار بن گئی

یہ وہی زینب ہیں جو قدیم مرثیہ میں گریہ و زاری اور آہ و بکا میں مبتلا نظر آتی ہیں ۔ وہی زینبؑ سکندر مہدی کے ہاں قافلہ سالار بن جاتی ہیں ۔ بھائی حسینؑ نے کربلا کو فتح کیا تو زینبؑ کوفہ و شام کو سر کرتی نظر آتی ہیں ۔

گو ظالموں نے چادرِ زہراؑ اتار لی زینبؑ نے زلفِ دینِ پیمبرؐ سنوار لی
ڈوبی ہوئی تھی دین کی کشتی اُبھار لی ہاتھوں میں اپنے گردشِ لیل و نہار لی
بھائی نے سر کٹا کے جو عزمِ سفر کیا
زینبؑ نے ملکِ شامِ غریباں کو سَر کیا

آغا سکندر مہدی کے مرثیوں میں زینبؑ کا کردار کمزور نہیں پڑتا بلکہ اُبھر کر سامنے آتا ہے ۔

صبر کی آہنی دیوار بنی تھیں زینبؑ قوتِ حق کی علمدار بنی تھیں زینبؑ
دین کی قافلہ سالار بنی تھیں زینبؑ بعدِ شہ حیدرِؑ کرار بنی تھیں زینبؑ
نہ ہوئی غم سے پریشان علیؑ کی بیٹی
بن گئی حق کی نگہبان علیؑ کی بیٹی

نجم آفندی کے بعد ان کے اسلوب کے حوالے سے جس شاعر کا نام ذہن میں آتا ہے وہ ہیں مصطفیٰ زیدی ۱۹۶۵ء کے لگ بھگ مصطفیٰ زیدی محرم کی مجالس اور قصیدہ خوانی میں پیش پیش ہوا کرتے تھے، یہ وہ دور تھا جب وہ باعمل مسلمان شاعر تھے، لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد مصطفیٰ زیدی کی شاعری کے سارے استعارے احتجاج سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے اسلوب میں نجم آفندی کا رنگ اور جوش کا آہنگ نظر آنے لگا۔ پھر اس پر مصطفیٰ زیدی کے بین الاقوامی ادب کے مطالعے اور اسلوب میں ندرت تراشی کی کاوشوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ دیکھئے مصطفیٰ زیدی کا اسلوب، رنگ اور آہنگ

ہر دور میں مظلومیت کی داستاں لکھی گئی تادیبِ جبر و سلطنت کے درمیاں لکھی گئی
لمحوں کی زنجیروں میں سطرِ جاوداں لکھی گئی تشریحِ بے عنوان زبانِ بے زباں لکھی گئی
جتنا شعارِ محتسب دشوار تر ہوتا گیا
اتنا ہی ذکرِ خونِ ناحق مشتہر ہوتا گیا

اشکوں سے طغیانی اُٹھی، آہوں سے افسانے بنے جلتے ہوئے حرفوں کے خاکستر سے پروانے بنے
ہر خاک و خوں آلود سے تسبیح کے دانے بنے ہر تشنگی سے ساقیؑ کوثر کے میخانے بنے
تردید کی تکرار میں حق کی صدا بڑھتی گئی
جبرؔ و تشدّد میں نوائے بے نوا بڑھتی گئی

تیغوں کا جوہر کھل گیا جھنکار باقی رہ گئی سیلاب کا رُخ مڑ گیا، دیوار باقی رہ گئی
شامِ وفادارانِ طوق و دار باقی رہ گئی صبحِ اذانِ سیّدِ ابرار باقی رہ گئی
سقراط کے ہونٹوں کو چھو کر زہرِ قاتل مر گیا
کیلوں کا چھوٹا پن صلیبوں کو نمایاں کر گیا

سو داستانوں کا سبب اُجڑے ہوئے لوح و قلم پتھر کی رگ رگ میں ہزاروں ناتراشیدہ صنم
اونچی فصیلیں جست کرتے حوصلوں کے قد سے کم مجلس کے زینوں پر فروزاں ماہِ تاباں کے قدم
فاتح کے چہرے پر ہزیمت کے نشاں اُترے ہوئے
مفتوح کے در پر زمین و آسماں اُترے ہوئے

خونِ شہیداں کو خراجِ اہل حق ملتا رہا لیکن شہادت سے تو ہے مظلومیت کی ابتداء
بعدِ امامِ لشکرِ تشنہ دہاں جو کچھ ہوا کس سے کہوں، کیسے کہوں اے کربلا اے کربلا

دردِ لب و مژگاں نہیں ، کربِ حریمِ دل ہے یہ
لوح و قلم کے عجز کی سب سے بڑی منزل ہے یہ

کیسے رقم ہو بیکسی ، بے حرمتی کی داستاں — اک کنبۂ عالی نسب کی دربدر رسوائیاں
اک مشک جس کو کر گئی سیراب تیروں کی زباں — اک سبز پرچم جھک گیا جو خاک و خوں کے درمیاں

اک آہ جو سینے سے نکلی اور فضا میں کھو گئی
اک روشنی جو دن کی ڈھلتی ساعتوں میں کھو گئی

وہ اہلبیتِ ہاشمی ہر لمحہ جن کو بار تھا — وہ عترت اطہار جن کا ہر نفس آزار تھا
جس ہاتھ سے تھپڑ پڑے وہ ہاتھ اک کردار تھا — عارض سکینہ کے نہ تھے تاریخ کا رخسار تھا

حرفِ تپاں اسلام کا منشور بن کر رہ گیا
جو زخم تھا تہذیب کا ناسور بن کر رہ گیا

وہ دودِ مان حیدری کی ۔ آلِ پیغمبر کی لاش — وہ آیتوں کی گود میں سوئے ہوئے اکبرؑ کی لاش
وہ اک بریدہ بازوؤں والے علمؑ پرور کی لاش — وہ دودھ پیتے لوریاں سنتے علیؑ اصغر کی لاش

معصوم بچے وحشیوں کی جھڑکیاں کھاتے ہوئے
عون و محمد چھوٹے چھوٹے ہاتھ پھیلاتے ہوئے

وہ شامِ خونِ بے وطن ، وہ شامِ ملبوسِ کہن — شورش ، تغیّر ، رُست خیزی ، جانکنی ، دیوانہ پن
تضحیک ، نفرت ، طنطنہ ، تعریف عیّاری ، چلن — اُلٹی قناتوں کا سماں ، لٹتی رداؤں کا چلن

اُلٹی قناتوں میں رواں آتش یزیدی جاہ کی
لٹتی صفوں میں دربدر عترت رسول اللہ کی

وہ جرمنی کا آشوز ، جاپان کا ہیروشیما — ان کی بھیانک نزع کی آواز کو کس نے سنا
ان کے تو لاکھوں دوست تھے ، لیکن یہ خونیں سانحا — ان کے لئے علمی مباحث کے سوا کچھ بھی نہ تھا

اپنی ذہانت کے علاوہ سب سے پردہ پوش تھے
سب جینیر سب ماکرو سب سارتر خاموش تھے

سارے جرائم سے بڑی ہے یہ مہذّب خامشی — اس کے تو آگے ہیچ ہے قاتل کی زہریلی ہنسی
اس علم کے ساغر میں شامل ہے ہلاکت علم کی — اس سے زیادہ اور کیا سنگین ہو گی دوستی

تاریخ پوچھے گی کہ جب مہمان ویرانے میں تھے
کوفے کے سارے مرد کس گھر کے نہاں خانے میں تھے

اور یاد رکھنا اے میرے ہم عصر اربابِ ذکا
ہم پر بھی گر طاری رہا عالم سنہرے خواب کا

کل ہم بھی ہوں گے روبرو ہم سے بھی پوچھا جائے گا
سننا پڑے گا ہم سبھی کو کربلا کا فیصلہ

قاتل تو شاید عفو کے قابل ہوں وہ مجبور تھے
ہم دوست ہو کر کیوں ضمیر ارتقاء سے دور تھے

مصطفیٰ زیدی کی عمر نے وفا نہ کی اور ان کا ایک مرثیہ بھی مکمل نہ ہو سکا لیکن یہ نامکمل مرثیہ جس کے چند بے ترتیب بند یہاں نقل کئے گئے ہیں اس واضح منزلِ فکر اور اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے جس طرف انہوں نے سفر شروع کیا تھا، کاش انہیں کچھ اور وقت مل جاتا تو شاید مرثیہ کی تاریخ آج کچھ اور ہوتی۔ آج ہم اسے مسدس کہیں یا مرثیہ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ اس اسلوب کو آگے بڑھانے والا نہیں رہا، اگر اسے مسدس بھی کہا جائے تو بھی شاید اہل نظر میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اردو مرثیے کے تذکرے میں مصطفیٰ زیدی کے اس نامکمل مرثیے کے حوالے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک نامکمل مرثیہ کہنے پر ہم انہیں مرثیہ گو شاعروں میں شمار بھی نہیں کر سکتے۔

پاکستان کے محقق سید ضمیر اختر نقوی کی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" کے مطابق مصنف کے رائے میں پاکستان کے حوالے سے جدید مرثیہ کے معمار درج ذیل حضرات ہیں جن پر انہوں نے مضامین بھی لکھے ہیں

جوش ملیح آبادی	پہلا مرثیہ - ۱۹۱۸
نسیم امروہوی	پہلا مرثیہ - ۱۹۲۳ء
راجہ صاحب محمود آباد	پہلا مرثیہ ۱۹۳۲ء
سید آل رضا	پہلا مرثیہ ۱۹۳۹ء
نجم آفندی	پہلا مرثیہ ۱۹۴۳ء

یوں تو سارے مضامین مصنف کی تحقیقی کاوش اور عقیدت و محبت کا خوبصورت امتزاج ہیں لیکن راجہ صاحب محمود آباد پر ایک قابل ذکر مضمون ضمیر اختر نقوی کی شرافتِ نفسی اور اعلیٰ ظرفی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ راجہ صاحب محمود آباد قیام پاکستان کے گنے چنے محسنوں میں تھے لیکن اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو تاریخِ اسلام میں محسنوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ لوگ رسولؐ کے اجرِ رسالت سے منحرف ہو گئے۔ راجہ صاحب

کے احسانات کا بدلہ کون دیتا ۔ پاکستان کے خواص نے راجہ صاحب کو شعوری کوشش کے تحت فراموش یا نظرانداز کیا ۔

کون نہیں جانتا کہ راجہ صاحب نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے دور میں حصولِ پاکستان کے لئے تن من دھن ، سب کچھ قربان کر دیا ۔ اس دور میں راجہ صاحب لکھیم پور کھیری کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ ایک شخص نے سوال کیا ۔ " راجہ صاحب آپ جس پاکستان کی بات کر رہے ہیں وہ اگر بن گیا تو آپ کی ریاست تو اس میں شامل نہیں ہو گی ۔ آپ کیا کریں گے ؟ " راجہ صاحب نے برجستہ جواب دیا " میں اپنی ریاست کو مسلمانوں کے لئے قربان کر دوں گا اور اپنے لئے چائے کی دکان کھول لوں گا لیکن پاکستان بن کر رہے گا " ۔

چنانچہ پاکستان بن گیا ۔ اور راجہ صاحب نے سب کچھ لٹا دیا ۔ پاکستان میں راجہ صاحب نے کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا حتیٰ کہ بساطِ سیاست کے شاطروں نے انہیں یوں نظرانداز کیا کہ جیسے ان کا پاکستان کے حصول سے کوئی تعلق ہی نہ ہو ۔

میں خود عینی شاہد ہوں کہ سکندر مرزا کے دور میں صدر کے مسلسل اصرار پر ایک روز راجہ صاحب صدر سکندر مرزا سے ملنے آ گئے ۔ اقبال امام ان دنوں صدر کے باڈی گارڈ تھے ۔ راجہ صاحب اقبال امام (بلّن بھائی) پسند کرتے تھے ، (یہ وہی اقبال امام ہیں جن کی شادی بعد میں سکندر مرزا کی صاحبزادی سے ہوئی تھی) ۔

بلّن بھائی نے راجہ صاحب کو صدر کی کار میں بٹھایا اور وکٹوریہ روڈ الفنسٹن سٹریٹ اور صدر کراچی کی ساری متروکہ عمارتیں دکھائیں اور راجہ صاحب سے ڈرتے ڈرتے کہا ۔

" حضور آپ جس جس عمارت کو پسند فرمائیں ، صدر مملکت وہ آپ کو الاٹ کرنا چاہتے ہیں "

راجہ صاحب نے یہ پیشکش ٹھکرا دی اور ایک عجیب بات کہی ۔

" میری طرف سے مرزا صاحب کا شکریہ ادا کر دیجئے اور ان سے کہیئے کہ وہ مجھے خوش کرنا چاہتے ہیں تو اس مملکتِ خداداد کی بے لوث خدمت کریں ۔ حاکم بن کر نہیں بلکہ خادم بن کر "

یہ تھے راجہ صاحب اور ان کا کردار ۔ ان کی علمی اور ادبی شخصیت اس سے جُدا ہے جو اس بات کی متقاضی ہے کہ ان پر تفصیل سے لکھا جائے ۔ اس کتاب کے دامن میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ راجہ صاحب کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی حیثیت کا احاطہ کیا جا سکے ۔ اس سلسلے میں ضمیر اختر نقوی اپنی مذکورہ بالا کتاب میں اور ضیاء الحسن موسوی ، " ایک تھا راجہ " میں کسی حد تک یہ حق ادا کر چکے ہیں ، اس کے باوجود سے

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہم یہاں راجہ صاحب کی مرثیہ نگاری کا حوالہ دینا چاہتے ہیں اس لئے کہ مرثیہ پر گفتگو کے ضمن میں ان کی مرثیہ نگاری کو نظر انداز کرنا بھی اتنا ہی بڑا ظلم ہے جتنا سیاست، دین، تحریک آزادی اور پاکستان کے حصول میں ان کی قربانیوں کو فراموش کرنا۔

راجہ صاحب نے آٹھ مرثیے کہے ہیں۔ ان کے مرثیوں کی شعری زبان، ہیت، اور مواد روایتی مرثیے کے معیار پر پورا اترتا ہے اس کے ساتھ ساتھ جدید تخیّلات کا اُجالا بھی ان کے مرثیوں کو آب و تاب دیتا نظر آتا ہے۔ راجہ صاحب غزل کے شاعر تھے اور بعد میں مرثیے پر آئے۔ اس لئے ان کے مرثیوں میں غزل کی روانی اور تغزل کی چاشنی بکھری نظر آتی ہے۔

قمر پہ مہرِ خدا کی دلیل روشن ہے جہاں پہ چادرِ نور اس کی سایہ افگن ہے
ضیا سے اس کی منوّر قمر کا دامن ہے اس ایک نور سے رنگین صبحِ گلشن ہے
وفورِ شوق سے گردوں کا داغ جلتا ہے
خدا کی شان کہ دن کو چراغ جلتا ہے

راجہ صاحب کے ایک مرثیے کا عنوان "پانی" ہے اس موضوع پر راجہ صاحب سے پہلے کوئی مرثیہ نہیں ملتا۔ اُن کے بعد ۱۹۷۱ء میں جوش نے اور ۱۹۷۲ء میں نسیم امروہوی نے مرثیے کہے۔ جوش بہر حال جوش ہیں۔ نسیم امروہوی کی قادر الکلامی بھی مسلّمہ ہے۔ لیکن راجہ صاحب نے جس خوبصورتی سے پانی، بادل، خشک زمین، رواں دواں نہریں، بہتے دریا، مہکتے پھول، لہلہاتے چمن، زندگی کی تب و تاب اور پانی، ساری علامات و استعارات کا استعمال کیا ہے وہ اپنی جگہ منفرد ہے۔

جہاں کے واسطے ہے وجہِ زندگی پانی ہے چشمِ عالمِ ایجاد کی تری پانی
اسی سے مشکلِ اہلِ زمین ہوئی پانی رگوں میں دہر کے دوڑا کیا یہی پانی
بڑھے ہوئے ہیں اسی سے تپاک کے دامن
اسی نے رنگ دیئے صحنِ خاک کے دامن

خزاں کے دور اسی کی نمو سے ہیں ٹوٹے مزے اسی سے چمن نے بہار کے لوٹے
اسی نے دامنِ گل پر سجائے ہیں بوٹے اسی کی چوٹ سے گلشن میں آبلے پھوٹے
اس کی آگ نے گوہر کو کر دیا پانی
اس نے گل کے کٹوروں میں بھر دیا پانی

اس کے جُود سے پر ہیں بہار کے آغوش　　اندھیری رات میں ہے حکمراں اسی کا خروش
زبانیں موجوں کی جلنے لگی ہیں دوش بدوش　　یہ سو زبانوں سے گویا ہے اور پھر خاموش
یہی ہے وہ اگر اونچا ہوا کہیں سر سے
تو اس کے فیض سے کشتِ عمل میں مُن برسے

اس مرثیے میں راجہ صاحب نے ضعیف و توانا، کمزور اور طاقت ور کی کشمکش کو ظاہر کرنے کے لیے ایک بہت ہی خوبصورت انداز اختیار کیا ہے۔ انہوں نے قوتِ نمو کو طاقت کے خلاف ایک عمل قرار دیتے ہوئے استعاراتی طور پر کہا ہے کہ کمزور کے ساتھ خدائی طاقت ہوتی ہے۔

سحاب فیض جو برسا تو بھر دئے جل تھل　　یہ انقلاب، یہ تعمیر، اور یہ ردّ و بدل
یہ ناتوان کی قوت ہے دیکھ زورِ عمل　　طبق زمین کے اور توڑ دے ہری کونپل
کوئی قوی ہے ضعیفوں کے ساتھ ساتھ ضرور
نمو کے پردے میں پنہاں ہے کوئی ہاتھ ضرور

ضمیر اختر نقوی نے اس مرثیے کے تناظر میں جوش اور نسیم امروہوی کے اسی موضوع پر مرثیوں کا حوالہ دیتے ہوئے راجہ صاحب کے مرثیے کو منفرد قرار دیا ہے۔ "اردو مرثیہ" میں علی عباس حسینی نے کہا ہے کہ اگر مرثیے سے الگ کر کے اس نظم کو دیکھا جائے تو اس موضوع پر ایک حسین نظم تسلیم کی جا سکتی ہے۔ بقول ضمیر اختر نقوی:۔

"اس مرثیے میں راجہ محمود آباد نے موضوع کے ربط کے ساتھ واقعہ کربلا کی طرف اس طرح گریز کیا بہ الفاظ دیگر گریز کی چابکدستی نے اسے مرثیہ بنا دیا"۔

ہزار بار بنا وجہِ امتحان پانی　　کبھی زمانہ تھا خاک اور کبھی جہاں پانی
وہ دن بھی آیا کہ روکے تھے پاسباں، پانی　　سنا ہے مانگتا تھا ایک میہماں پانی
جہاں سے تشنہ دہن شاہِ مشرقین اٹھے
فرات شرم سے پانی ہوئی، حسینؑ اٹھے

راجہ صاحب محمود آباد کو قدرت نے مسندِ فرمانروائی عطا کی تھی لیکن محبتِ محمدؐ و آل محمدؐ نے انہیں قلندری کی حقیقتوں سے آشنا کر دیا اور ان کے مزاج میں درویشی آگئی۔ یہ درویشی بناوٹی نہیں تھی، مصلحت کے تحت نہیں تھی بلکہ ان کے خون میں رچ بس گئی تھی جو ان کی زندگی کے ہر عمل سے ظاہر ہوئی حتیٰ کہ شاعری سے بھی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے وہ کام کیا جو بقول اظہر علی فاروقی دشوار تھا۔ اظہر علی فاروقی نے لکھا ہے:۔

"کربلا کے بہت سے شہداء ایسے ہیں جن پر انفرادی طور پر مرثیے نہ لکھے جا سکے۔ اور سچ پوچھیے تو یہ کام ذرا دشوار تھا۔ تقریباً اکسٹھ نام شہداء کے تحریر کئے گئے ہیں جن میں ایک نام جون، غلامِ ابوذر غفاری کا بھی ہے راجہ صاحب نے جوّن کے حال پر ایک پورا مرثیہ لکھا ہے"۔

راجہ صاحب کے اس مرثیے میں سرمایہ داری کی مذمت کے ساتھ ساتھ تمیزِ بندہ و آقا کو مٹانے کے لئے اسلام کے اصولوں کا تذکرہ بھی ہے۔ جوّن کی زبان سے جو رجز نظم کیا گیا ہے اس میں جوّن نے اپنے آقا ابوذر غفاری کے کردار و سیرت پر بات کی ہے۔"

جوّن ہے نام، غلامِ شہِ خیبر ہوں میں
اس بڑھاپے میں جوانوں کے برابر ہوں میں
تین دن کی ہے عطش، طالبِ کوثر ہوں میں
خواہشِ زر نہیں گو عبدِ ابوذر ہوں میں

وہ ابوذرؓ تھا جنہیں نفس پر اپنے قابو
رگ و پے میں تھا رواں جن کے شریعت کا لہو
مسجدِ زہد میں محراب تھے جن کے ابرُو
صادق اللہجہ، جری، عالم و دانا خوشخو
خود مٹے دین پیمبر کی نگہبانی کی
فقر نے جن کے زمانے میں سلیمانی کی

مقامِ افسوس ہے کہ ابھی تک راجہ صاحب کے مرثیے شائع نہیں ہوئے۔ تاریخ کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ سیاست دانوں نے انہیں نظر انداز کیا۔ اہلِ ادب نے انہیں نظر انداز کیا۔ اور سب سے بڑا ظلم یہ کہ ان کی پنی قوم نے انہیں نظر انداز کیا۔ جن حضرات نے راجہ صاحب کے سارے مرثیوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کے مراثی، مرثیوں کی تاریخ میں بھی ایک خوشگوار اضافہ کرتے ہیں اور اردو ادب کی کائنات میں بھی پاکستان میں اردو مرثیہ کا ایک ماحول بن چکا ہے۔ کیا ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر ہلال نقوی، یا کوئی اور اہل فکر و نظر اس طرف متوجہ ہو گا۔

ضمیر اختر صاحب نے راجہ صاحب کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ میری ہی نہیں ہر درد مند دل کی آواز ہے لیکن جب جدید مرثیے کے معماروں کی بات آتی ہے تو بات عدل و انصاف کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے ضمیر اختر صاحب بھی اس سے اتفاق کریں گے کہ عدل و انصاف میں عقیدت، محبت یا نفرت کا گزر ممکن نہیں۔ اور کسی کو از روئے احتیاط یا محبت و عقیدت اس کے اپنے مقام سے بڑھانا فضیلت

نہیں بلکہ کبھی شبیہہ فضلیت کے زمرے میں آتا ہے اور کبھی ظلم کے دائرے میں ۔ ہم چودہ سو سال سے اسی بات پر لڑ رہے ہیں کہ فضلتیں عقیدت کے ہاتھوں نہیں ، انصاف کے ہاتھوں دی جاتی ہیں ۔ یہ بات اپنی جگہ مسلّم کہ راجہ صاحب کے مرثیوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کی قدرتِ کلام ، سلاست ، روانی ، استعارات کا استعمال ، جدید علوم کی چاشنی ، فقر کی ضیا پاشی سب کچھ ناقابل تردید ہے مگر یہ بھی غلط نہیں کہ ان کا میدان سیاست تھا ، شاعری نہیں ۔ شاید یہی سبب تھا کہ انہوں نے اپنی حیات میں کبھی اپنے مراثی شائع کرانے کی طرف توجہ نہیں دی ، ورنہ تو یہ امر ان کی زندگی میں محال نہیں تھا ۔

جدید مرثیے کے ارتقاء کے پہلے دور میں (۱۹۲۷ء سے ۱۹۵۰ء تک) نسیم امروہوی اور آل رضا بھرپور مرثیے کہہ رہے تھے ، نسیم امروہوی نے پہلا مرثیہ ۱۹۲۳ء میں کہا تھا ، جوش کی شعلہ و شبنم کی اشاعت سے پہلے ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ آئے تو جوش کے زیر اثر مرثیے کی فضا بدل رہی تھی ۔ حسینؑ اور کربلا کے حوالے سے مرثیے میں آزادی کی امنگ ، غلامی سے نفرت ، جبر کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ اور باطل کی طاقت کے خلاف حق و صداقت کی برتری وغیرہ مرثیوں میں در آئی تھی ، نسیم امروہوی نے ۴۰ء تک مختلف الفکر مرثیے کہے جس میں " اے انقلاب مژدہ عزم و عمل ہے تو " یا شہید معرکۂ جہدِ ارتقاء ہے حسینؑ بھی شامل ہیں لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ و معنی میں فرق نہ ہونے کے باوجود ملا اور مجاہد کی اذان میں فرق رہا ۔

ڈاکٹر ہلال نقوی نے " بیسویں صدی اور جدید مرثیہ " میں بہت وسیع القلبی سے مرثیہ نگاروں کو جمع کیا ہے ۔ نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کو انہوں نے چھ ادوار میں تقسیم کیا ہے جس دور کا ذکر ان سطور میں کیا گیا ہے اس دور میں کہا ہوا نسیم امروہوی کا ایک شعر انہوں نے نقل کیا ہے ۔

نہ داد دیجئے چاہے کلام کی سنئے
یہ شاعری نہیں باتیں ہیں کام کی سنئے

یہ شعر نقل کر کے ڈاکٹر ہلال نقوی نے کہا ہے ۔

" جس وقت یہ مرثیہ لکھا گیا تھا اس وقت " کام کی بات " صرف جذبۂ اتحاد تھا جس کی بدولت غلامی کا لباس اُتار پھینکنے کی حرارت دلوں میں پیدا ہو سکتی تھی " ۔

اس کے بعد کے مرثیوں میں بھی نسیم امروہوی نے اپنی طرز کو باقی رکھا ۔ انہوں نے قدیم لہجے اور اسلوب میں جدید فکر سمونے کی کوشش کی جسے اس مدھم آنچ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو حرارت تو باقی رکھتی ہے لیکن اس سے آگے کی منزل تک نہیں پہنچا سکتی ۔

ڈاکٹر ہلال نقوی خود اچھے مرثیہ گو بھی ہیں اور دیانتدار محقق بھی ہرچند کہ انہوں نے نسیم امروہوی کا

ذکر جدید مرثیے کے تناظر میں کیا ہے اور تفصیل سے کیا ہے لیکن اس بات کے اختتام پر " مرثیے کی کلاسیکی روایت کے آخری شاعر " کے زیرِ عنوان مختلف آراء بھی نقل کی ہیں مثلاً

پاکستان میں فن مرثیہ گوئی کو ایک بار پھر کسی نے بام عروج پر پہنچایا ہے تو میری نظر میں بے اختیار مولانا نسیم امروہوی صاحب کی طرف اٹھ جاتی ہیں ۔

(ابراہیم جلیس)

علی عباس حسینی نے انہیں نئے مرثیے کا سرخیل کہا ہے ۔

نادم سیتاپوری کے نزدیک پاک و ہند میں مرثیہ نگاری اور مرثیہ گوئی کی عظیم و پاکیزہ روایات انہی کے دم سے زندہ ہیں ۔

اس کے بعد ذیل کی تحریر نادم سیتاپوری کی تحریر سے متصل ہے اور یہ اندازہ لگانے میں دشواری ہوتی ہے کہ یہ تحریر نادم سیتاپوری کی ہے یا ڈاکٹر بلال نقوی کی ، اور جس کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر بلال نے لکھا ہے یعنی گلدستہ اطہر ، اطہر جعفری ، تبصرہ نادم سیتاپوری ۔ وہ کتاب مجھے نہ مل سکی ، البتہ نادم سیتاپوری کے پہلے جملے کے بعد حاشیہ کے نشان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذیل کی تحریر کی جزا یا سزا کے مستحق ڈاکٹر بلال نقوی ہیں ۔ نسیم امروہوی لکھتے ہیں ۔

" جدید مرثیے کی تاریخ کے مطالعہ میں ان کی شخصیت ایک ایسے دبستان شعر کی صورت میں نمودار ہوئی ہے جہاں گذشتہ مرثیے کی روایات اپنے سفرِ آخر کے ساتھ ساتھ ایک ایسی منزل کی طرف گامزن ہیں جس میں جدید عہد کی آہٹ بہت دور سے سنائی دے رہی ہے ۔
نسیم صاحب کے فن کے حوالے سے لکھ چکا ہوں کہ وہ یکسر نہ جدید ہیں نہ سراپا قدیم بلکہ وہ ان دونوں مزاجوں کے سنگم کا نام ہیں ۔ وہ لکھنو میں بھی نئے ادبی رجحانات سے زیادہ قریب نہیں رہے ۔ جس طبقۂ علماء میں ان کی نشست و برخواست تھی وہ اپنی تمامتر علمی وجاہت کے باوجود قدیم مزاج سخن کے افراد تھے ۔ نسیم کے مزاجِ سخن پر اس کے بہت گہرے اثرات ہیں ۔ انہوں نے جدید سے جدید موضوع کا انتخاب کیا لیکن اسلوب بیان کی روایتی نہج اکثر جگہ غالب رہی ۔ رعایتِ لفظی کا دور ان کے ہاں کم ہوا مگر انہوں نے اسے دور آخر تک ترک نہیں کیا ۔ " جدّہ سے آگیا ہوں میں جد کے مزار پر " ان کے مرثیے کی جو خصوصیت انہیں اپنے بڑے معاصر شعراء سے منفرد کرتی ہے وہ ان کے مرثیے کا علمی مزاج ہے .... وہ اصلاحی اور تبلیغی شاعر ہیں انقلابی نہیں .... جب وہ جدید اسٹائل پر آتے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ

اپنے مزاج سے ہٹ رہے ہیں، ان کے ہاں تصنع بولنے لگتا ہے..... ہمارے عہد میں وہ مرثیے کی کلاسیکی روایت کے آخری شاعر ہیں، "

صاحبو، یہی نہیں کہ وہ ہمارے عہد میں مرثیے کی کلاسیکی روایت کے آخری شاعر ہیں بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اس عہد میں اور اس تناظر میں ان کا کوئی مدمقابل بھی نہیں ہے اور ان کے بعد بھی ان کے بہت سے شاگرد روایت کے اس چراغ کو روشن کئے ہوئے ہیں۔

مرثیہ کے افق پر پاکستان اور کراچی کے حوالے سے ایک اور ماہِ منوّر کا نام بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ ہے سید آل رضا کا نام نامی۔ آل رضا نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۴ء میں کہا تھا جو روایتی مرثیے کے مروّجہ اصولوں سے ہٹ کر تھا، یہ وہی دور تھا جب جوش، جمیل مظہری اور نجم آفندی کا طوطی بول رہا تھا، آزادی کی تحریک دن بدن تیز ہو رہی تھی، دلوں میں انقلاب کی امنگیں چہروں پر نور بن کر چمکنے لگی تھی اور حسینؑ اس متوقع انقلاب کے ہیرو تھے۔ آل رضا نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ نجم آفندی سے بہت متاثر تھے، ڈاکٹر بلال نقوی نے وحید الحسن ہاشمی اور ضمیر اختر نقوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ۔

" وہ نجم صاحب کی شاعری سے بہت متاثر تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر نجم آفندی کے نوحے نہ ہوتے تو میں جدید مرثیہ نہ کہہ سکتا۔ "

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ)

آل رضا نے جب اپنا پہلا مرثیہ لکھنؤ میں پڑھا تو مرثیہ پڑھنے سے پہلے خود انہوں نے اسے مسدّس کہہ کر پڑھا تھا۔ خیال غالب ہے کہ یہ احتیاط اس طوفانِ باد و باراں سے آگہی کے سبب تھی جو کاشانۂ جوشؔ کو اُن دنوں اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا۔ آل رضا نے اس مرثیہ میں چہرہ، گریز، رخصت، میدان، جنگ، شہادت کی سیڑھیاں نہیں چڑھے تھے بلکہ براہ راست قربانیٔ حسینؑ کے مقصد کی طرف آگئے تھے اور قربانیٔ حسینؑ کو پیغامِ رسولؐ اور مقصدِ رسالت سے متّصل کر دیا تھا جبکہ اسلوب و آہنگ قدیم مرثیے کا ہی تھا لیکن انیس و دبیر کی روایتوں کے محافظ انیسئے اور دبیرئے اُن پر ٹوٹ پڑے اور اپنی ناپسندیدگی کے تیر آل رضا پر برسائے۔

آل رضا کا تخلیقی پس منظر جوش، جمیل مظہری اور نجم کی طرح نظم نہیں بلکہ غزل ہے۔ وہ غزل سے براہ راست مرثیے پر آئے، اسی لئے ان کے الفاظ کا انتخاب سادہ ہوتا ہے۔

کتنا نازک تھا فریضہ جو بجا لائے حسینؑ
تا بہ دل حلقۂ مذہب کو بڑھا لائے حسینؑ
کلمہ، رسم کے پھندے سے چھڑا لائے حسینؑ
حق کو ناحق کی ملاوٹ سے بچا لائے حسینؑ

نقل میں اصل حقیقت کو جو کھپنے نہ دیا
ڈھونگ اسلام مجازی کا پنپنے نہ دیا

اس سلاست کے حوالے سے یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ آل رضا انیسؔ سے زیادہ مرزا دبیرؔ کی فنی عظمت کے قائل تھے ۔ انیس کے متعلق ان کا نظریہ تھا " انیس کے ہاں بے جا سخن آرائی ملتی ہے ۔ " ان کے اس قول کی گواہی ڈاکٹر ہلال نقوی اور ضمیر اختر نقوی نے دی ہے اور یہ گواہی یقیناً بلا اُجرت ہے اس لئے اس کی صداقت مسلم ہے ۔ شاید اسی لئے جب ان کا ایک مصرع " وہ دن ڈھلے تشنجِ میدان کربلا " سامنے آیا تو پروفیسر محمد رضا کاظمی نے " جدید اردو مرثیہ " میں تحریر کیا کہ تشنج کا لفظ مرثیے کے لئے اجنبی ہے ۔ (حالانکہ انہیں یہ لکھنا چاہیئے تھا کہ یہ لفظ آل رضا کی ڈکشن میں غیرمانوس ہے) ۔ بہرحال ڈاکٹر ہلال نقوی نے ان کا دفاع کیا اور مرزا دبیر کے دو اشعار نقل کئے ۔

ننھی کلائیوں میں تشنج سے بل پڑے ہچکی جو آئی منہ سے انگوٹھے نکل پڑے
(مرثیہ " بانو کے شیرخوار کو ہفتم کی پیاس ہے ")

خوں ہو گیا تھا خشک یہ اُمت کا جور تھا گویا کہ سارے تن میں تشنج کا طور تھا
(مرثیہ " پہنچا دیار شام میں جب سر امام کا ")

دبستانِ دبیر کی طرف آل رضا کی رغبت اس لئے بھی دلچسپ ہے کہ یہ پورا دبستان ، غزل کی حمایت نہیں کرتا اور آل رضا کی مرثیوں میں غزل کی خاصیت ملتی ہے جو انہیں دبستانِ عشق و تعشق کے قریب لائی ہے دبستان دبیر سے نہیں ۔ لیکن اپنے مرثیے " عظمت انسان " میں وہ مرزا دبیر کے صاحبزادے مرزا اوج کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں ۔ ان دو متزاد نظریوں سے وابستگی کے ساتھ ساتھ وہ نجم آفندی کے پیرو بھی ہیں اور لاشعوری طور پر اس دور کے تمام مرثیہ نگاروں کی طرح جوشؔ کے مسلک کے راہرو بھی ۔ آل رضا کے استاد حضرت آرزو لکھنوی نے غزل اور گیت کو فارسی زبان کے اثر سے دور کرنے کی کوشش کی اور زبان کو سہل اور عام فہم بنایا ، انہوں نے سلاست کو بلاغت پر ترجیح دی ، وہ غزل اور گیت کے مستند شاعر ہونے کے علاوہ بہت اچھے مرثیہ گو بھی تھے چنانچہ آل رضا کی شاعری ان سارے اثرات کے تحت تھی جسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ آل رضا کی شاعری اس قوس قزح کی طرح ہے جس میں سارے رنگ جھلکتے ہیں ۔ غزل کی ڈکشن میں مرثیہ لکھنے کا تجربہ تعشق کی طرح آل رضا کے ہاں بھرپور ملتا ہے ۔

شاعری میں جدّت اور فکرِ نو دو طرح سے آتی ہے ، ایک تو یہ کہ شاعر کی اُفتادِ طبع اور اس کا مزاج ہی علیحدہ ہو ، اس میں ندرت ہو ، فکر انگیزی ہو ۔ اس کی مثال جوش ہیں ، نجم آفندی ہیں ، مصطفیٰ زیدی ہیں ، آغا

سکندر مہدی ہیں اور دوسرے وہ صورت حال ہوتی ہے جہاں شاعر شعوری طور پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے وقت کے بدلتے دھارے کے ساتھ چلنا ہے۔ سید آل رضا کو اس ضرورت کا شعور و ادراک تھا کہ انہیں وقت کی بدلتی قدروں کا ساتھ دینا ہے اور انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

قدیم مرثیہ گو یوں کا ہے مثال کلام سپہرِ مرثیہ گوئی پہ جیسے ماہِ تمام
برنگ روئے زمانہ ہے جس کا خاص مقام نہ ہے نہ ہو گا ابھی جس کی خوبیوں میں کلام
غلط کہ قابلِ وقعت نہیں سمجھتا ہوں
بس اس کو مالِ غنیمت نہیں سمجھتا

سکھا گئے ہیں وہ تنظیمِ مرثیہ کا شعور نہ یہ کہ کر گئے ہر جور بند پر مجبور
چلا کرے گا کہاں تک یہ محترم دستور وہی کہو جو وہ کہتے تھے ورنہ بزم سے دور
یہ مجلسوں کا تبرک ہے بے شمار بٹے
جو ایک بار بٹا ہے وہ بار بار بٹے

ہر اک زمانے میں اجزائے مرثیہ بدلے تھے ایک دور ہی میں مرثیوں کے رنگ نئے
کہو ضرور کہو جو بزرگ کہتے تھے مگر کچھ اپنی طرف سے بھی خاص بات رہے
کلام غیر کو اپنا لیا تو کیا حاصل
ادل بدل کے وہی کہدیا تو کیا حاصل

انہوں نے اپنی فکر کی وضاحت ہی نہیں کی بلکہ قدیم لباس میں نئے پیکر تراشنے کی عملی کوشش بھی کی ہے۔ قدیم مرثیے میں متصادم قوتوں کا تقابل اکثر کیا گیا ہے مگر یہ تقابل یا وضاحت عام طور پر رجز میں ہوئی ہے۔ آل رضا نے بیانیہ میں ان قوتوں کے درمیان تقابل کیا ہے۔

منتظر وقت کو تھا ایسے ہی ایثار سے کام ارتقاء دو نظریوں کا ہوا طشت از بام
ایک اسلام سے منسوب حکومت کا نظام دوسرا موردِ آلامِ حقیقی اسلام
ایک سر چڑھ کے یزیدِ اُموی میں ابھرا
دوسرا پس کے حسینؑ ابن علیؑ میں ابھرا

اُس کو یہ کد کہ نیا دین کا افسانہ بنے اِس کو یہ فکر کہ اسلام تماشہ نہ بنے
اُس طرف یہ کہ مٹا ڈالیں جو ایسا نہ بنے اِس طرف وہ بھی نہیں غیر جو اپنا نہ بنے

زعم اس کو کہ ابھی چوٹ کڑی باقی ہے
ناز اس کو حسینؑ ابن علیؑ باقی ہے

منزلِ آلِ محمد تہہ و بالا کرنا
لے کے بیعت اسے منظور تھا رسوا کرنا

شاہِ دیں ، اور یہ تذلیل گوارا کرنا
ان سے جو نام تھا زندہ اسے مُردہ کرنا

چاندنی رات کہاں تک شبِ دیجور بنے
کہہ کے دیکھے کوئی سورج سے کہ بے نور بنے

اس اسلوب میں غزل کا بانکپن جھلکتا ہے ۔ آرزو لکھنوی سے قربت کا احساس ہوتا ہے ۔ اب رہی مرزا اوج سے تعلق کی بات تو وہی مضامین جو مرزا اوج نے خنجر بکف ہو کر نظم کئے تھے وہ مضامین آل رضا نے شبنم مزاجی کے ساتھ رگ گل سے باندھے ہیں ۔

دوستوں کو میرے پہنچے میری جانب سے سلام
اللہ اللہ وہ دلبندِ محمدؐ کا پیام

اب بھی سوچیں نہ جو ہم لوگ تو جینا ہے حرام
پُراثر کتنا ہے تعلیمِ مکمل کا نظام

دوستی کا ہمیں دعویٰ ہے تو کیا کرتے ہیں
کیا حسینی اس حالت میں جیا کرتے ہیں

اور اب ملاحظہ فرمائیے نجم آفندی سے ذہنی ہم آہنگی یا اکتسابِ فکری مگر ان کے اپنے اسلوب میں ۔ نجم نے کہا تھا
" جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا "
سید آل رضا کہتے ہیں ۔

سرخرو بن کے سرِ میدان فاتح
خون میں ڈوبے پڑے تھے نئی فتح کے عنوان فاتح

سربُریدہ ، دہنِ زخم سے خنداں ، فاتح
شانِ مظلوم جتاتے ہوئے ذیشان فاتح

برملا خوں سے بھری خاک پہ سونے والے
کفن و گور میں پوشیدہ نہ ہونے والے

عہد حاضر میں مرثیہ گوئی پر تنقید کرنے والوں میں سے پروفیسر سید محمد رضا کاظمی کی آواز ایک متعبر آواز ہے ۔ آواز کبھی فکر کے زیر اثر ہوتی ہے اور کبھی جذبات کے زیر نگیں ۔ آواز جب فکر کا پرچم لے کر نکلتی ہے تو دانشورانہ آواز کہلاتی ہے ۔ یہ ارسطو کی آواز ہوتی ہے ۔ افلاطون کی آواز ہوتی ہے ۔ برٹرنڈرسل کی آواز ہوتی ہے ۔ اور آواز جب جذبات کا علم بلند کر کے آگے بڑھتی ہے تو یہ آواز اگر منفی ہے تو فرعون ، شداد ، ابو جہل یا آل ابی سفیان کی آواز ہوتی ہے ۔ اور اگر مثبت ہو تو محبّت کی آواز ہوتی ہے ، سلمانؓ کی آواز ہوتی ہے ۔

ابوذرؓ کی آواز ہوتی ہے لیکن اگر آواز بیک وقت فکر و تعقّل اور محبت کی آئینہ دار ہو تو عصمت کی آواز ہوتی ہے پھر یہ آواز محمدؐ کی آواز، علیؑ کی آواز، حسینؑ کی آواز ہوتی ہے، حق کی آواز ہوتی ہے۔ اور خالق نے یہ حق اور اختیار ہر انسان کو دیا ہے کہ وہ اپنی آواز کو حق کی آواز کے ساتھ ملائے یا باطل کے ساتھ۔ جملۂ معترضہ کی معذرت۔ بات ہو رہی تھی مرثیہ کی دنیا میں تنقید کے حوالے سے ایک معتبر آواز، پروفیسر رضا کاظمی کی جن کی آواز، فکر و دانش کے زیر اثر، آل رضا کے متعلق ان کے مرثیئے " عظمت انسان " کے بارے میں یہ کہتی سنائی دیتی ہے۔

" آل رضا کے نظامِ فکر میں اقبال کی طرح مسلسل ارتقاء کا تصوّر موجود ہے۔ ایک بند میں انہوں نے خودی کے مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ (آل رضا) عشق کو عقل پر فوقیت دینے پر آمادہ نہیں۔ اسی دور کے " دوسرے " مفکر شاعر جمیل مظہری کے اس حد تک ہم نوا ہیں کہ انسان کی خواہشات کو اس کے ارتقائی مقاصد کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔

(جدید اردو مرثیہ ص ۲۰۱)

یہاں اس دور کے " دوسرے مفکر شاعر " کے الفاظ سن کر ایک تاریخی حقیقت یاد آتی ہے۔

" چودھویں صدی میں ایک اطالوی نثر نگار بوکیچو BOCCACCIO کا مجموعہ شائع ہوا جس نے افسانہ نگاری میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس کی کامیابی سے متاثر ہو کر سارے اطالوی ادیبوں نے اسی طرز پر افسانے لکھنے شروع کر دیئے جنہیں نوویلا NOVELLA کیا جانے لگا، بوکیچو کا ۱۳۷۵ء میں انتقال ہو گیا۔ سترھویں صدی میں ایک اور اطالوی ادیب باٹسٹا بسیل BATTISTA BESILE نے کہانیاں لکھنی شروع کیں اور DECAMERON کی کہانیوں کی روش کو اپنایا۔ اس کی کہانیوں کو تین سو سال پہلے شائع ہونے والی کتاب DECAMERON کی بنیاد قرار دیا گیا اور برسوں یہ آوازیں سنائی دیتی رہیں، بالکل اسی طرح جمیل مظہری کے حوالے سے " دوسرے مفکر شاعر جمیل مظہری " والا جملہ بھی بہت دلچسپ نظر آتا ہے۔ یہ تو تھی فکر و دانش کے زیر اثر آواز کی بات لیکن جب یہی آواز جذبات کے مثبت رویے محبت کے زیر اثر ہوتی ہے تو محترم رضا کاظمی یہ کہتے سنائی دیتے ہیں۔

" اس لحاظ سے " عظمت انسان " اس عہد کے دوسرے آفاقی مرثیے " افسانہ ہستی " سے برتر ہے
" (جدید اردو مرثیہ صفحہ ۲۰۷)

یا آل رضا کا جوش سے تقابل کرتے ہوئے یوں سنائی دیتی ہے۔

" جذبات نگاری کے اس معیار کے سبب آل رضا کا ابتدائی مرثیہ فنکارانہ اختتام کے لحاظ سے

جوش کے آوازۂ حق اور جمیل مظہری کے "عرفان عشق" سے بہتر ہے اگرچہ بطور مجموعی "آل رضا کے معاصرین (مراد جوش اور جمیل مظہری سے ہے) کے ابتدائی نقوش ان کے مرثیہ سے بہتر قرار دئے جائیں گے۔

(جدید اردو مرثیہ ص ۲۰۲)

آل رضا کی عظمت اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ ان کے مرثیے تو درکنار ان کے چند بیت ہی ان کی بڑائی کا پرچم بلند رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

کہدو ہر امتحان سے تیار ہے حسینؑ
اس معرکے کا حیدرِؑ کرّار ہے حسینؑ

آواز دی ہے فاطمہ کے نور عین کو
انسانیت پکار رہی ہے حسینؑ کو

دل جگمگا دئے ہیں دماغوں کے ساتھ ساتھ
روشن کیا ہوا کو چراغوں کے ساتھ ساتھ

یا ان کا زبان زد عام شعر جو بقول آل رضا ان کی مرثیہ گوئی کا محرّک بنا۔

کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے
اور کبھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے

لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ چاہنے والوں کی محبّت خود ممدوح کو مجروح کر دیتی ہے جیسا کہ سیماب کے چاہنے والوں نے سیماب کو اقبال کے مدِمقابل لا کھڑا کیا اور سیماب کو نقصان پہنچایا یا احمد ندیم قاسمی کے چاہنے والوں نے انہیں اقبال اور پھر فیض سے ٹکرانے کی کوشش کی۔ راقم الحروف کی رائے میں جو ایک شخص کی ذاتی رائے ہے (کسی نقاد یا تنقید نگار کا لاحقہ رکھنے والی شخصیت کی رائے نہیں) آل رضا کا جوش یا جمیل مظہری سے تصادم سید آل رضا کی خدمت نہیں ہے۔ سید آل رضا خود جوش، جمیل مظہری، نجم آفندی کی جو عزّت و تکریم کرتے تھے وہ اُن کے استاد آرزو لکھنوی سے کم نہیں بلکہ بسا اوقات زیادہ ہی نظر آتی تھی۔ چاند اس وقت تک چاند ہے جب تک سورج کے مقابل نہ آجائے۔ آل رضا جوش اور جمیل مظہری کے کلام سے اس کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مگر میں صرف ایک ایک بیت پر اکتفا کروں گا۔ سید آل رضا کا ایک خوبصورت شعر دیکھئے۔

شہید جس نے کہ یہ یادگار چھوڑی ہے
لہو کی دھار سے خنجر کی دھار موڑی ہے

اب ذرا جوشؔ کو ملاحظہ کیجئے۔

لی سانس جس نے رشتۂ شاہی کو توڑ کر
جس نے کلائی موت کی رکھ دی مروڑ کر

پروفیسر رضا کاظمی نے لہو کی دھار اور خنجر کی دھار کے التزام کو جوش کی بیت پر " ایک گونہ سبقت " قرار دیا ہے جو بحث کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہے لیکن پھر کبھی سہی۔ اس موضوع پر کبھی گفتگو ہوئی تو پروفیسر محمد رضا کاظمی کی اجازت کے ساتھ ہوگی کہ میں ان کے تجرِ علمی اور مرثیہ پر ان کے گہرے مطالعہ کو دل سے تسلیم کرتا ہوں اس وقت تو بات جدید مرثیے کی ہو رہی ہے، جس کے تحت یہ سوال پیدا ہوتا ہے سید آل رضا کا اسم گرامی " جدید مرثیہ گو " شعراء میں شامل ہے کہ نہیں، اس کا تعین کرنے سے پہلے تو یہ طے کرنا پڑے گا کہ جدید مرثیہ ہے کیا؟ جوش کو تو اہل نقد و نظر نے " مسدّس " کے خانے میں ڈال دیا۔ یہ فیصلہ نصف صدی قبل کا ہی نہیں آج بھی علامہ طالب جوہری ایسے بے مثال عالم دین اور باکمال شاعر کہتے ہیں۔

دنیائے شعریت ہے مسدّس میں کیا نہیں
وہ اصطلاحِ فن میں مگر مرثیہ نہیں

گویا اصطلاح فن کوئی ایسے شئے ہے جس میں ترقی کا امکان نہیں۔ ترقی پذیر شعور کو یہ حق نہیں کہ وہ فن کی جہتوں میں تجربوں اور مشاہدوں کو شامل کرے تو پھر ولیؔ دکنی سے فیضؔ تک غزل میں جو تبدیلیاں آئیں انہیں کیوں تسلیم کیا گیا۔ مرثیوں کی نہج کو چار مصرعوں سے چھ مصرعوں پر تو سوداؔ نے قائم کیا تھا، قلی قطب شاہ سے انیسؔ و دبیرؔ تک مرثیے میں جو ارتقاء ہوا اسے بھی مان لیا گیا لیکن جونہی مرثیہ میں وقت کی ضرورت کے تحت تبدیلیاں لائی گئیں تو انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ سوداؔ کا تجویز کردہ نسخہ اگر کیمیا ہے تو کیا سوداؔ سے انیس و دبیر تک مرثیہ میں کچھ اضافہ نہیں ہوا؟

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جدید مرثیے کو مسدّس کہہ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مسدّس مرثیہ کے برعکس کوئی اور صنف شاعری ہے۔ آج تک کسی دانشور نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ مسدّس تو ایک FORM کا نام ہے شاعری کی ایک ہیئت کا نام ہے جس میں سوداؔ کے بعد سے مرثیہ کہا جا رہا ہے۔ مسدّس میں قصیدہ بھی ہو سکتا ہے، مرثیہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے۔ مسدّس میں ہجویہ شاعری بھی ہو سکتی ہے اور اخلاقی، سماجی، سیاسی نظمیں بھی۔ کیا انیس کے مرثیے مسدّس میں نہیں؟ کیا مرزا دبیر اور دیگر

اساتذہ کے مرثیے مسدّس نہیں ہیں شاعری کی کوئی اور ہیئت ہیں، کیا کسی بھی مرثیے کو مخمس کہا جا سکتا ہے مرثیے کو واقعات کربلا سے متعلق کر دینے کے بعد مسدّس میں ذکرِ شہدائے کربلا ہو تو اسے مرثیہ کہنے میں کیا امر مانع ہے سوائے اس کہ ارتقاء سے اجتناب ہو۔ ان سطور کے ذریعے میں اہل فکر و نظر کے سامنے ایک سوال اٹھا رہا ہوں کہ قلی قطب شاہ کے مرثیے جو غزل کی (FORM) ہیئت میں ہیں انہیں مرثیہ تسلیم کر لیا گیا۔ مربع کی شکل اور ہیئت ہیں جو مرثیے کہے گئے انہیں مرثیہ مان لیا گیا۔ پھر سوؔدا نے مسدّس کو بنیاد بنایا تو مسدّس کی ہیئت میں کہے جانے والے سارے مرثیوں کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ سوائے جوشؔ کے جبکہ جوشؔ کے مرثیوں میں رثا کے پہلو کو بھی فراموش نہیں کیا گیا بلکہ رثا میں ایک وقار اور عظمت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ میری گزارش یہی ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اور یہ سب کچھ کب تک ہوتا رہے گا۔ جوش کا یہی تو قصور ہے کہ عام مرثیوں میں واقعہ کربلا کو نظم کیا گیا ہے جب کہ جوشؔ نے واقعات کربلا کے ساتھ مقصد کربلا کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ کیا حسینؑ کی قربانی کا بیان مقصدِ قربانی بتائے بغیر ہی کافی ہے۔ اگر اس قربانی اور اس کے مقاصد کو مشعلِ راہ بنانا کوئی غیر مستحسن بات ہے تو پھر یقیناً جوش ہر سزا کے مستحق ہیں۔

جدید مرثیہ کے ضمن میں جس طرح ماضی کے حوالے سے جوش، جمیلؔ مظہری، شادؔ عظیم آبادی، دلو رام کوثری، نجم آفندی، آغا سکندر مہدی کا ذکر ناگزیر ہوتا ہے اسی طرح آج کے تناظر میں پاکستان کے ڈاکٹر صفدر، شاہدؔ نقوی، صفدر ہمدانی، قیصرؔ بارہوی، ڈاکٹر ہلالؔ نقوی و غیرہم کے نام سامنے آتے ہیں۔ ہندوستان سے ایک اہم نام ایسا ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ ہیں ڈاکٹر وحیدؔ اختر جو مفکر، دانشور، نقاد، ادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مرثیہ گو ہیں۔ ان کے مرثیوں کا مجموعہ "کربلا تا کربلا" ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کی پیش گفتار میں ڈاکٹر وحید اختر کہیں محقق و دانشور اور کہیں شاعر نظر آتے ہیں۔ ذیل کا اقتباس دیکھئے۔

> "جس طرح ہر شاعر کا تجربہ کسی خاص روش یا سانچے کا پابند نہیں ہوتا اس طرح اس کا اظہار بھی بندھے ٹکے ضابطوں میں محصور و محدود نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مرثیے کو جدید شاعری سے الگ سمجھنا یا مسدّس کے فارم (FORM) کو فرسودہ و از کار رفتہ کہنا کسی بھی شعری شریعت کے مطابق جائز نہیں۔ (ص ۱۶)"۔

یہ ہے ایک مفکر اور دانشور کی بات جو لکیر کا فقیر نہ رہ کر، وقت کے بدلتے دھاروں کے تقاضوں کا مشاہدہ کر کے انہیں جدید فکر کے سانچوں میں ڈھال کر نئے ڈھنگ اور نئے اسلوب سے پیش کرنے کا قائل نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر کی یہ رائے مرثیے کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ پوری شاعری کا احاطہ کرتی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں جب

اُن کی کتاب " پتھروں کا مغنی " شائع ہوئی تو اس کے پیش لفظ میں بھی انہوں نے یہی بات کہی تھی ۔

ان ارباب نقد و نظر کے مقابلے میں جو خود مرثیہ گو تو کیا شاعر بھی نہیں ہیں لیکن مرثیہ کے محرکات ، اسلوب ، ہیئت ، مواد اور بالخصوص مشاہدے کے اس کرب پر تبصرہ کرتے ہیں جس سے شاعر گزرتا ہے ۔ ڈاکٹر وحید اختر کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ وہ مسلّمہ دانشور ، ادیب اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ نہ صرف بڑے شاعر بلکہ بڑے مرثیہ گو بھی ہیں ۔ سید آل رضا اور نسیم امروہوی کے متعلق ان کی رائے ہے کہ ۔

" نسیم امروہوی کے مرثیے اپنے نئے پن کے ساتھ مرثیے کی لکھنوی روایت سے زیادہ قریب رہے ۔ آل رضا کے دو مشہور مرثیے " کربلا سے پہلے " اور " کربلا کے بعد " اردو مرثیے کی جامع تعریف پر پورے نہیں اترتے ۔ "

(کربلا تا کربلا ص ۱۷)

" پتھروں کا مغنی " (اشاعت ۱۹۶۶ء) سے لے کر کربلا تا کربلا (اشاعت ۱۹۹۱ء) تک گویا ربع صدی کے ادبی سفر کے دوران ڈاکٹر وحید اختر " کسی مخصوص اسلوبِ اظہار ، ہیئت ، خاص قسم کی زبان یا محاوروں کی پابندی کے خلاف بولتے چلے آئے ہیں اور بندھے ٹکے ضابطوں میں اظہار کو محصور و محدود کرنے کو رَد کرتے رہے ہیں لیکن مرثیے کے لغوی معنی اور رثائی شاعری کی بات آتی ہے تو نہ جانے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ لغوی معنی میں کوئی اصلاح یا وسعت پسند نہیں کرتے مثلاً مذکورہ تحریر میں ہی وہ کہتے ہیں ۔

" مرثیہ اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے اگر رثا کا مقصد پورا نہیں کرتا اور محض چند واقعات کا بیان یا انقلابی نعرے تک محدود رہتا ہے تو اسے مشکل سے مرثیہ کہا جا سکتا ہے ۔ اس لحاظ سے میں جوش یا نجم کے مرثیوں کو مرثیہ نہیں کہتا ۔ "

(ص ۔ ۱۷)

ہر تحقیق بنیادی طور پر جمود کو توڑتی ہے اور ایک نئی تحقیق کی راہیں کھولتی ہے ۔ پس یہیں پر دخل در معقولات کی معذرت چاہتے ہوئے ڈاکٹر وحید اختر سے معاف کیجئے (EXCUSE ME SIR) کہہ کر بصد ادب کچھ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے ۔

پہلی بات تو یہ کہ اردو مرثیہ کربلا اور کربلا والوں کے احوال کے لئے مختص ہو گیا ہے لیکن اردو کے کسی ایک مرثیہ میں کربلا کے سارے واقعات کو نظم نہیں کیا جاتا بلکہ مختلف واقعات پر مرثیئے ملتے ہیں ۔ مثلاً علی اکبر کی شہادت ، حضرت عباس کی شہادت ، عون و محمد کی شہادت ، حر کی شہادت ، جب ایک مرثیے میں پورے واقعات نظم نہیں کیے جا سکتے تو پھر یہ بیان یقیناً وضاحت کا متقاضی ہے کہ " محض چند واقعات کے

بیان کو مرثیہ نہیں کہا جا سکتا"۔

دوسری بات کہ "انقلابی نعرے کو یقیناً مرثیہ نہیں کہہ سکتے" بسر و چشم قبول ہے اس لئے کہ نعرہ بازی کسی قسم کی ہو شاعری نہیں کہلاتی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرثیے میں انقلابی باتیں نہیں ہو سکتیں؟ کیا خود کربلا اور کربلا کی ساری قربانیوں کا مقصد شہنشاہیت، جبر و تشدّد، انسانی اقدار کی پائمالی، شریعت میں تبدیلی اور یزید کی مطلق العنانی کے خلاف انقلاب لانا نہیں تھا؟ اور اگر تھا تو مرثیے میں انقلاب کی بات کرنا تو سنتِ حسینؑ ہوئی، کربلا والوں کی تقلید ہوئی۔ ڈاکٹر وحید اختر تک یہ گذارش پہنچانی اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ وہ فکر کی منزلوں پر سنتِ حسینؑ پر بھی کاربند ہیں اور کربلا والوں کے مقلّد بھی ہیں۔

اب رہی رثا کی بات، تو ڈاکٹر وحید اختر ایسے وسیع النظر دانشور کے حوالے سے یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ رثا کا مقصد قدیم مرثیے کے فریم میں گھسی پٹی لفظیات کی تصویر نصب کرنا ہے یا مروجہ بندھے ٹکے ضابطوں کا جو (بقول انہیں کے، اظہار کو محصور و محدود کرتے ہیں) لکیر کے فقیر کی طرح پابند رہنا ہے۔ وہ تو خود ان قیود سے باہر نکل کر مشاہدے اور نئے تجربات کی بات کرتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر وحید اختر مرثیہ کو صرف رونے تک محدود نہیں سمجھتے ہوں گے۔ مرثیہ کو رثا کے لغوی معنی یعنی میت پر رونا تک محدود کر دیا جائے تو مرثیہ نگار بین کے علاوہ کوئی چیز قلم بند نہیں کر سکتا حتیٰ کہ رلانا بھی لغوی معنی کی حدود سے باہر کی بات ہو جاتی ہے۔ البتہ اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ مرثیہ رثا سے بالکل اجتناب یا قطع تعلق نہیں کر سکتا ورنہ مرثیہ نہیں رہے گا۔

ڈاکٹر وحید اختر، جوشؔ اور نجمؔ کے مرثیوں کو مرثیہ نہیں سمجھتے۔ یہ ایک دانشور کی رائے ہیں جس کا احترام ضروری ہے لیکن اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس بات پر ان کا شکریہ ادا کرنا لازمی ہے کہ انہوں نے جوشؔ اور نجمؔ کی مرثیوں کو مرثیہ کہا ہے مسدّس نہیں یہ اور بات ہے کہ وہ انہیں تسلیم نہیں کرتے وہ یقیناً جانتے ہیں کہ مسدّس کہنا مرثیہ کی نفی نہیں۔

جدید مرثیے کے متعلق ڈاکٹر وحید اختر نے لکھا ہے۔

> "بہار کے شاعروں میں پہلے شادؔ عظیم آبادی اور پھر جمیلؔ مظہری نے مرثیے کو ایک نیا رنگ اور فکری آہنگ دینے کی کامیاب کوششیں کیں، ان کی تقلید نہیں ہوئی لیکن جدید مرثیہ بحیثیت مجموعی جوشؔ کے اثر سے باہر نہیں آسکا۔ یہی جدید مرثیے کا بڑا نقص ہے۔" (ص۔ ۱۷)

جدید مرثیے کے ضمن میں اور بالخصوص جوشؔ کے حوالے سے یہ تو بار بار سنا گیا کہ جوشؔ کے مراثی

مسدّس کے زمرے میں آتے ہیں مرثیہ کی حدود میں نہیں اور اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ وہ " مرثیے کے بندھے ٹکے ضابطوں میں محصور و محدود نہیں ہیں۔ " یہ وہ جرم تھا جس سے ڈاکٹر وحید اختر، جوش اور نجم کو ہی نہیں بلکہ ان تمام شعراء کو بری کر چکے ہیں جو ان بندھے ٹکے ضابطوں سے ہٹ کر جدّت طرازی کرتے ہیں۔ یہ بات پہلی بار ڈاکٹر وحید اختر نے کی ہے کہ جدید مرثیے کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ جوش کے اثر سے باہر نہیں آسکا۔ یہ فیصلہ بہ این سبب اور دلچسپ نظر آتا ہے کہ خود ڈاکٹر وحید اختر نے لکھا ہے کہ مرثیے کے اس حصار کو جو انیس و دبیر نے تعمیر کیا تھا جوش کے علاوہ کوئی نہیں توڑ سکا اور " حسینؑ اور انقلاب " کو جوش کا کارنامہ کہہ کر انہیں خراجِ تحسین بھی پیش کیا ہے۔ ان کی تحریر کا ایک اقتباس دیکھیے۔

> " چند فروعی ایجادات کے علاوہ مرثیہ انیس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان مرثیہ گویوں کی تقلید نے شعراء کی کوئی نئی راہ نکلنے اور جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ پیارے صاحب رشیدؔ ہوں یا دولہا صاحب عروجؔ، عارفؔ ہوں یا وحیدؔ اپنی قادر الکلامی کے باوجود سب مرثیے کے روایتی حصار سے باہر نہیں نکلے، اس حصار کو بیسویں صدی میں جوشؔ نے توڑا، شعلہ و شبنم میں ان کے چند مراثی اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسدّس کی پابندی کرتے ہوئے بھی شہادت کربلا کے موضوع پر نئے انداز سے شعر کہا جا سکتا ہے۔ حسینؑ اور انقلاب اس جہت میں جوش کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس روایت کو جمیلؔ مظہری، آل رضا، نسیمؔ امروہوی، رزمؔ رودلوی نجمؔ آفندی اور ناصرؔ زید پوری نے آگے بڑھایا لیکن ان میں سے کوئی بھی جدید مرثیے کو وہ معنویت نہ دے سکا جس کی طرح جوشؔ نے ڈالی تھی۔ "
>
> (ص ۱۶ / ۱۷)

صاحبو ان سطور کی روشنی میں جوش نے جدید مرثیے کو جو معنویت دی وہ علامہ جمیل مظہری، نجم آفندی، آل رضا، نسیم امروہوی بھی نہ دے سکے۔ اس کے باوجود اگر جوش جدید مرثیے کا اہم نقص قرار دئے جا سکتے ہیں تو یہ جوش کی بدقسمتی ہے یا اس ملّت کی جو لکیریں پیٹنے کی عادی ہے۔

میرے چمن کی خزاں مطمئن رہے کہ یہاں
خدا کے فضل سے اندیشۂ بہار نہیں

" کربلا تا کربلا " میں مرثیے کے ضمن میں ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وحید اختر میر انیس کو حجّت مانتے ہیں۔ جہاں تک انیس کی قادر الکلامی اور مرثیے کو بام عروج تک پہنچانے کا سوال ہے ان کی عظمت

سے انکار تو کسی نے بھی نہیں کیا، البتہ بات وہاں رُکتی ہے جہاں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ انیسؔ کے بعد مرثیے میں ارتقاء ممکن نہیں اور نہ ہی نئی جہتوں اور نئی اقدار کے در آنے کے امکانات ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر کی فکر اور نقطۂ نظر ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے جسے انہوں نے کبھی کسی جزدان نہیں چھپایا اسی لئے یہ ماننے میں ذرا سی ہچکچاہٹ ہوتی ہے کہ وہ انیسؔ کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ خود ڈاکٹر وحید اختر کے اپنے مرثیوں میں ارتقاء واضح ہے باوجودیکہ کہ وہ انیس کو جگہ جگہ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

"انیس نے اردو کی شعری زبان کو اس طرح وسعت دی کہ کوئی مسدس لکھنے والا اقبالؔ، چکبستؔ، جوشؔ یا نجمؔ یا موجودہ مرثیہ گو ان کے اثر سے نہیں نکل سکا۔ خود میرے مراثی میں آپ کو کہیں بہت واضح اور کہیں بالواسطہ طور پر بعض بندوں یا بیتوں میں انیس کی گونج سنائی دے گی، یہ بھی امکان ہے کہ بعض مصرعوں پر سرقے یا صحیح لفظوں میں توارد کا شبہہ ہو۔ دراصل انیس نے کربلا کے موضوع کو اپنا ہی نہیں لیا بلکہ مسدس پر بھی ہمیشہ کے لئے اپنی مہر ثبت کر دی۔"

(ص۔ ۱۸)

ایک بار پھر EXCUSE ME SIR ۔ بلاشبہہ انیسؔ۔ اقبالؔ اور جوشؔ صاحبِ طرز شعراء ہیں لیکن ان کی سب سے پہلی پہچان ان کی ڈکشن یعنی شعری زبان ہے ان کے فنی اور فکری محاسن تو بعد کی باتیں ہیں۔ سب سے پہلے ایک عام قاری چند اشعار پڑھتے ہی ان شعراء میں جو امتیاز کرتا ہے وہ ان کی شعری زبان کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دانشورانہ فکر کی بلندیوں پر اقبالؔ، چکبستؔ، جوشؔ اور نجمؔ شعری زبان کے حوالے سے انیس کے زیرِ اثر ہوں مگر ایک قاری کی نظر میں تو ان شعراء میں قدر ہائے مشترک صرف دو ہیں۔ ایک ان سب کی مرثیہ گوئی، دوسرے اردو میں مرثیہ گوئی۔

"کربلا تا کربلا" ایک ایسی کتاب ہے جس پر ایک اور کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر وحید اختر کی نظم و نثر کی کتاب ہے۔ وحید اختر کے آٹھ مرثیوں کے علاوہ پیش لفظ میں انہوں نے جو وضاحتیں کی ہیں وہ دلچسپ بھی ہیں اور اہم بھی۔ جدید مرثیے کے ضمن میں مختلف اوقات میں مختلف سوالات سامنے آتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر نے کچھ اہم سوالات کو نقل کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے۔ سوالات یہ ہیں۔

(۱) جدید دور میں اردو مرثیہ ایسی روایتی صنف کی کیا ضرورت ہے۔

(۲) کیا یہ صنف کسی حد تک ہمارے سیاسی، سماجی تقاضوں کے اظہار کا وسیلہ بن سکتی ہے؟

(۳) ایسا تاریخی واقعہ جو چودہ سو سال قبل رونما ہوا کس حد تک ہماری حسیّت اور شعور کے

لئے معنویت رکھتا ہے۔

(۴) ڈاکٹر عمیق حنفی کے حوالے سے ایک سوال یہ بھی اٹھایا گیا کہ انہوں نے (ڈاکٹر وحید اختر نے) جدید شاعری میں نام اور مقام پیدا کرنے کے بعد کلاسیکیت کی طرف کیوں رجوع کیا۔ (مراد مرثیہ گوئی سے ہے)

(۵) شمس الرحمان فاروقی نے "شب خون" میں سوال اٹھایا کہ مرثیے کے روایتی فارم میں نئے امکانات کو بروئے کار لانے کی کیا گنجائش ہے۔

ان سوالات کے جواب میں انہوں نے اپنے ہی ایک مرثیے کے چند بند نقل کئے ہیں۔

خامہ مرا حکمِ قلمِ حق سے جواں ہے
فیضِ نبی و ساقیٔ کوثر سے عیاں ہے
ہے اک اسی نسبت سے قلم میرا سرافراز — اسلوب کی جدّت میں کلاسیک کا یہ اعجاز
اظہارِ غمِ ذات ہے آفاق کی پرواز — ہے مرثیے میں آج کی نظموں کا سا انداز
ابلاغ کی ہر سطح پہ ترسیل ہے ممکن
اعجاز و علائم میں بھی تفصیل ہے ممکن

ہر تجربۂ زیست ہے بے ہیئت و اسلوب — احساس کو ہر طرح کے الفاظ ہیں مطلوب
مخصوص کوئی طرز نہیں فکر کو مرغوب — کیوں صنفِ سخن ہے کوئی خوب اور کوئی ناخوب
ہو پھوٹنا چشمے کو تو پتھر بھی نہیں سخت
پھر شعر پہ کیوں قافیے ہوں تنگ، زمیں سخت

قادر ہو قلم تو نہیں رکتا ہے کہیں بھی — یاقوت اگل دیتی ہے سنگلاخ زمیں بھی
دے اٹھتی ہے کو کھردرے لفظوں کی جبیں بھی — بن جاتی ہیں اصواف بد آہنگ حسیں بھی
لفظوں کی چٹانوں سے ابلتے ہیں معانی
اک بات کے سو رخ سے نکلتے ہیں معانی

ہے نثرِ کم آہنگ پہ جب شعر کا الزام — کیوں مرثیہ و مثنوی و ہجو سے ابرام
ناشاعروں کے تجربے کا شعر نہیں نام — تیشہ ہو تو ہر سنگ میں بے تاب ہیں اصنام
کہہ دے جو قلم "کُن" تو ہو عالم نیا پیدا
مٹی سے بھی کر لیتا ہے فن دیوتا پیدا

یہ بند مرثیے کے احیاء پر ہی نہیں بلکہ تمام شعری تجربوں پر بھی صادق آتے ہیں لیکن سوالات کیونکہ مرثیے کے حوالے سے کئے گئے تھے اس لئے مرثیے کی حدود میں رہ کر ہی جواب دینا ضروری تھا۔ یہ کام ڈاکٹر وحید اختر نے خوش اسلوبی سے کیا۔ ان کے علاوہ جوشؔ کے مراثی، نجمؔ کے مراثی، آغا سکندر مہدی کے مراثی اور آج کے دور میں پاکستان کے سارے لکھنے والوں کے مراثی ان سوالات کا عملی جواب ہیں۔

ڈاکٹر وحید اختر جب یہ اعتراف کرتے ہیں کہ

خامہ میرا حکمِ قلمِ حق سے جواں ہے — فیضِ نبی و ساقیٔ کوثر سے عیاں ہے
ہے اک اسی نسبت سے قلم میرا سرافراز — اسلوب کی جدّت میں کلاسیک کا اعجاز
اظہار غمِ ذات ہے آفاق کی پرواز
ہے مرثیے میں آج کی نظموں کا سا انداز

تو بیساختہ آغا سکندر مہدی کی طرف نگاہ اٹھتی ہے جو قلم اور مرثیے کے حوالے سے کہتے نظر آتے ہیں۔

ہے آج پھر قلمِ نکتہ رس وقارِ سخن — نسیمِ فکر کے جھونکوں میں ہے بہارِ سخن
اڑا ہے رخشِ تخیّل پہ شہسوارِ سخن — خراج لے گا زمانے سے تاجدارِ سخن
چلا ہے پرچمِ دینِ مُبیں اڑائے ہوئے
بصد ادب ہیں مضامین سر جھکائے ہوئے

درست کی ہے جو الفاظ نے صفِ تنظیم — محاورات بھی حاضر ہوئے پئے تعظیم
اشارے کر کے کنایے بھی ہو چکے ہیں مقیم — اور استعارے بھی موجود ہیں بہ قلبِ صمیم
دریچہ وا جو ہوا ہے کلامِ مجمل کا
کھلا ہے بابِ حقیقت مجازِ مرسل کا

ادھر قلم بھی بصد ناز و عز و جاہ چلا — اٹھا یہ شور کہ اقلیمِ فن کا شاہ چلا
برائے فکر و تجسّس، فلک نگاہ چلا — قدم قدم پہ جلاتا چراغِ راہ چلا
قلم کہ شاخِ ثمردار کا نمونہ ہے
جو نقش ہے خطِ گلزار کا نمونہ ہے

چمک رہا ہے جو قرطاس کا خطِ تقدیر — فرازِ عرش پہ لرزاں ہے حُسن بدرِ منیر
کھنچ گی عکسِ خیالات کی نئی تصویر — کہ آج سر پہ ہے پھر سایۂ جنابِ امیر

افق سے تابہ افق ہے فضائے ایمانی
علیؑ کی ذات ہے وجہ ضیائے ایمانی

ادھر قلم نے بھی دکھلائی خوب جولانی — ادق رہے نہ مضامین ، ہو گئے پانی
چمک رہی تھی جو نورِ ولا سے پیشانی — کچھ اور بڑھ گئی تقدیسِ مرثیہ خوانی

شعاعِ مہر کا دامن نچوڑ کر لایا
یہ آسمان سے تاروں کو توڑ کر لایا

ڈاکٹر ہلال نقوی نے جدید مرثیے کے عناصر اربعہ میں جوشؔ، علامہ جمیلؔ مظہری، نسیمؔ امروہوی اور سید آل رضا کو شامل کیا ہے۔ ہر نقاد کی اپنی نظر اور اپنی رائے ہوتی ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر ہلال نقوی کو کسی ذاتی فیصلے پر موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا لیکن قاری کو یہ تو حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی رویّے کا تجزیہ کر سکے، کسی فیصلے کی وجوہات جان سکے، اور پھر ڈاکٹر ہلال نقوی نے ساری گفتگو، ساری تحقیق، ساری چھان بین جدید مرثیہ کے حوالے سے کی ہے جس سے ایک بار پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "جدید مرثیہ" سے ان کی کیا مراد ہے؟ کیا دورِ جدید میں میرؔ کی ڈکشن میں غزل کہنے کو جدید غزل یا ترقی پسند غزل کہا جا سکتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ میرؔ اپنے عہد کے اعتبار سے بہت ترقی پسند تھے، ان کے بعض اشعار آج بھی تروتازہ ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آج کے تناظر میں کہے گئے ہیں۔ ظلم سے نفرت انسانی جبلّت میں شامل ہے، مطلق العنانی ہمیشہ سے کمزوروں اور مظلوموں کو کھلتی رہی ہے اور حسّاس دلوں نے ہمیشہ اس جبر سے نفرت کی ہے۔ میرؔ کے ہاں بھی یہ سارے جذبے موجود ہیں جن کا اظہار انہوں نے اپنے آہنگ اور اپنے اسلوب میں کیا ہے، جو آج بھی بے مثال و لازوال ہے لیکن ان کی پہچان آج بھی ایسے اشعار سے ہوتی ہے۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

میر کی عظمت تو فن اور ادب کے پرچم کی اس بلندی سے ہے جو انہوں نے سربلند کیا تھا، اس دور کے اساتذہ اور شعراء کرام کے سامنے جلیانوالہ باغ میں ہونے والی بربریّت نہیں تھی، کوئی ٹیپو شہید نہیں کیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد چُن چُن کر حریّت پسندوں کو ہتہِ تیغ نہیں کیا جا رہا تھا، امن کے نام پر پوری دنیا کی چودھراہٹ کسی ایک ملک کے قبضہ میں نہیں تھی، ان کے سامنے فرد کی خواہشات تھیں، بشری

جذبے تھے، اسی لئے وہ کہہ سکتے تھے۔

رکھ کے منہ سو گئے ہم آتشیں رخساروں پر
دل کو تھا چین تو نیند آ گئی انگاروں پر

میر جیسا حساس شاعر، بالغ نظر شاعر، لفظیات پر قدرت رکھنے والا شاعر حتیٰ کہ داغ ایسا جذباتی اور حسن و عشق کا شاعر بھی آج کے دور میں آتشیں رخساروں پر منہ رکھ کر نہیں سو سکتا تھا۔

جدّت کسی ایک عہد کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ ہر عہد کا شاعر اور ادیب جدّت پسند ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اس عہد کے مشاہدات کے کرب سے گزرے اور ان کا اظہار کرے۔ میرؔ و غالبؔ اپنے عہد کے جدید شاعر تھے لیکن اگر ان کے اسلوب، ان کے تراشی ہوئی قدروں کو حروفِ آخر سمجھ کر انہیں سے وابستگی کر لی جائے تو ترقی کا عمل رک جاتا ہے۔ سوداؔ نے مرثیہ کی ایک نہج مقرر کی۔ یہ اس وقت کی جدّت تھی پھر مرثیہ انیس و دبیر تک پہنچا، اپنے عہد کی فضا، سیاسی حالات اور مروّجہ روایات کے حصار میں رہتے ہوئے ان بزرگوں نے مرثیے کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ پھر آزادی کی ہوا چلی، موسم بدلا۔ اس بدلتی رت میں جوشؔ نے ایک طرح ڈالی۔ جمیل مظہری، نجم آفندی، وغیرہم نے اس بدلتی رت کا احاطہ کیا۔ آل رضا نے اپنی سی کوشش کی اور یہ چراغ سکندر مہدی تک پہنچا اور پھر قیصر بارہوی، شاہد نقوی، صفدر ہمدانی، ہلال نقوی، گویا چراغوں کی ایک قطار بن گئی۔

ڈاکٹر ہلالؔ نقوی بذات خود حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے قریب رہے ہیں۔ جدید مرثیے کے چار عناصر اربعہ قائم کرتے وقت یقیناً ان کے پیش نظر جوشؔ کا یہ قول بھی رہا ہو گا۔

"جو مرثیہ تاسّی حسینؑ پر ابھارے وہ جدید ہے اور جو تاسّی حسینؑ پر نہ اُبھارے خواہ وہ اس جدید دور میں ہی لکھا گیا ہو۔ قدیم مرثیہ ہے"

جدّت دو طرح کی ہو سکتی ہے، ایک تو یہ کہ قدیم کپڑے کو نئے ڈیزائن کی تراش خراش سے تیار کیا جائے اور دوسرے یہ کہ عہد حاضر کے بنے ہوئے کپڑے سے خم پیچ کا انگرکھا تیار کیا جائے یعنی قدیم وضع کے لباس کو ترک نہ کیا جائے خواہ وہ جدید فکر کے کپڑے سے تیار ہو۔ میں روایت کے کپڑے کو نئی تراش دے کر جدید ڈیزائن کا ملبوس تیار کرنے کا قائل ہوں اسی لئے میں ڈاکٹر ہلال نقوی کے عناصر اربعہ کی ترتیب سے یہ جانتے ہوئے بھی اختلاف کر رہا ہوں کہ عالی مرتبت شعراء کی درجہ بندی کرنا آسان کام نہیں اردو ادب میں جب بھی کسی نے شعر و سخن کی کہکشاں سے کچھ ستارے چننے چاہے اسے خود تارے نظر آگئے۔ آب حیات سے لے کر "اردو کے دس بڑے شاعر" مرتبہ حشمت جہاں ناز تک، ہر جگہ اعتراضات کی گھما گھمی نظر آتی ہے۔ آغا سکندر

ہدی مرحوم کی بہن حشمت جہاں ناز نے جب یہ کتاب مرتب کی تو اپنی دشواریوں کے تذکرے کے ساتھ نسخہ انتخاب بھی درج کیا ہے جو ایک خوبصورت ادبی تحریر ہے، ہو سکتا ہے یہ نسخہ ڈاکٹر ہلال نقوی اور راقم الحروف کی دشواری کا علاج ہو، حشمت جہاں ناز لکھتی ہیں ۔

"ولی دکنی سے جوش ملیح آبادی تک پہنچتے پہنچتے اردو شاعری نے بیشمار کروٹیں لیں، سینکڑوں انقلابات دیکھے، ان گنت رنگ بدلے، .... اب جبکہ اردو اپنی تمام رعنائیوں سمیت اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں ہر طرف اسی کا پرچم لہرا رہا ہے، شاہراہِ اردو بے شمار ستاروں سے رشکِ کہکشاں بن چکی ہے ۔ کیسے ممکن ہے کہ اس کہکشاں سے چند تارے توڑ لوں ۔ اس لالہ زار سے کچھ دہکتے ہوئے پھولوں کو چن لوں اور اس شاعری کی وسیع بساط اور بھری محفل سے دس عظیم شعراء کا انتخاب کر لوں ۔ میر کی طرف دیکھتی ہوں تو سودا روٹھ جاتے ہیں، غالب کی طرف نظر اٹھاتی ہوں تو ذوق منہ پھیر لیتے ہیں ۔ انیس کی طرف قدم بڑھاتی ہوں تو دبیر کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں ۔ میر حسن کا خیال آتا ہے تو دیا شنکر نسیم کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں ۔ نظیر اکبر آبادی کی طرف اشارہ کرتی ہوں تو مصحفی سے ڈر لگتا ہے، آتش کی طرف ہاتھ بڑھتا ہے تو ناسخ کی زبان سے خوف آتا ہے ۔ حالی کی تعریف کرتی ہوں تو اکبر کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے ۔ اقبال کے قدم چھونا چاہتی ہوں تو قدیم شعراء منہ بناتے ہیں جوش کی مدح کرتی ہوں تو حفیظ برہم ہو جاتے ہیں ۔

پھر اچانک میرے ذہن میں محمد حسین آزاد کا تخیل ابھرتا ہے، شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دروازے کھلے نظر آتے ہیں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ نقیب و چوبدار کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں، باادب باملاحظہ ہوشیار ۔ شاعروں اور نقادوں کے جلو میں میر تقی میر اور مرزا نوشہ غالب اپنے اپنے سر فخر سے بلند کئے غزل گو شعراء کی صف سے نکل کر خراماں خراماں دربار میں داخل ہوتے ہیں اور ان زرنگار کرسیوں پر جلوہ افروز ہوتے ہیں جو تاجدارانِ ادب کے لئے مخصوص تھیں ۔ پھر آواز آتی ہے ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوان غالب، پھر میر حسن پریوں کے غول ساتھ لئے آتے ہیں اور ایک انداز سے دربار میں داخل ہوتے ہیں، میر انیس انہیں کے قدم بہ قدم واہ واہ مرحبا کے شور میں تشریف لائے ۔ لوگ مرثیوں کی جلدیں چومتے اور آنکھوں سے لگاتے ہیں، سودا کی ملک الشعرائی سے کسی کو انکار نہ تھا لوگوں نے سر آنکھوں پر جگہ دی ۔

اچانک ایک شور ہوا، نظیؔر اکبرآبادی عوام کا غول چیرتے ہوئے بے پرواہی سے آگے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ نقادانِ فن نے ان کو جدید شعراء کی صف میں پہلی کرسی دی، اکبؔر طنز و تعریض سے کلیجہ چھلنی کرتے اور مسکراہٹ کے تیر چلاتے آئے اور ایک کرسی پر براجمان ہو گئے، دوسرے دروازے پر نقارے بجنے شروع ہو گئے۔ حالؔی، اقبالؔ، جوؔش عظمت و شہرت کے پھریرے اڑاتے بڑے کروفر سے آئے اور نشستوں پر بیٹھ گئے جو غالؔب و انیؔس کے مدمقابل رکھی تھیں۔

تصورات کا سلسلہ ٹوٹ گیا، دربار آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ محمد حسین آزاد رہنمائی کر کے تخیّل سے روپوش ہو گئے اور میں نے سمجھ لیا کہ یہی درست ہے۔ میر و غالب اردو غزل کے بادشاہ ہیں۔ سوؔدا نے قصیدہ نگاری کی دنیا میں اپنے نام کے ڈنکے بجا دئے۔ میر حسؔن نے مثنوی گوئی کا سکہ بٹھایا، میر انیؔس میدان مرثیہ گوئی کے شاہسوار ہیں۔ نظیؔر اکبر آبادی جدید شعراء کے رہبر، اکبؔر، حالؔی اور اقبالؔ قومی شاعری کے نغمہ گر، جوؔش جدید و قدیم روایات کا حسین سنگم اور ان سب رنگوں کو سمیٹ کر میں نے اس کتاب کے صفحوں پر رنگینیاں لکھ دیں۔"

میں ہلال نقوی کی دشواریوں کو سمجھتا ہوں، پھر مرثیے کے ضمن میں انہیں یا مجھے کوئی محمد حسین آزاد بھی نظر نہیں آتا، لہذا ساری بنیاد مراثی کے مطالعہ پر ہے۔ہلال نقوی نے چار عناصر اربعہ قائم کئے ..... میری رائے میں اگر یہ عناصر چار ہی ہو سکتے ہیں اور یہ عدد حرف آخر ہے تو پھر یہ ترتیب یوں ہو گی۔

جوش ملیح آبادی، علامہ جمیل مظہری، نجم آفندی، سکندر مہدی

سید آل رضا اپنے سارے کمالات کے باوجود صاحب طرز مرثیہ گو نہیں کہلا سکتے جیسا کہ عرض کیا گیا ان کے ہاں قوس و قزح کے رنگ تھے لیکن اگر ذرا وسعت قلب سے بات کی جائے اور فکر و فن کے قافلے کو کربلائے محدود نظری میں گھیر کر ہتہ تیغ نہ کیا جائے تو مرثیہ کے پانچ ارکان سامنے آتے ہیں۔

جوش، جمیل مظہری، نجم آفندی، آل رضا، سکندر مہدی

یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ سید آل رضا کا نام نامی اس فہرست میں درج کرتے وقت تذبذب کے جو ہلکے ہلکے سائے لہرا رہے ہیں وہ سکندر مہدی کا نام لکھتے وقت ذہن میں نہیں ابھرتے۔ یہ بات کسی دقیق بحث کی متقاضی اس لئے نہیں کہ ہم اس وقت قاری کی حیثیت سے جائزہ لے رہے ہیں۔ پھر بھی ٹی ہاؤس کی بحث ہو تو بقول صفدر ہمدانی کسی بھی بحث میں شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے تین الفاظ استعمال کر کے چار گھنٹے

بحث کی جا سکتی ہے مگر جب بات لکھنے کی آتی ہے تو کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے دلائل پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔

ہلال نقوی کے عناصر اربعہ میں سے حضرت نسیم امروہوی کو وہ خود "ہمارے عہد کی کلاسیکی روایت کا آخری شاعر" کہہ کر اس زُمرے سے نکال چکے ہیں۔ اس فیصلے کے بعد ان کا نامِ نامی جدید مرثیہ گو شاعروں میں شامل رکھنا اخلاق و مروت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے لیکن سکندر مہدی کی بات آتی ہے تو مضبوط دلائل ان کی حمایت کے لئے کمربستہ نظر آتے ہیں۔ سکندر مہدی نے صرف یہی نہیں کیا کہ مرثیے کے عناصر میں تبدیلی کی اور توحید، نبوت، امامت اور شہادت کو مرثیے کی اساس بنایا بلکہ انہوں نے وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے۔ سکندر مہدی نے جوہری عہد ATOMIC AGE کی باتیں کی ہیں۔ سائنسی اقدار کو نظم کیا ہے۔ خلا تک نظر کی ہے۔

مجلس میں ذکرِ عظمتِ نوعِ بشر ہے آج　　پیشِ نگاہ حُسنِ طلوعِ سحر ہے آج
انساں کی زد میں گردشِ شمس و قمر ہے آج　　تسخیرِ کائنات پہ سب کی نظر ہے آج
انساں پہنچ گیا ہے جو ماہِ مُبین پر
رکھتا نہیں ہے فخر سے پاؤں زمین پر

اس کے نگار خانے کی زینت گلوں کے ہار　　گلدستہ اس کے ہاتھ میں سرمایۂ بہار
خونِ جگر سے کر دیا صحرا کو لالہ زار　　جکڑے ہوئے ہیں پنجۂ آہن میں کوہسار
سنگِ گراں تراش کے ہیرا بنا دیا
اس نے جواہرات کا سرمہ بنا دیا

ہے دوربیں نگاہ، جو شیشہ بنا دیا　　پردہ پڑا تھا آنکھ پہ اس کو اٹھا دیا
لا کر قریب دُور کا جلوہ دکھا دیا　　میلوں کا فرق اس نے گزوں میں گھٹا دیا
واقف ہے اس کی آنکھ سپید و سیاہ سے
اوجھل رہا نہ کوئی بھی اس کی نگاہ سے

پتھر کو آب دے کے اسے لال کر دیا　　سونے کو آنچ دے کے زر و مال کر دیا
لوہا گلا کے آتشِ سیال کر دیا　　تقسیم وقت کر کے مہ و سال کر دیا
واقف ہے مہر و مہ کے عروج و زوال کا
رکھتا ہے یہ حساب ستاروں کی چال کا

مصروف تجربات میں انساں ہے صبح و شام　　تھامے ہوئے ہے ابلقِ ایّام کی لگام
لیتا ہے یہ عناصرِ قدرت سے اپنا کام　　بجلی کنیز اس کی ہے ، آبِ رواں غلام

دریا شکست کھا گئے مُشتِ غبار سے
کھینچی ہے اس نے برق کی رو آبشار سے

تاروں کا جال اس نے جہاں میں بچھا دیا　　تاریکیوں میں نور کا دریا بہا دیا
سویا ہوا تھا شب کا مقدّر ، جگا دیا　　گھر بیٹھے سب کو طُور کا جلوہ دکھا دیا

باندھا شعاعِ برق کو باریک بال سے
شیشے میں اس پری کو اُتارا کمال سے

واقف ہوا جہاں کے نشیب و فراز سے　　نغمے سمیٹتا ہے لبِ نَے نواز سے
فردوسِ گوش پا گیا تاروں کے ساز سے　　مسحور غزنوی ہے زبانِ ایاز سے

نغمے اُبل رہے ہیں چمکتے نشان سے
گھر بیٹھے آ رہی ہے صدا آسمان سے

دوشِ ہوا پہ صوت کی موجوں کو جا لیا　　چشم زدن میں عکس کی لہروں کو پا لیا
دستِ عمل سے تختِ سلیماں بنا لیا　　اوجِ فضا پہ جابجا قبضہ جما لیا

حیراں ملک ہیں آدمِ خاکی کی شان پر
اس کے چراغ جلنے لگے آسمان پر

پیدا کیا ہے توڑ کے ذرّے کو آفتاب　　روزِ ازل سے جس میں حرارت تھی محوِ خواب
ہر لحظہ انکشاف ہے ہر لمحہ انقلاب　　کُھلتا ہے روز ایک نیا زندگی کا باب

دل کا بدلنا ، رازِ حیات و ممات ہے
مردے جلا رہا ہے مسیحا صفات ہے

شاہد ہیں اس کے جہدِ مسلسل کے مہر و ماہ　　دستِ عمل سے اس کے برابر ہیں کوہ و کاہ
پُر ہے نوادرات سے اس کی تجربہ گاہ　　ہاتھوں میں ہے کلیدِ درِ جنتِ نگاہ

جنبش جو دی تو برق سی پردے پہ چھا گئی
بلقیسِ وقت قیدِ سلیماں میں آ گئی

ان اشعار میں قلب کی پیوند کاری سے لے کر سائنسی ایجادات ، خلاء کا سفر اور تسخیرِ ماہ تک کو نظم کیا گیا ہے مگر

نہ صرف، شعریت اور حُسنِ شاعری پوری طرح برقرار رہا بلکہ استعاروں اور تلمیحات کا استعمال بھی فنکارانہ ہے

آغا سکندر مہدی نے مرثیے کے جو حدود قائم کیئے ان کے اظہار میں بھی جدید انداز کو برقرار رکھا۔ توحید، عدل، نبوت، امامت اور شہادت کے عنوانات پر آغا نے جدید فکر سے سوچا اور جدید اسلوب کی بات کی ہے۔

توحید:

اوّل سے وہ اوّل ہے، وہ واحد ہے اَحد ہے   آخر سے بھی آخر ہے وہ قائم ہے صَمد ہے
افضل سے بھی افضل ہے وہ بالائے خرد ہے   ناقابلِ تقسیم ہے وہ ایسا عدد ہے
محدود ہے یہ ذہنِ رسا پا نہیں سکتا
انساں کے تصوّر میں خدا آ نہیں سکتا

نبوت:

عقیدت و محبت کی اس فضا میں جہاں نعت کا محور یا تو مدینہ کی گلیاں ہیں یا پھر حضورؐ کا رخِ پُرنور، آپؐ کی مشکبار زلفیں، سرمگیں آنکھیں، لب ہائے مبارک موضوعِ اظہارِ عقیدت ہے وہاں سکندر مہدی اس نُورِ اوّل، صبحِ اوّل، خِلقِ اوّل، خُلقِ اوّل، رحمۃ اللعالمین کو ان کی لامتناہی عظمتوں کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔

آپ کی ذات پہ ایماں ہے خدا پہ ایماں   نطقِ سرکارِ دو عالم ہے حدیث و قرآں
منکرِ ذاتِ محمدؐ ہے وہ کافر، ناداں   جس کی قسمت میں ہے محرومیٔ فیضِ یزداں
ڈھونڈتا نور ہے جو فکر کی باریکی میں
مثلِ ابلیس بھٹکتا ہے وہ تاریکی میں

جیسا کہ میں کئی بار عرض کر چکا ہوں ہر مسلمان کو دعویٔ عشقِ رسولؐ ہے اور عشق کی منازل بقدر پیمانۂ تصرّف مختلف ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر نعت گو شعراء کرام حضورؐ کے سراپا کے اظہار تک محدود رہتے ہیں۔ آغا سکندر مہدی نے اپنی عقیدتوں کے چراغ زیادہ تر نہج البلاغہ کے پُرنور کلام سے جلائے ہیں۔، اسی لئے عشقِ رسولؐ پر ان کی فکر دیکھئے۔

عشقِ رسولؐ ، حق کی لگن ، حُسنِ کوہِ طور　　عشقِ رسولؐ جامِ ولا ، دائمی سرور
عشقِ رسولؐ ، صبحِ یقین ، زندگی کا نُور　　عشقِ رسولؐ ، فکر کی ضو ، عظمتِ شعور

ترویجِ دینِ حق ابو طالب کا نام ہے
عشقِ رسولؐ میں سرِفہرست نام ہے

عشقِ رسولؐ کو صبحِ یقیں ، فکر کی ضو ، زندگی کا نور ، دائمی سرور اور عظمتِ شعور جدید فکر کا علمدار شاعر ہی کہہ سکتا ہے ، اور دیکھیے ۔

عشقِ رسولؐ ، دولتِ ایمان و آگہی　　عشقِ رسولؐ ، راہِ ہدایت کی روشنی
عشقِ رسولؐ ، زہد کی تقویٰ کی زندگی　　عشقِ رسولؐ ، بو ذرؓ و سلمانؓ فارسی

جذبِ دروں سے مظہرِ انوار بن گئے
نوعِ بشر کی فکر کا مینار بن گئے

عشقِ رسولؐ بچوں کا کھیل نہیں ، ایک پیکرِ نوری سے ، آب و گل کی بنی ہوئی مخلوق کا عشق کم از کم اس حقیر کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا ۔ محبّت ، محبوب کی دلجوئی اور اس کی رضا پر راضی رہنے کا سلیقہ دیتی ہے ، لیکن عشق محبوب پر تصرّف چاہتا ہے ۔ عشق میں اطاعت کا کوئی تصور نہیں اور نبی اکرمؐ کے سلسلے میں " با محمدؐ ہوشیار " ، لازمی شرط ہے ۔ حضورؐ کی بارگاہ میں محبّت اور جذبۂ اطاعت تو قابل قبول ہو سکتا ہے ، عشق کی سرمستی بالکل نہیں تاوقتیکہ یہ عشق روحانی مدارج پر فائز نہ ہو ۔ ذرا دیکھیے تو ہی خلقتِ محمدؐ کی کیفیت ، سکندر آغا کے الفاظ میں ۔

حکمِ معبود سے جب نورِ محمدؐ چمکا　　کوئی موجود نہ تھا خالقِ یکتا کے سوا
نہ زماں تھا ، نہ مکاں تھا ، نہ خلا تھا نہ فضا　　اور تو اور ہے خود عالمِ امکاں بھی نہ تھا

آئینہ حُسنِ حقیقی کا تھا یکتائی تھی
ہر طرف نُورِ محمدؐ کی ضیاء چھائی تھی

ایک طرف تو یہ کیفیت کہ کائنات کی تخلیق ہی نورِ محمدؐ کے بعد ، بلکہ خود نورِ محمدؐ سے ہوئی اور دوسری طرف فانی انسان اس نُور سے عشق کے دعوے کرے بغیر یہ سوچ سمجھے کہ انسان کا جسدِ خاکی ایک غلاظت کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں الّا یہ کہ طہارتِ فکر و نظر کی شعاعیں اسے پاک نہ کر دیں اور جب طہارتِ فکر و نظر میسر آتی ہے تو پھر بدن بے حقیقت ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس کا سایہ بھی نہیں رہتا ۔ جب روح سے رشتے استوار ہو جاتے ہیں تو پھر عظمتِ نبی سمجھ میں آتی ہے اور انسان آغا سکندر مہدی کی زبان میں بول اٹھتا ہے ۔

قلزمِ نُور میں حضرت کا سفینہ آیا
انبیاءِ بن گئے جب ان کو پسینہ آیا

اور اس عقیدت، محبّت، طہارتِ فکر و نظر اور عشق کی معراج علیؑ کو نصیب ہوئی تھی۔ سکندر آغا کے الفاظ میں دیکھیے۔

عشقِ رسولِؐ پاک ہے سرمایۂ حیات　　عشقِ رسولِ پاک ہے پروانہ نجات
عشقِ رسولِ پاک ہے حُسنِ صفات و ذات　　عشقِ رسولِ پاک ہے تنویرِ کائنات

مولائے کائنات ہوا اور ولی ہوا
انسان ان کے عشق میں مولا علیؑ ہوا

آخری بیت بھی نہج البلاغہ کا فیض ہے۔ حضرت علیؑ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ انہوں نے بدرجۂ کمال سرکار ختمی مرتبت کا اتباع کیا۔ یہی درس علیؑ کے دوستوں تک پہنچا۔ آج علیؑ کا کوئی دوست خود کو حضور نبی اکرمؐ، اہلبیت اطہار یا آئمہ طاہرین کا عاشق نہیں کہتا بلکہ اُن سے محبّت، عقیدت اور ان کے اتباع کو جزو ایمان سمجھتا ہے۔

علامہ اقبال نے کہا تھا "باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار" سکندر مہدی کا زاویہ فکر دیکھیے۔

منحرف ذات سے اللہ کی شیطان نہ تھا
بات اتنی تھی فقط آپ پہ ایمان نہ تھا

یہ ہے بارگاہ رسالت جہاں گستاخی کی سزا کڑی ہے۔

علیؑ کے دوستوں پر بعض انتہا پسندوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً الزامات لگائے گئے ہیں کہ اس مکتبۂ فکر کے لوگ خاکم بدہن، علی کو نبی اکرم پر فوقیت دیتے ہیں۔ استغفراللہ .... الزام تراشنے والے نہ جانے قرآن حکیم کے اس حکم کو کیوں نہیں پڑھتے جہاں ارشاد ہوا ہے "دیکھو کسی قوم کی دشمنی کہیں تمہیں عدل سے نہ ہٹا دے"۔ بہرحال سکندر مہدی نے صورت حال کی وضاحت یوں کی ہے۔

بعدِ رسولِؐ پاک ہے مولا علیؑ کا نام　　دستِ خدا محافظ حق اوّل امام
جس کی ولا ہے حکمِ رسولِؐ فلک مقام　　جس کے محب پہ آتشِ دوزخ ہوئی حرام

ایمان کل ہے نقطۂ اصلِ اصول ہے
عیدِ مباہلہ میں جو نفسِ رسولؐ ہے

دل میں اجالوں کی کمی یا فقدان ہو تو انسان منفی فیصلوں میں عجلت سے کام لیتا ہے۔ مجھے یاد ہے

۱۹۶۵ء میں ریڈیو پاکستان کراچی پر استاد نتھو خان نے ایک نغمہ ریکارڈ کیا تھا ، دمادم مست قلندر ، علیؑ دا پہلا نمبر ، یہ نغمہ ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا تو محدود فکر کے لوگوں کا اسلام خطرے میں پڑ گیا اور اعتراضات ہوئے کہ " علی دا پہلا نمبر " خلافت کے حوالے سے ہے اور کسی ایک مکتبہ فکر کی ترجمانی ہے ، چنانچہ اس بار اسلام کو بچانے کے لئے ملکہ ترنم نور جہاں نے اپنی خدمات پیش کیں اور ان کی آواز میں اس نغمہ کو دوبارہ ریکارڈ کیا گیا جس میں اسے تبدیل کر کے " دمادم مست قلندر ، علی دم دم دے اندر " کہلوایا گیا ۔ اہلِ فکر و نظر نے لاکھ وضاحت کی کہ یہ نغمہ ایک قلندر کے مزار پر گایا جاتا ہے اور پہلا نمبر سے مراد قلندری یا تصوّف کے سلسلے کی بات ہے اور قلندر اور صوفیاء کرام حضرت علیؑ کو مرشد اعلیٰ مانتے ہیں مگر جذبات کا طوفان تو ازل سے فکر کے چراغوں کو بجھانے کے در پے رہا ہے ، اسی طرح جب سکندر مہدی " بعد رسول پاک ہے مولا علیؑ کا نام " کہتے ہیں تو اس سے بھی اسلام یا خلافت راشدہ خطرے میں نہیں پڑتی بلکہ ان کا اشارہ نبوّت کے بعد امامت کی منزل کی طرف ہوتا ہے جو ان کے قائم کردہ ارکان مرثیہ یعنی توحید ، عدل ، نبوت ، امامت اور قیامت کی ایک کڑی ہے ، یہ نہیں کہ سکندر مہدی کا مؤقف یا ان کی مذہبی وابستگی واضح نہیں ہے ، یا وہ کسی مصلحت کے تحت اپنے مؤقف کا اعلان نہیں کرتے تھے ، لہذا یہ وضاحت ضروری ہے کہ سکندر آغا نے اپنے مؤقف کا بے باکی سے اعلان بھی کیا ہے لیکن دوسروں کی دل آزاری کبھی نہیں کی ، کمزور روایتوں یا متنازعہ مسائل پر قلم نہیں اٹھایا

میں نے بار بار لکھا ہے کہ اوائل عمر میں (جو بچوں کی ذہنی نشوونما کا دور ہوتا ہے) میں نے جوشؔ کو سنا اور جوش کو پڑھا اور جوش کے کلام نے ذہن کی جو تربیت کی اس کا اثر ساری زندگی اس حقیر پر رہا اور آج بھی ہے ۔ اس ذہنی تربیت کے تحت ایک شعر عرض کیا گیا تھا ۔

اندھی عقیدتوں کا خدا ، میرا رب نہیں
محرابِ فکر میں میرا سجدہ قبول کر

سکندر مہدی بھی اندھی عقیدتوں کے حامی نہیں تھے ، جوشؔ سے ان کا بہت قرب رہا ہے ۔ فکری اور ذہنی قرب بھی اور میل ملاقات کی صورت میں مادی قرب بھی ، اسی لئے وہ حضور نبی کریمؐ اور آئمہ طاہرین کے سراپا کی تصویر کشی کرنے کی بجائے ، ان کے اصولوں اور ان کی عظمتوں کی بات کرتے ہیں ۔ اکثر و بیشتر علیؑ کی فضیلت حضورؐ کے حوالے سے کرتے ہیں ، احادیث نبویؐ کی روشنی میں کرتے ہیں ۔

شمعِ فروغِ دین ہے ، اصلِ اصول ہے
مولا کا ذکر ، ذکرِ خدا و رسولؐ ہے

حکمِ سرکارِ دو عالم ہے ، علیؑ اولیٰ ہیں
جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علیؑ مولا ہیں

حق اُدھر جاتا ہے جس سمت علیؑ جاتے ہیں

جیسا کہ عرض کیا گیا سکندر مہدی نے اپنے فن کے چراغ کا اُجالا ضعیف روایتوں کی ٹمٹماتی یا جلتی بجھتی شمعوں سے نہیں بلکہ چراغِ نورِ ہدایت سے لیا ہے اسی لئے ان کی شاعری میں مبالغہ ، حاشیہ آرائی یا شاعری برائے شاعری نہیں اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام اہل نظر بلاتفریق مذہب و ملّت ان کی قدر کرتے ہیں ۔ مرثیہ کو ایک زمانے تک ایک مکتبۂ فکر کی شاعری سمجھا جاتا رہا ہے ۔ جوش اسے امام باڑے سے باہر لائے ۔ سکندر مہدی نے اسے بلاامتیازِ مکتبۂ فکر مقبول بنایا اس لئے ڈاکٹر حامد حسین بلگرامی ، شہاب دہلوی جیسے اکابرین آغا سے محبت کرتے ہیں ۔ شہاب دہلوی کا تبصرہ سکندر مہدی کی فکر اور رویّے کا کھلا ثبوت ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

" ملّتِ اسلامیہ کے بیشتر مفکّرین کہتے ہیں کہ آغا کے مرثیوں میں ایک عظیم مقصدیت ہے ، ہم اعتراف کرتے ہیں کہ یہ مقصدیت ان کی غیرِ معمولی ذہانت اور موجدانہ صلاحیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے ۔

اس طرح ان کے مرثیوں میں تنوع ، ندرت اور ان کی انفرادیت پر دال ہے ۔ جیسے ہی وہ نسلی امتیاز اور فرقہ وارانہ حصار کو توڑ کر ایک مردِ مومن کی آن بان اور شان سے فلسفۂ اسلام کا درس دینا شروع کرتے ہیں اسی لمحہ قاری اُن کی جرأت مندی اور صالح جذبات کا دل کی گہرائیوں سے قائل ہو جاتا ہے ، یہی وجہ ہے کہ ملک کے دانشوروں نے آغا کے مرثیوں کے گرد حصار کھینچ کر ان کے کلام کو محض اہلِ تشیع تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ان ممتاز دانشوروں نے آغا کے مرثیوں کو اسلامی قدروں کی کسوٹی پر کسنے کے بعد ان کے کلام کو ملّتِ اسلامیہ کے ہر فرقے کے لئے اسلامی تعلیمات ، انسان دوستی اور تزکیہ نفس کے صالح جذبات کا ایک گرانمایہ سرمایہ قرار دیا ہے ۔

ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنے مقالے " مجلس میں آج روشنی صبحِ یقین ہے " میں کہا ہے ۔

"میں نے ایک مقالہ جو انگریزی میں لکھا تھا اور ڈان میں چھپا تھا یہ عرض کیا تھا کہ یہ صنف جس کا خاتمہ انیسؔ و دبیرؔ پر سمجھا جاتا تھا اب کچھ شاعروں کے ہاتھوں ایک نئے احیاء پر آرہی ہے ان شاعروں میں آغا سکندرؔ مہدی کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے۔

واجد علی شاہ اخترؔ کے دور میں اور لکھنؤ کی فضا میں مرثیہ نے اپنے دور کی ترجمانی کی اور اس دور کے حساب سے واقعۂ کربلا کو جس طرح پیش کیا وہ نوعیت اب بدل چکی ہے۔ اقبال نے جستہ جستہ الفاظ میں اور پھر اسرار و رموز کی ایک نظم میں امام حسینؑ کی بابت جو کہا ہے وہ جدید مرثیہ نگاروں کے لئے اہم ہو گیا ہے۔" جوش نے کہا

اسلام کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

آغا کے مرثیے واقعات کے ساتھ ایک فلسفہ بھی پیش کرتے ہیں اور اس طرز کی نوعیت بھی جدید ہوتی ہے۔"

شہاب دہلوی نے جدید مرثیہ کے تناظر میں جوش اور سکندر مہدی پر براہ راست گفتگو کی ہے۔

"واقعہ یہ ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے جن اجزاء سے مرتب ہیں اور ان میں معنی و بیان کے جو گُل بوٹے انہوں نے کھلائے ہیں ان کی مہک اتنی تیز ہے کہ اس پر کسی اور خوشبو کا غالب آنا آسان نہیں۔ شاید یہ اسی کیفیت کا نتیجہ ہے کہ اردو شاعری کا گزشتہ تیس چالیس سالہ دور مرثیے کے باب میں بالکل تہی دامن نظر آتا ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی اس دور کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس خلاء کو پر کرنے کی طرف توجہ دی اور اپنے فکری تجدد سے کام لے کر مرثیہ کو نیا رنگ روپ دیا۔

حضرت جوش کی طرح آغا سکندرؔ مہدی بھی مرثیہ کے لئے نئی راہیں تلاش کر رہے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ وہاں پُرکاری اور ہوشیاری ہے اور یہاں سادگی و بیخودی ہے۔ وہ اپنے کمالِ فن کے لئے مرثیہ کہتے ہیں اور یہ اسے نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آغا کے مرثیوں میں الفاظ کی شان و شکوہ اور خیالات کی طمطراق سے زیادہ جذب و کیف اور اثر و گداز کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہے"

حضرت شہاب دہلوی نے یہ بات آغا کی محبت میں نہیں بلکہ یقیناً آغا کے مرثیوں پر گہری نظر ڈالنے کے بعد کہی ہے جب انہیں ایسے اشعار نظر آئے۔

طائرِ عقلِ رسا اوجِ ہما پاتا ہے　　مثلِ بُراق فضاؤں میں اُڑا جاتا ہے
آئینہ مانی و بہزاد کو دکھلاتا ہے　　مرثیہ نور کے سانچے میں ڈ ے
ذکرِ توحید سے افکار میں یکتائی ہے
شاعری حُسنِ محمدؐ سے نکھر آئی ہے
منہ سے جو لفظ نکلتا ہے، گہر ہوتا ہے　　حُسنِ صورت میں مثالِ گلِ تر ہوتا ہے
باغِ افکار کا پاکیزہ ثمر ہوتا ہے　　اپنے دامن میں لئے نورِ سحر ہوتا ہے
میرے خالق نے مجھے دُرِّ نجف بخشا ہے
مدحِ سرکارِ دو عالم کا شرف بخشا ہے
موجِ دریائے سماحت ہے زباں سے جاری　　قلزمِ فن ہے بلاغت کی مرصّع کاری
فکر کے رنگ سے کرتا ہے قلم گُل کاری　　جذبۂ عشقِ محمدؐ ہے فضا پر طاری
عرش سے فرش پہ قدسی کی صدا آتی ہے
عاقبت ذکرِ محمدؐ سے سنور جاتی ہے

ذکرِ محمدؐ سے صرف عاقبت ہی نہیں سنورتی، آغا کے مرثیوں کو پڑھ کر تو یہ یقین ہوتا ہے کہ ذکرِ محمدؐ سے ان کی زندگی بھی سنور گئی جس کا اظہار وہ اپنے ایک دوسرے مرثیہ میں یوں کرتے نظر آتے ہیں۔

مطلعِ فکر ہے ایماں کی ضیاء سے روشن　　شیشۂ قلب ہے ایقاں کی جلا سے روشن
دیدۂ چشم ہے عرفاں کی فضا سے روشن　　چشمۂ روح ہے قرآں کی ہوا سے روشن
ذکرِ معبودِ حقیقی سے زباں روشن ہے
جودتِ فکر سے اندازِ بیاں روشن ہے

اور جب زبان کو روشنی ملی اور اندازِ بیان اُجالے بکھیرنے لگا تو وہ محبّتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ میں سرشار، محوِ سخن طرازی ہو گئے۔

اہلِ مجلس میں ہوا تذکرۂ شعر و سخن　　باادب ہو کے بڑھا ولولۂ شعر و سخن
سرِ افلاک گیا غلغلۂ شعر و سخن　　گرمیٔ بزم بنا طنطنۂ شعر و سخن

یہ ہے سرورِ محبّتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کہ شاعر کو اپنے شعر و سخن کا غلغلہ سرِ افلاک بھی سنائی دیتا ہے لیکن ساتھ ہی تہذیبِ آستانہ آلِ محمدؐ کا تصدّق ہے کہ شاعر اس منزلِ کیف و سرور پر اپنے ہوش و حواس نہیں کھو دیتا۔

بلکہ اور ہوشمند نظر آتا ہے اور یہ بیت کہتا ہے۔

زورِ تقریر سے لفظوں میں روانی آئی
ذکرِ سرکار سے اعجاز بیانی آئی

یہ ہوشمندی شعر و سخن کے مقام سے بھی آگاہ کرتی ہے اور اس کی قبولیت سے بھی۔

مصدرِ نورِ فصاحت ہے مرا طرزِ سخن رکنِ ایوانِ سلاست ہے مرا طرزِ سخن
گوہرِ تاجِ عبارت ہے مرا طرزِ سخن منبعِ حسنِ بلاغت ہے مرا طرزِ سخن

اور پھر تہذیب ولائے آلِ محمدؐ دامن تھام لیتی ہے اور صحیح راستہ دکھاتی ہے

قصرِ اقلیمِ سخن ، شاہ کی شاہی سے ملا
جو ملا مجھ کو وہ توفیقِ الہیٰ سے ملا

یہی شعار، شعار محبانِ علیؑ ہے، یہی مسلک، مسلکِ غلامانِ رسولؐ ہے، جو درِ اہلبیتِ رسولؐ پر سر جھکا کر خدا تک پہنچتے ہیں۔ خدا ہماری محدود عقل کی حد تک، دیانتِ رسول کا نام ہے۔ اعلانِ رسالت فرمایا گیا تو قریش نے کہا محمدؐ تم خدائی کا دعویٰ کرو تو ہم مان لیں گے لیکن ایک اَن دیکھے خدا کو تسلیم نہ کریں گے۔ حضورؐ نے کہا نہیں میں خدا نہیں ہوں، میں تو اس کا ایک بندہ ہوں اور تمہارے لئے سلامتی کا پیغام لایا ہوں علیؑ کو نصیری نے خدا کہا تو انہوں نے اسے کافر قرار دیا اور قتل کر دیا۔ حسینؑ کو کربلا میں اور کربلا سے پہلے دنیاوی نعمتوں کی پیشکش ہوئی اور انہوں نے یہ کہہ کر رَد کر دیا کہ اللہ کا دین میرے لئے اہم ہے، میں دین میں کسی تبدیلی کو قبول نہیں کروں گا اور بھرا گھر لٹا کر اللہ کی حاکمیتِ مطلق کا ثبوت فراہم کر دیا۔ وجودِ خداوندی برہان و دلائل سے آج تک فہم و فراستِ بشر میں ثابت نہ ہو سکا البتہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی زندگی اور حسینؑ کی قربانی نے یہ ثابت کر دیا کہ کوئی خدا ہے جس کے حضور حسینؑ ایسی باعمل شخصیت قربانیوں پہ قربانیاں پیش کر رہی ہے، یہ عجز جو رسولؐ سے ملا، علیؑ سے ملا، اہلبیت سے ملا، حسینؑ سے ملا، سنتِ رسول ہے، سنتِ علیؑ ہے، سنتِ حسینؑ ہے، یہی اسلام کا پیغام ہے، یہی اسلام ہے۔

اسلام نے یہودیت کی انا پرستی، زر پرستی، ذخیرہ اندوزی، انسان دشمنی کے برخلاف عجز و انکسار، محبت و اخوت کا پیغام دیا تھا۔ اسے اہلبیتِ محمدؐ نے عمل کی صورت میں پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کا ہر حکم قابلِ عمل ہے، یہی وجہ تھی کہ کربلا میں یزیدی درندگی، بربریت اور وحشت کو امام حسینؑ نے طاقت سے نہیں کچلا بلکہ عجز و انکسار کے ساتھ صبر کو ظلم کے مقابل کھڑا کر دیا اور سر کٹا دیا۔

سکندر مہدی انسان میں اَنا پرستی، بہیمیت اور درندگی کے خلاف علم اٹھاتے نظر آتے ہیں۔

ہے گرفتارِ انا روزِ ازل سے انساں خوار و گمراہ ہے باطل کے خلل سے انساں
شمر و شدّاد ہے خود اپنے عمل سے انساں منسلک آج بھی ہے لات و ہبل سے انساں
خودنمائی کے صنم سر پہ اٹھا رکھے ہیں
کتنے بت ذہنوں کے پردوں میں چھپا رکھے ہیں

ہوسِ زر سے ہے ہاتھوں میں طلائی زنجیر ہے بیانات کی آغوش میں حورِ تشہیر
شہرِ افکار کا سلطان ہے دیوِ تحقیر خون انسان کا پیتی ہے انا کی شمشیر
یوسفِ فکر کا سودا ہے جہانداروں میں
ابنِ آدم کا شرف بکتا ہے بازاروں میں

بہرِ تسکین انا ہے نظریات کی جنگ چار اطراف میں چھائی ہے خیالات کی جنگ
امن کے نام پہ ہے رسم و روایات کی جنگ خودنمائی کا نتیجہ ہے ہر اک بات کی جنگ
ایک کہتا ہے کہ میدان میرے ہاتھ رہے
دوسرا کہتا ہے دنیا میں میری بات رہے

جوہرِ عجز ہے زندانِ انا میں محدود ابتری پھیلی ہے ہر سمت سکوں ہے مفقود
آگ ہی آگ ہے ہر فرد بنا ہے نمرود جائے انسان کہاں راہِ مفر ہے مسدود
جبر ہے جور ہے تخریب ہے خونخواری ہے
گوشے گوشے میں تباہی کا عمل جاری ہے

سکندر مہدی برائیوں کی نشاندہی کر کے یا تنقید و تنقیص کر کے بات ختم نہیں کرتے بلکہ ان برائیوں کو دور کرنے کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔

اُف تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہے انساں آگ ہی آگ ہے شعلوں کے چڑھے ہیں طوفاں
خرمنِ زیست پہ ہے سلسلۂ برقِ تپاں ایسے ماحول میں ضامن ہے تو نورِ ایماں
شر کے بھڑکے ہوئے شعلوں کو بجھا سکتا ہے
دینِ اسلام ہی انساں کو بچا سکتا ہے

آغا سکندر کے ہاں ابہام بالکل نہیں ہے، وہ سیدھی سچی بات کہتے ہیں اور بڑی جرأت اور بیباکی سے کہتے ہیں۔ اندازِ تخاطب کیونکہ مثبت ہے اس لئے ان کی بات سنی جاتی ہے، لہٰذا جب کہا جائے "دین اسلام ہی انسان کو بچا سکتا ہے" تو THEORY کی حد تک، کتاب کی حد تک تو بات مکمل کہی جا سکتی ہے لیکن جب

عمل کی منزل آئے تو کون سا اسلام ؟ ۔ جگہ جگہ تاریخ کی متضاد قوتیں اسلام کی دعویدار ، اور مسلمان ہونے کا اعلان کرتی نظر آتی ہیں مثلاً علی بھی مسلمان اور ابو سفیان بھی مسلمان ، امام حسنؑ بھی مسلمان اور امیر معاویہ بھی مسلمان ، حسینؑ بھی مسلمان اور یزید بھی مسلمان ، عباس بھی مسلمان اور شمر بھی مسلمان ، حُر بھی مسلمان اور حرملا بھی مسلمان ، بنی ہاشم بھی مسلمان اور بنی امیّہ و بنی عباس بھی مسلمان ۔ سلمانؓ ، ابوذرؓ ، میثم تمارؓ ، ایسے صحابۂ کرام بھی مسلمان اور وہ اصحابِ نبی بھی مسلمان جو جمہوریت اور اجماع کے منتخب کردہ خلیفۃ الرسول حضرت علیؑ کے خلاف برسرِپیکار رہے اور آج خمینی بھی مسلمان اور آل سعود بھی مسلمان ۔ آغا سکندر مہدی اسلام کے ایک سلسلے کی وضاحت کرتے نظر آتے ہیں جو رسولؐ اکرم اور ان کی آل کا سلسلہ ہے ۔

دینِ اسلام کے داعی ہیں رسولؐ مقبول   جو ہیں نبیوں کے نبی اور رسولوں کے رسول
جن کی ہستی پہ ہوا رحمتِ خالق کا نزول   جن کے دامن میں کھلے گلشنِ ایمان کے پھول
بندہ و خواجہ کی تفریق مٹا دی جس نے
دوست تو دوست ہیں دشمن کو دعا دی جس نے

ہے مقدّر میں جو پاکیزہ خیالی کا شرف   ذکر بڑھتا ہے نبوّت سے امامت کی طرف
حکمِ سرکار ہے توصیفِ شہنشاہِ نجف   رونقِ دینِ مُبیں ہے ابوطالب کا خَلف
حق پرستوں میں چلیں حق کے دلی کی باتیں
باعثِ زینتِ مجلس ہیں علیؑ کی باتیں

دینِ قائم کی محافظ ہے علیؑ کی اولاد   نام سے جن کے لرز جاتا ہے عفریتِ فساد
ہے بجا ان کو کہیں وارثِ شمشیرِ جہاد   گلشنِ دینِ مبیں ان کے سبب ہے آباد
جانِ اسلام شہنشاہِ شہادت ہیں حسینؑ
حق پرستوں کے لئے حق کی علامت ہیں حسینؑ

جبکہ باطل کی ہوئی لشکرِ حق پر یلغار   مسخ ہونے لگیں اسلام کی اعلیٰ اقدار
ہو گیا ظلم سے انسان کا جینا دشوار   تب بنی دیں کی سپر ابنِ علیؑ کی تلوار
دہر میں دین کا پیغام نہ باقی رہتا
یہ نہ سر دیتے تو اسلام نہ باقی رہتا

یہ مکمل مرثیہ آغا کے قائم کردہ حدود کے اندر ہے جو ان کے اپنے مسلک کا اعلان بھی ہے وہ اسی سلسلے کو ماننے تھے اسی لئے جب وہ کہتے ہیں ۔

○ ذکرِ معبودِ حقیقی سے زباں روشن ہے۔
○ عاقبت ذکرِ محمدؐ سے سنور جاتی ہے۔
○ ذکرِ سرکار سے اعجاز بیانی ہے۔
○ جو ملا مجھ کو وہ توفیق الہٰی سے ملا۔

تو یہ فکر ایک ہی تسبیح کے دانوں کی طرح ہوتی ہے۔

آغا سکندر مہدی مسلکِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے پیروکار تھے۔ محبتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ سے سرشار تھے اُسوۂ رسول و آلِ رسول پر کاربند تھے، اس اثاثے کے ساتھ وہ فکر کے بحرِ بیکراں میں شعر و سخن کے موتی تلاش کرتے تھے۔ علامہ جمیل مظہری جیسے قادر الکلام شاعر نے پندرہ برس کے عرصے میں تین مرثیے کہے جبکہ سکندر مہدی نے پانچ سال کے عرصے میں سولہ مرثیے کہے جس سے سکندر مہدی کا یہ دعویٰ پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ۔

جو ملا مجھ کو وہ توفیق الہٰی سے ملا

آغا کے کم و بیش تمام مراثی مرثیہ معلیٰ کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں جو اب دستیاب نہیں ہیں۔ نہ جانے کیوں اہل نقد و نظر نے سکندر مہدی کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جس کے وہ مستحق ہیں۔ کچھ ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ آغا کے مرثیوں کے بند کے بند دوسروں کے مراثی میں جگمگاتے نظر آتے ہیں لیکن آغا کے مرثیے عام نہ ہونے کی وجہ سے اہل نظر ان کے بند دوسروں کے مراثی سے الگ نہ کر سکے۔ پاکستان میں بالعموم اور کراچی میں بالخصوص مرثیہ پر بہت کام ہوا ہے۔ سید ضمیر اختر نقوی، پروفیسر محمدؐ رضا کاظمی اور آخر میں ڈاکٹر ہلال نقوی کو سلام کہ انہوں نے مرثیہ کے ضمن میں بہت چھان بین کی مگر ایک شکایت بھی کہ آغا سکندر مہدی اس بے اعتنائی کے سزاوار نہ تھے جو ان سے روا رکھی گئی۔ میں نے سکندر مہدی کو بہت پہلے پڑھا تھا لیکن میرا مؤقف یہ ہے کہ کتاب کافی نہیں ہوتی، جب تک کہ میں شاعر کی داخلی اور خارجی کیفیات سے آگاہی اور اس کی شاعری کے اصل محرکات سے واقفیت حاصل نہ کردں میں صرف کلام کو اساس گفتگو نہیں بناتا۔ اس کا سبب شاید یہ بھی ہو کہ ایسی کئی کتابیں بھی دیکھ چکا ہوں جو اُن کی نہیں جن کے نام سے سامنے آئی ہیں۔ کسی کی ذات و صفات و محرکات کو جاننے کے لئے بھی میں اس کے اصحاب کی بیان کردہ روایات پر انحصار نہیں کرتا، اس لئے کہ "شنیدہ کے بُعد مانندِ دیدہ" بس جونہی پتہ چلا کہ سید حیدرؔ مہدی رضوی ہمارے بتا ہی نہیں بلکہ آغا سکندر مہدی کے بڑے بھائی ہیں اور آغا کی تربیت میں بتا نے اہم کردار ادا کیا ہے تو تربیت کرنے والے کی شخصیت نے میری توجہ اس کی طرف مبذول کرا دی جس کی اس نے تربیت کی تھی، یعنی سکندر مہدی کی طرف۔ مجھے یقین آگیا کہ اب مجھے سکندر مہدی کی کتاب یا کتابوں پر اکتفا نہیں

کرنا پڑے گا بلکہ ان کی سیرت ، ان کی عادات ، ان کی شاعری کے محرکات اور ان کے صبح و شام کی اطلاعات اصحاب کی بجائے ان کے بھائی سے مل سکیں گی جن کی صداقت پر شک نہیں کیا جا سکتا ، چنانچہ میں نے بتا سے سکندر آغا کے روز و شب کے متعلق معلومات حاصل کیں ، ان کے رجحانات کو سمجھا ، ان کی شاعری کے اندرونی اور بیرونی محرکات کو جاننے کی کوشش کی ۔ سکندر آغا کے گھرانے سے معلومات حاصل کرنے کے بعد ان کے اصحاب اور چاہنے والوں کی آراء کو پڑھا اور چونکہ یہ ساری معلومات اور آراء اشرفیوں کے عوض سامنے نہیں آئی تھیں بلکہ ازراہ خلوص و دیانت ضابطۂ تحریر میں لائی گئی تھیں اس لئے مجھے ان کی صداقت میں تشکیک نہیں ہوئی ۔ مزید برآں یہ ساری آراء کتاب و کلام کے مطابق تھیں ۔ جو کچھ تھا وہ کتاب و کلام کے حوالے سے تھا ۔ رائے دینے والوں نے کہیں بھی کوئی واقعہ سناتے وقت یا اپنی رائے دیتے وقت سکندر مہدی سے اپنا ذاتی قرب ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ سب سے زیادہ معلوماتی مضامین سکندر مہدی کی بہن پروفیسر حشمت جہاں ناز نے تحریر کئے تھے اور کیوں نہ ہوتا ، گھر والوں سے زیادہ کسی شخصیت کے لئے کون جان سکتا ہے ۔

حشمت جہاں ناز خود ایک ادیبہ تھیں ۔ انہوں نے اردو ادب کو تین بیش بہا کتابیں دی ہیں ۔ پہلی کتاب " اردو نثرنگاری ۔ تنقید و تاریخ " ہے ۔ اہل ادب جانتے ہیں کہ اردو شاعری پر تو بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اردو نثر پر رام بابو سکسینہ اور حامد حسینؔ قادری کے بعد تیسری اہم کتاب پروفیسر حشمت جہاں ناز نے لکھی ہے ۔ اس کے بعد " اردو کے دس بڑے شاعر " اور " انتخاب کلام اقبال " کی اشاعت نے سیدہ حشمت جہاں ناز کو ادبی دنیا میں موضوع گفتگو بنا دیا تھا ۔ سیدہ حشمت جہاں ، گورنمنٹ ڈگری کالج ایبٹ آباد میں پروفیسر تھیں کہ عین عالم شباب میں مارچ ۱۹۸۳ء کو اللہ کو پیاری ہو گئیں ۔ سیدہ حشمت نے آغا کی ذات سے متعلق بہت سے واقعات لکھے ہیں جن سے آغا سکندر کی ذاتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے ، مثلاً

" ہم نے جب سے ہوش سنبھالا انہیں اسی رنگ میں پایا ۔ دوستوں کے بھی دوست اور دشمنوں کے بعد دوست ، بچپن سے محفل آرائی کے شوقین ۔ لاہور میں ایک بار ان کو اپنے زمانۂ طالب علمی کے ایک جاننے والے مل گئے جن کی مالی حالت خراب تھی ۔ آغا بھائی جان انہیں گھر لے آئے ، ان کی خاطر مدارات کی اور حتی المقدور مالی امداد بھی ۔ رات بھر وہ ہمارے گھر ہی سوئے ، صبح سویرے نماز سے پہلے اٹھ کر لحاف سمیت چلتے بنے ، ہمیں ان کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا مگر آغا بھائی جان کچھ نہ بولے ۔ کچھ دنوں بعد وہی حضرت انہیں پھر بازار میں ملے ، آغا بھائی جان پھر اسی خلوص سے ملے اور اشارتاً بھی ایک لفظ ایسا نہ کہا جس سے وہ شرمندہ ہوتے ۔

ایک عید پر خلاف معمول آغا بھائی جان نے نئے جوتے خریدے ، جوتے قیمتی بھی تھے اور خوبصورت بھی ، سب نے تعریف کی ۔ تعریف کرنے والوں میں ان کا ایک ملازم سب سے پیش پیش تھا ، سمجھ گئے کہ اسے یہ جوتے بہت پسند آئے ہیں ۔ بلا کر پوچھنے لگے ، کیا جوتے بہت اچھے ہیں ۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا ۔ آپ نے جوتے اتار کر اس کے حوالے کئے اور کہا جاؤ عید پر پہنو ۔ یہ ماجرا دیکھ کر ہم نے کہا ایسا ہی تھا تو اسے سستے جوتے خرید دیتے ، کہنے لگے ۔

"غریب آدمی سستے جوتے خود بھی خرید سکتا ہے ، یہ قیمتی جوتے اسے پسند آئے تو میں نے اس کی خواہش پوری کر دی ۔ میں پھر کبھی خرید لوں گا ۔"

سیدہ حشمت کے ایک مضمون کے حوالے سے ہی محترم تاثیر نقوی کے تحریر کردہ قطعۂ تاریخ وفات کا پتہ چلا جس پر بقولِ حشمت جہاں خود تاثیر نقوی انگشت بدنداں تھے کہ عجیب و غریب قطع تاریخ نکلا تھا ۔

مدحتِ آلِ نبی ہے بخدا طرحِ نجات اسی بنیاد پہ تاریخ یہ حسرت کہہ دی
آل سے لے کے الف نام میں شامل جو کیا سال رحلت کا ملا " آغا سکندر مہدی "

۱+ ۱۳۹۵=

وہ شام تو میں کبھی نہ بھولوں گا جب لندن میں آغا مرحوم کی اہلیہ نثار فاطمہ سے میری ملاقات ہوئی ۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کے مرحوم شوہر کا کلام ایک جگہ اکٹھا کر کے شائع کرنا چاہتا ہوں ۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ۔ فاطمہ نے کہا ۔

"عاشور بھائی ! اُن کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ۔ لوگ اُن کی طرف سے چشم پوشی کر رہے ہیں ۔"

میں ان سے آغا کی زندگی کے بارے میں سوال کرتا گیا اور وہ جواب دیتی رہیں مگر وہ بار بار ایک ہی فقرہ کہتی تھیں ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ۔ فاطمہ نے بتایا کہ ۔

آغا کی زندگی کا نصب العین ہی ذکرِ شہدائے کربلا بن گیا تھا ، وہ بڑے خشوع و خضوع اور انہماک سے مرثیہ کہتے تھے ۔ وہ مرثیہ شروع کرنے سے پہلے وضو کرتے اور پھر یوں مؤدب بیٹھ جاتے جیسے نماز پڑھنے لگے ہوں ، جیسے وہ کسی عظیم ہستی کی بارگاہ میں حاضر ہوں ۔ فاطمہ نے بتایا کہ آغا کچھ دیر آنکھیں بند کئے کچھ سوچتے رہتے ، ان کی زبان کچھ ورد کرتی رہتی جسے کوئی نہیں سن سکتا تھا ، اور پھر وہ لکھنا شروع کر دیتے تھے ، اور اس تسلسل سے لکھتے تھے

جیسے کوئی اور بول رہا ہو اور وہ لکھ رہے ہوں ۔ اس وقت ان کے چہرے پر لمحہ لمحہ تاثرات بدلتے رہتے تھے ۔ کبھی کبھی تو مٹھیاں بھینچ کر قلم رکھ دیتے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو جاتے ۔ وہ روتے رہتے اور پھر کچھ دیر بعد قلم اٹھا کر ایک یا دو بند لکھتے اور مرثیہ کو تمام کر دیتے ۔

فاطمہ اُن کا (یعنی سکندر مہدی) کا ذکر کرتی رہیں اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے اور پھر جب چھٹی ساتویں بار انہوں نے یہ کہا کہ عاشور بھائی اُن کے ساتھ دنیا والوں نے اور ادب والوں نے اور مولا حسینؑ والوں نے انصاف نہیں کیا تو میں نے دیکھا یکایک ان کی پیشانی پر عزم کی چمک نمایاں ہوئی ۔ اُنہوں نے آنسو پونچھ لئے اور بڑے اعتماد سے بولیں ۔

عاشور بھائی میں مدینہ جاؤں گی اور چاہے میری کمر پر کوڑوں کی بوچھاڑ ہو جائے میں آقا کے روضہ کی جالی پکڑ کر پوچھوں گی کہ آپ کے غلام کی حق تلفی پر آپ نے توجہ کیوں نہیں فرمائی میں نجف جاؤں گی اور مولا علیؑ کے روضہ پر جا کر دہائی دوں گی کہ اُن کے فرزند حسینؑ کے ایک مرثیہ گو کو اُس کا حق کیوں نہیں ملا ؟ عاشور بھائی میں کربلا جاؤں گی اور مولا حسینؑ سے پوچھوں گی کہ اُن کے مرثیہ گویوں میں آغا سکندر مہدی کا نام شامل ہے یا نہیں ؟

ہمّا کے سامنے بیساختہ پن میں نثار فاطمہ کی زبان پر آغا سکندر مہدی کا نام آیا تو اُن کی آنکھوں میں حیا کے جگنو جگمگانے لگے اور وہ خاموش ہو گئیں ۔ میں نے کہا بھابھی یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے ۔ آپ کیا سمجھتی ہیں آغا نے اہل دنیا سے سندِ قبولیت حاصل کرنے کے لئے مرثیے لکھے تھے ؟ آپ کس قبولیت کی بات کر رہی ہیں ۔ دعا کیجئے کہ بارگاہِ احدیت میں ، بارگاہِ رسالت میں ، ابوتراب کی بارگاہ میں اور خود حسینی بارگاہ میں آغا کے مرثیوں کی قبولیت ہو اور یہ سن کر جیسے فاطمہ کو قرار آ گیا ہو ۔

پھر اطلاع ملی کہ فاطمہ بھابھی ، اپنے منجھلے بیٹے اکبر مہدی اور بیٹی نگار فاطمہ کے پاس شارجہ آئی تھیں ۔ شاید مدینے جانے کے لئے ، شاید نجف جانے کے لئے ، شاید کربلا جانے کے لئے کہ ۵ اگست ۹۴ء کو شارجہ میں ان کی حرکتِ قلب بند ہو گئی ۔ میں نے علماء سے سنا ہے کہ :

" جو آلِ محمدؐ کی محبت میں مرا وہ شہید ہوا " ۔ پس فاطمہ بھابھی مری تو نہیں ہیں تو پھر وہ کہاں چلی گئیں ؟ یہ سوچتے سوچتے خیال آیا کہ شاید وہ بذات خود بارگاہِ احدیت میں ، بارگاہِ رسالت میں ، بارگاہِ مرتضوی میں اور بارگاہِ حسینیت میں یہ پوچھنے گئی ہیں کہ اُن کے شوہر کا نام شبیرؑ کے عزاداروں اور مرثیہ گویوں میں شامل ہے کہ نہیں ؟

لہذا میں یہ کتاب اور اس کتاب میں شامل آغا سکندر مہدی کے سولہ مرثیے معنون کرتا ہوں نثار فاطمہ سکندر کے نام ۔ ان کے فرزندوں مظفر مہدی ، اکبر مہدی اور خاور مہدی بیٹی نگار فاطمہ کے نام اور سید حیدر مہدی رضوی کے نام جن کے سینے میں حشمت جہاں ناز کی جدائی کا زخم ، آغا سکندر مہدی کے بچھڑنے کا زخم ، اور اب فاطمہ کی بے وقت موت کا زخم ہے گویا ان کے دل میں زخموں کی کہکشاں بھی ہے لیکن ان کی نظر ان زخموں سے رِستے لہو پر نہیں بلکہ فرات کے کنارے عباسؑ کے کٹے ہوئے بازوؤں سے نکلتے لہو پر ، تپتی ریت پر علی اکبر کے سینے سے اُبلتے ہوئے لہو پر اور زندان شام میں سکینہ کی موت پر سیدِ سجاد کی آنکھوں سے بہتے لہو پر ہے جو آج بھی بہہ رہا ہے اور یزیدانِ عصر سے کہہ رہا ہے ۔

دہر میں نامِ حسینؑ ابن علیؑ زندہ ہے
کربلا آج بھی تابندہ و پائندہ ہے

سید عاشور کاظمی
لندن ۲۰ / اکتوبر ۹۲ء

پیغام یہ حضرت کا ، صبا لائی ہے
مداح ہے ، شبیرؑ کا مولائی ہے
جس صف میں ہیں اُستاد انیسؔ اور دبیرؔ
آغاؔ نے بھی اس صف میں جگہ پائی ہے
(آغا سکندر)

آغا سکندر مہدی

کے

سولہ مرثیے

امداد میری صاحبِ معراج کرے
بخشش کی دعا دین کا سرتاج کرے
آغاؔ یہ تمنا ہے مری جیتے جی
اللہ نہ محتاجوں کا محتاج کرے

مرثیہ نمبر ۱

اسمِ اللہ سے آغاز بیاں کرتا ہوں

اسمِ اللہ سے آغازِ بیان کرتا ہوں ۱ کلمۂ پاک سے مقصد کو عیاں کرتا ہوں
حمد و تسبیحِ خداوندِ جہاں کرتا ہوں سورۂ نُور کو میں وردِ زباں کرتا ہوں
ذکرِ توحید عبادت ہے رقم ہوتا ہے
سرنگوں حمدِ الہیٰ میں قلم ہوتا ہے

لائقِ حمد و ثنا ذاتِ خداوندِ جلیل ۲ خالقِ ارض و سما ذاتِ خداوندِ جلیل
منبعِ جُود و سخا ذاتِ خداوندِ جلیل مرکزِ لطف و عطا ذاتِ خداوندِ جلیل
لفظ بیکار ہیں ، اندازِ بیاں قاصر ہے
اس کی تعریف سے انساں کی زباں قاصر ہے

ذاتِ واحد کا کروں تذکرۂ حسن و جمال ۳ میں ہوں اک بندۂ مجبور کہاں میری مجال
وہ تو ہے ذاتِ احد خالقِ بیمثل و مثال لامکاں فکر میں آ جائے تصوّر ہے محال
پھر بھی جس سمت مری طبعِ رسا جاتی ہے
حُسنِ تخلیق سے بھرپور فضا جاتی ہے

حکمِ معبود سے جب نورِ محمدؐ چمکا ۴ کوئی معبود نہ تھا، خالقِ یکتا کے سوا
نہ زماں تھا، نہ مکاں تھا، نہ خلا تھا نہ فضا اور تو اور ہے خود عالمِ امکاں بھی نہ تھا

آئینہ حسنِ حقیقی کا تھا، یکتائی تھی
ہر طرف نورِ محمدؐ کی ضیاء چھائی تھی

بعد میں سلسلۂ روز و شبِ تار بنا ۵ نیلگوں رنگ لئے گنبدِ دوّار بنا
مخزنِ نور ہوا، مطلعِ انوار بنا چاند تاروں کو لئے چرخِ طرحدار بنا

کرۂ ارض پہ سورج کی کرن تھرائی
پرچمِ نور لئے صبحِ ازل لہرائی

وجہِ تخلیق بنی نورِ محمدؐ کی ضیاء ۶ روشنی پھیل گئی ہو گئی معمور فضا
حکمِ خالق سے ہوئے جنّ و ملائک پیدا گلشنِ عالمِ امکاں کا ہر اک پھول کھلا

قلزمِ نور میں حضرت کا سفینہ آیا
انبیاء بن گئے جب ان کو پسینہ آیا

طائرِ عقل رسا اوجِ ہما پاتا ہے ۷ مثلِ براق، فضاؤں میں اُڑا جاتا ہے
آئینہ مانی و بہزاد کو دکھلاتا ہے مرثیہ نور کے سانچے میں ڈھلا جاتا ہے

ذکرِ توحید سے افکار میں یکتائی ہے
شاعری حُسنِ محمدؐ سے نکھر آئی ہے

منھ سے جو لفظ نکلتا ہے گہر ہوتا ہے ۸ حُسنِ صورت میں مثالِ گلِ تر ہوتا ہے
باغِ افکار کا پاکیزہ ثمر ہوتا ہے اپنے دامن میں لئے نورِ سحر ہوتا ہے

میرے خالق نے مجھے دُرِّ نجف بخشا ہے
مدحِ سرکارِ دو عالمؐ کا شرف بخشا ہے

موج دریائے فصاحت ہے زباں سے جاری ۹ قلزمِ فن ہے بلاغت کی مرصّع کاری
فکر کے رنگ سے کرتا ہے قلم گلکاری جذبۂ عشقِ محمدؐ ہے فضا پر طاری

عرش سے فرش پہ قدسی کی صدا آتی ہے
عاقبت ذکرِ محمدؐ سے سنور جاتی ہے

فکرِ انسان کی پابند زباں ہوتی ہے ۱۰ شاعری آئینۂ جذبِ نہاں ہوتی ہے
کیفیت قلب کی لفظوں سے بیاں ہوتی ہے حُسنِ ترتیب سے دنیا پہ عیاں ہوتی ہے

رازِ فطرت کا اگر ماہرِ فن ہے شاعر
حق تو یہ ہے کہ شہنشاہِ سخن ہے شاعر

شاعری ، حُسنِ خیالات کا ہے عکسِ جمیل ۱۱ شاعری ، ارض و سماوات کا ہے عکسِ جمیل
شاعری ، رب کی عنایات کا ہے عکسِ جمیل شاعری ، فن کی روایات کا ہے عکسِ جمیل

نقش دل کاوشِ پیہم سے اُبھر آتا ہے
جوہرِ عطر فضاؤں کا نکھر آتا ہے

آسماں چیر کے جاتی ہے نگاہِ شاعر ۱۲ بخت خوابیدہ جگاتی ہے نگاہِ شاعر
حدِ آفاق پہ چھاتی ہے نگاہِ شاعر حُسنِ قدرت کو دکھاتی ہے نگاہِ شاعر
وسعتِ فکر سے ذرّے کو بیاباں کر دے
حُسنِ تدبیر سے کوزے میں سمندر بھر دے

مرثیہ ! شدّتِ جذبات کا آئینہ ہے ۱۳ قوم کی رسم و روایات کا آئینہ ہے
ذاتِ باری کی مُناجات کا آئینہ ہے مردِ مومن کی عبادات کا آئینہ ہے
اشہبِ فکر سوئے عرشِ عُلا جاتا ہے
رشک سے رنگ عطارد کا اُڑا جاتا ہے

لوحِ محفوظ پہ جنبش میں قلم آتا ہے ۱۴ جھلکیاں عرش سے تقدیر کی دکھلاتا ہے
فرش پر قصۂ آدمؑ کی خبر لاتا ہے آتشِ بغض سے ابلیس جلا جاتا ہے
نورِ سرکار رسالت سے جو زک پائی ہے
ابنِ آدمؑ کو ستانے کی قسم کھائی ہے

جب فرشتوں نے سر عرش یہ اعلان سنا ۱۵ نائب ربِّ علا ارض پہ انسان ہوا
یک زباں ہو کے یہ دربارِ الہٰی میں کہا حمد و تسبیح میں مصروف ہیں ہم ، صبح و مسا
تیری مرضی کے ہمیشہ سے طلبگار ہیں ہم
ایسے عہدے کے تو دنیا میں سزاوار ہیں ہم

ہم کو چننا تھا کہ ہیں عرش معظم کے مکیں ۱۶ تاکہ ہوتی تری تسبیح سے معمور زمیں
آئی آواز " حقیقت تمہیں معلوم نہیں " "روح جب اسمیں پھونکے تم کو جھکے جبیں"

گفتگو ختم ہوئی اور اجازت نہ ملی
اللہ اللہ فرشتوں کو خلافت نہ ملی

خاک سے پیکرِ آدمؑ کو جو تیار کیا ۱۷ سب گرے سجدے میں ابلیس نے انکار کیا
عظمتِ نورِ محمدؐ کا نہ اقرار کیا اور تو اور تکبّر کا بھی اظہار کیا

کس بلندی سے فقط بغض و عداوت میں گرا
حد سے آگے جو بڑھا ، قعرِ مذلّت میں گرا

روزِ بد بُغضِ محمدؐ نے اُسے دکھلایا ۱۸ زعم میں اپنے گرا ، فرشِ زمیں پر آیا
شعلۂ بُغض بنا ، چار طرف لہرایا عظمتِ آدمِ خاکی پہ بہت جھنجھلایا

تُل گیا وقعتِ انساں کو گھٹانے کے لئے
اُٹھ پڑا ، نورِ ہدایت کو بجھانے کے لئے

باعثِ شرک بنا ، فسق کے پھیلے سائے ۱۹ گمرہی عام ہوئی ، کُفر کے بادل چھائے
مقتضی عدلِ الہٰی تھا کہ حُجّت جائے نوعِ انساں کی ہدایت کو پیمبر آئے

خود پرستی کا جو ابلیس نے سامان کیا
آدمؑ و نوحؑ نے توحید کا اعلان کیا

خضرؑ و الیاسؑ و ذکریا و عزیزؑ و یحییٰؑ ۲۰ یونسؑ و یوسفؑ و یعقوبؑ و شعیبؑ و موسیٰؑ
شیثؑ و ادریسؑ و سلیمانؑ و خلیلؑ و عیسیٰؑ لپنے وقتوں میں تھے پیغامبرِ دینِ ھدیٰ

پیکرِ خاک میں پھر نور ہدایت آئے
بعد میں حضرتِ سرتاجِ رسالت آئے

اے خوشابخت کہ سرکار زمیں پر آئے ۲۱ مرکزِ مطلعِ انوار زمیں پر آئے
سید و سرور و سردار زمیں پر آئے عرش کے مالک و مختار زمیں پر آئے

آئینہ کوثر و تسنیم کو دکھلاتی ہے
مئے توحید سے لبریز صبا آتی ہے

جس گھڑی عرش سے محبوبِ الہیٰ آئے ۲۲ زور باطل کا گھٹا ، حق کے علم لہرائے
تیرگی دور ہوئی ، نور کے جلوے چھائے روشنی پھیل گئی ، شمس و قمر شرمائے

فخر سے ارض کی گردن جو تنی جاتی ہے
اللہ اللہ کی گردوں سے صدا آتی ہے

دل نے چاہا کہ کروں شانِ محمدؐ کو رقم ۲۳ فکر مجہول ہوئی ، گر پڑا ہاتھوں سے قلم
کون کر سکتا ہے توصیفِ شہنشاہِ امم قاب قوسین کی منزل پہ گئے جس کے قدم

جس کو اللہ نے کونین کی شاہی دے دی
سنگریزوں نے نبوّت کی گواہی دے دی

وصفِ سرکارِ دو عالمؐ سے زباں قاصر ہے ۲۴ مدحِ ممدوحِ الہٰی سے جہاں قاصر ہے
فکر پر زور نہیں ، فکرِ رواں قاصر ہے کیا بیاں کوئی کرے زورِ بیاں قاصر ہے

فکرِ محدود کہاں ، تذکرۂ نور کہاں
ذاتِ مختار کہاں ، بندۂ مجبور کہاں

باعثِ عظمتِ انسان ، حضورِ انور ۲۵ وارثِ سورۂ عمران ، حضورِ انور
رونقِ تختِ سلیمانؑ ، حضورِ انور بخدا بولتا قرآن ، حضورِ انور

ایک بھی لفظ بجز وحیٔ الہٰی نہ کہا
منہ سے جو بات بھی نکلی ، ہوئی پیغامِ خدا

بخشا اللہ نے سرکارؐ کو رتبہ کیسا ۲۶ دے دیا حکم تو ڈوبا ہوا سورج پلٹا
شب معراج تھما ، وقت کا بہتا دھارا ہو گیا ایک اشارے سے قمر دو پارا

مرتبہ بڑھتا تھا ، پیغامِ خدا ، لاتے تھے
ان کے دربار میں جبریلِ امیں آتے تھے

اذن جب آپؐ کو تبلیغِ رسالت کا ملا ۲۷ نوعِ انساں کو ضلالت نے دبا رکھا تھا
کفر و الحاد کا چرچا تھا ، مکدّر تھی فضا ایسے ماحول میں اعلانِ نبوّت کا کیا

حق کا اعلان کیا ، حق کی اعانت چاہی
اس کی تائید محمدؐ نے علیؑ سے پائی

مومنو! ذکرِ علیؑ زیب قلم کرتا ہوں ۲۸ پڑھ کے میں نادِ علیؑ سینے پہ دَم کرتا ہوں
حق کا اعلان عبادت ہے رقم کرتا ہوں مدحِ ممدوحِ شہنشاہ اُمم کرتا ہوں

ایسا مولود کہ کعبے میں ولادت پائی
ایسا مسعود کہ آغوشِ رسالت پائی

تاجِ خاتونِ جناں، نفسِ پیمبرؐ ہیں علیؑ ۲۹ بحرِ انوارِ الہیٰ کے شناور ہیں علیؑ
دینِ اسلام کی شمشیر کا جوہر ہیں علیؑ موجِ کوثر کی قسم، ساقیٔ کوثر ہیں علیؑ

بات اژدر کی جو چھڑ جائے علیؑ حیدر ہیں
جنگ کا نام جو آ جائے علیؑ صفدر ہیں

کُلِّ ایمان علیؑ، صاحبِ قرآن علیؑ ۳۰ وجہِ ایقان علیؑ منبعِ عرفان علیؑ
حق نگہبانِ علیؑ، حق کے نگہبان علیؑ اِک محمدؐ کے فقط تابعِ فرمان علیؑ

ساتھ سائے کی طرح گِرد نبیؐ پروانہ
شمعِ توحید محمدؐ تو علیؑ پروانہ

لائقِ فخر و مباہات علیؑ کا کردار ۳۱ پاک قرآن کی آیات علیؑ کا کردار
مردِ مومن کی مناجات علیؑ کا کردار دینِ اسلام کا اثبات علیؑ کا کردار

حکم و احکامِ شریعت جو ادا کرتا ہے
اپنی مرضی اسے معبود عطا کرتا ہے

منبعِ عظمتِ اسرارِ نہاں علمِ علیؑ ۳۲ باعثِ لذّتِ گفتارِ رواں علمِ علیؑ
مصدر و مرکزِ انوارِ جہاں علمِ علیؑ مبدأ عظمتِ افکارِ جواں علمِ علیؑ
آپ کے باب میں سرکار دو عالم نے کہا
" شہر ہوں علم کا میں اور علیؑ دروازہ "

کارِ تبلیغِ رسالت میں علیؑ ساتھ رہے ۳۳ شبِ ہجرت کی عبادت میں علیؑ ساتھ رہے
بدر و خندق کی شجاعت میں علیؑ ساتھ رہے فتحِ خیبر کی بشارت میں علیؑ ساتھ رہے
اُٹھ گیا خانۂ کعبہ سے بُتوں کا سایہ
مرتبہ دوشِ محمدؐ پہ علیؑ نے پایا

جب چلی جنگ کے میداں میں علیؑ کی تلوار ۳۴ منتشر ہو گئیں اک دم میں صفوفِ کُفّار
نہ پیادہ نظر آتا تھا ، نہ مرکب نہ سوار ہر طرف حدِّ نظر تک تھے سروں کے انبار
اہلِ لشکر نہ رہے ، صاحبِ لشکر نہ رہے
ایسی تلوار چلی ، مرحب و عنتر نہ رہے

ایسے آقا کہ غلامی پہ تھے قنبرؓ نازاں ۳۵ فخر سلمانؓ کو تھا ، مالکِ اشترؓ نازاں
میثمؓ و یاسرؓ و مقدادؓ و اباذرؓ نازاں اور تو اور ہیں خود ذاتِ پیمبرؐ نازاں
خوش خدا ہو گیا ، سائل نے انگوٹھی پائی
ان کی تعریف میں قرآن کی آیت آئی

مقصدِ زیست فقط مرضیٔ مولا کا حصول ۳۶ تھی عجب شانِ علیؑ پیشِ رسولِؐ مقبول
اللہ اللہ یہ رتبہ کہ بنے نفسِ رسولؐ حکم خالق سے ملا مرتبۂ زوجِ بتول
سارے عالم کے شرف آلِ علیؑ نے پائے
اِن کے فرزند تو ، فرزندِ نبی کہلائے

جب بدلنے لگا دنیا میں نبیؐ کا پیغام ۳۷ فتنہ و شر نے کیا دینِ مبیں کو بدنام
جلوہ افروز ہوئے تختِ محمدؐ پہ امام تاکہ قائم رہیں دنیا میں اصولِ اسلام
ہوش باطل کے اُڑے ، ہو گیا سکتہ طاری
کر دیئے آتے ہی احکامِ شریعت جاری

جس کسی نے بھی تھے احکام شریعت بدلے ۳۸ ان کو موقوف کیا ، سارے وہ افسر بدلے
برطرف کر دئے حکّام ، گورنر بدلے سلطنت پاک کی ، چُن چُن کے ستمگر بدلے
حق کے اعلان سے تنظیمِ ریاست بدلی
کھل بلی مچ گئی ، باطل کی سیاست بدلی

حق و انصاف پہ مبنی جو تھے احکامِ علیؑ ۳۹ اہلِ اسلام کی ہر بات شریعت میں ڈھلی
دیں کا تابع ہوا ، ہر فعل خفی ہو کہ جلی کھل اٹھی گلشن اسلام کی ہر ایک کلی
پرتوِ نور لئے حق کا علم لہرایا
زورِ حق دیکھ کے باطل کو پسینہ آیا

عینِ قرآن کی تفسیر تھے احکامِ علیؑ ۴۰ باعثِ عظمتِ اسلام تھے پیغامِ علیؑ
اہلِ باطل کے لئے قہر تھی صمصام علیؑ تھے محبّوں کے لئے سورۂ انعام علیؑ
حق کا آئین ملا ، حق کے پرستاروں کو
جینا دوبھر ہوا ، دنیا کے طلبگاروں کو

حق و انصاف سے معمور ہوا جبکہ جہاں ۴۱ اہلِ باطل نے کیا سلسلۂ شر کو رواں
خندق و بدر سے تھے بُغضِ علیؑ دل میں نہاں جو کہ صِفّین و جمَل میں ہوئے دنیا پہ عیاں
سلسلے حق و صداقت کو مٹانے کے ہوئے
مشورے نورِ امامت کو بُجھانے کے ہوئے

قتلِ مولا پہ ہوئے سارے مخالف تیّار ۴۲ نہ رہیں حق کی حفاظت کو امامِ ابرار
ابنِ ملجم کو بنایا گیا اک آلۂ کار وہ چلا زہرِ ہلاہل میں بُجھا کر تلوار
ظلم ظالم نے بڑا ، بغض و عداوت میں کیا
وار تلوار کا محرابِ عبادت میں کیا

قبر میں گنبدِ خضرا کا مکیںؐ تھرّایا ۴۳ ہفت افلاک ہلے عرشِ بریں تھرایا
اشکِ خوں بہنے لگے ، قلب حزیں تھرّایا روشنی ختم ہوئی ، مہرِ مُبیں تھرایا
خونِ ناحق جو بہا ، کون و مکاں کانپ گئے
ظلم ظالم نے کیا ، ہر دو جہاں کانپ گئے

خوں کا دریا ہوا پیشانیٔ حضرت سے رواں ۴۴ زخم کاری لگا تھرآئے امامِ دو جہاں

دل پہ قابو نہیں، کس طرح کروں غم کا بیاں ضبطِ الفاظ میں آ سکتا نہیں دردِ نہاں

فرش پر گر پڑے مسجد کے، شہنشاہِ زمن

دل کو تھامے ہوئے روتے ہیں حسینؑ اور حسنؑ

جبکہ مسجد سے چلے گھر کو امامِ معصوم ۴۵ اشک خوں روتے تھے حسنینؑ بہ حالِ مغموم

ساتھ میں ہو لیا حضرت کے احبا کا ہجوم بولے اس وقت حسنؑ سے یہ امامِ مظلوم

بس نہ آگے بڑھیں، سب لوگ ٹھہر جائیں یہیں

وارثِ چادرِ زہراؑ نہ نکل آئیں کہیں

گھر میں پہنچے تو عجب حال اعزا کا ہوا ۴۶ بیبیاں رونے لگیں، ہو گیا، کہرام بپا

دیکھ کے حال یہ زینبؑ ہوئیں مصروف بکا ام کلثوم پکاریں مرے بابا! بابا

درد بڑھتا گیا، باقی نہ رہی تاب سخن

ضعف سے ہو گئے بے ہوش شہنشاہِ زمن

بعد کچھ وقفے کے جب ہوش میں آئے مولا ۴۷ ابنِ ملجم کو احبا نے گرفتار کیا

جسم میں جان نہ تھی، رنگ تھا چہرے کا اُڑا حال دشمن کا جو دیکھا، تو حسنؑ سے یہ کہا

حسنِ اخلاق زمانے کو دکھا دو بیٹا

جام شربت کا پیاسے کو پلا دو بیٹا

مندمل ہو نہ سکا، زخم تھا بے حد کاری ۴۸ ہو گیا چہرۂ اقدس سے پسینہ جاری
پوچھا پھر آپ نے ہر ایک کو باری باری رفتہ رفتہ ہوئی حضرت پہ غشی سی طاری
نوُر پردے میں گیا، ہو گیا خورشید نہاں
سوئے فردوس گئی روحِ امامِ دو جہاں

غم سے بے جان ہوئیں زینب و اُمِّ کلثوم ۴۹ مثلِ تصویر تھے حسنینؑ بہ حالِ مغموم
یک بیک ٹوٹ پڑا، کیسا مصائب کا ہجوم قتل کے روز تھے روزے سے امامِ مظلوم
اشک تھمتے نہیں، اک خون کا دریا ہے رواں
بھوکے، پیاسے گئے دنیا سے امامِ دو جہاں

ماجرا شہ کی شہادت کا کروں کیسے رقم ۵۰ سینہ شق ہو گیا چلتا نہیں کاغذ پہ قلم
اُٹھ گئے گلشنِ ہستی سے شہنشاہِ اُمم سرِ افلاک فرشتوں میں بپا ہے ماتم
بجھ گیا سلطنتِ علم و ہدایت کا کنول
آج رخصت ہوا دنیا سے اِمامِ اوّل

امداد میری صاحبِ معراج کرے
بخشش کی دعا دین کا سرتاج کرے
آغاؔ یہ تمنا ہے مری جیتے جی
اللہ نہ محتاجوں کا محتاج کرے

مرثیہ نمبر۲

مطلعِ فکر ہے ایماں کی ضیاء سے روشن

مطلعِ فکر ہے ایماں کی ضیا سے روشن ۱ شیشۂ قلب ہے ایقاں کی جِلا سے روشن
دیدۂ چشم ہے عرفاں کی فضا سے روشن چشمۂ روح ہے قرآں کی ہوا سے روشن
ذکرِ معبودِ حقیقی سے زباں روشن ہے
جودتِ فکر سے اندازِ بیاں روشن ہے

لائقِ حمد و ثنا ذاتِ خداوندِ کریم ۲ خالقِ ارض و سما ، رازق و رحمن و رحیم
منعم و ربِّ عُلا ، قادر و قدّوس و قدیم مالکِ روز جزا ، عادل و اعلیٰ و عظیم
نور کی اس کے ہر اک سمت فراوانی ہے
ذات ہے اس کی احد ، واحد و لاثانی ہے

ہاں مگر ذات الہیٰ کا سمجھنا ہے محال ۳ عقل مجبور ہے ، محدود ہے انساں کا کمال
فکر کیا چیز ہے ، اک دائرۂ وہم و خیال ذہن پا جائے اسے ، یہ کہاں انساں کی مجال
چشمِ موسیٰ نے کہاں طور کا جلوہ دیکھا ؟
اور ہی نور تھا ، جس نور کا جلوہ دیکھا

فکر کا ساتھ نہ دیتی تھی مری طبعِ رسا ۴ یک بیک آئی مجھے ہاتفِ غیبی کی ندا
کلمۂ پاک کے الفاظ یہ دیتے ہیں صدا کوئی معبود زمانے میں نہیں اُس کے سوا

نکہتِ گل سے معطر جو صبا آتی ہے
حمد و تسبیح کی ذرّوں سے صدا آتی ہے

بعدِ معبود، محمدؐ ہیں جہاں سے افضل ۵ شافعِ روزِ جزا، عبد و نبی و مرسل
وجہِ تخلیقِ جہاں، منبعِ اسباب و علل کلمۂ پاک کا جزُ، نورِ مُبین اوّل

ذاتِ مخفی کا جو ظاہر نہ خزانہ ہوتا
ہفت افلاک نہ ہوتے، نہ زمانہ ہوتا

جب زمانے کو ہوئی مدحِ محمدؐ کی خبر ۶ عرش نے بڑھ کے نچھاور کیئے تاروں کے گہر
سر جھکائے ہوئے مجرے کو بڑھے شمس و قمر بہرِ تسلیم نمودار ہوا نورِ سحر

جذبۂ عشق بڑھا، اوجِ فلک پر چھایا
داد دینے کے لئے مجھ کو عطارد آیا

موجۂ عطر لئے آئی گلستاں سے صبا ۷ پیشوائی کو بڑھی خاک کے ذرّوں کی ضیا
بے کلی حد سے بڑھی ضبط کا یارا نہ رہا چھوڑ کے تختِ سلیماں کو چلی آئی ہوا

برکتیں عرش سے رحمت کا فرشتہ لایا
جامِ کوثر مری قسمت کا نوشتہ لایا

باعثِ عظمتِ تحریر ہے ، جامِ کوثر ۸ ندرتِ فکر کی ، تنویر ہے جامِ کوثر
مصحفِ عشق کی تفسیر ہے جامِ کوثر مرثیہ لکھنے کی تدبیر ہے جامِ کوثر

زینتِ فرش بنا ، گل کی قبا کا دامن
سر پہ سائے کو بڑھا آلِ عبا کا دامن

پرفشاں جوش عقیدت میں ہے طاوسِ سخن ۹ نعرہ زن فرطِ مودت سے ہیں مرغانِ چمن
سورۂ دہر ہوا وردِ زبانِ سوسَن بربطِ نُطق بنا موجِ صبا کا دامن

گفتگو ہوتی ہے شبیرؑ کے پروانوں سے
داد ملتی ہے مجھے شہ کے ثنا خوانوں سے

اہلِ مجلس میں ہوا تذکرۂ شعر و سخن ۱۰ باادب ہو کے بڑھا ولولۂ شعر و سخن
سرِ افلاک گیا غلغلۂ شعر و سخن گرمیٔ بزم بنا طنطنۂ شعر و سخن

زورِ تقریر سے لفظوں میں روانی آئی
ذکرِ سرکارؑ سے اعجاز بیانی آئی

وسعتِ فکر و نظر ، زمزمۂ شعر و سخن ۱۱ لذّتِ قلب و جگر ، زمزمۂ شعر و سخن
معدنِ لعل و گہر ، زمزمۂ شعر و سخن مخزنِ علم و ہنر ، زمزمۂ شعر و سخن

حدّتِ فکر سے جب قلب پگھل جاتا ہے
جذبۂ سوزِ دروں شعر میں ڈھل جاتا ہے

رکنِ ایوانِ سلاست ہے مرا طرزِ سخن ۱۲ مصدرِ نورِ فصاحت ہے مرا طرزِ سخن
شمع حسن بلاغت ہے مرا طرزِ سخن گوہرِ تاجِ عبارت ہے، مرا طرزِ سخن
قصرِ اقلیمِ سخن، شاہ کی شاہی سے ملا
جو ملا مجھ کو وہ توفیق الٰہی سے ملا

فرشِ مجلس کی ہے مرہون، زبانِ اردو ۱۳ غمِ شبیرؑ بنا روحِ روانِ اردو
نامِ مولا سے بڑھا، نام و نشانِ اردو شعلۂ طور ہوا، زورِ بیانِ اردو
گوشۂ بزمِ عزا، باعثِ اعجاز ہوا
ماتمِ سبطِ نبیؐ، نقطۂ آغاز ہوا

جبکہ طے اس نے کیے علم و ادب کے میداں ۱۴ بات ہونے لگی سرچشمۂ اُردو ہے کہاں
اہلِ تحقیق کی کاوش سے ہوا سب پہ عیاں سرفہرست ہے وہ مجلسِ فضلی کا بیاں
پرورش پاتی رہی ذوقِ حق آگاہی میں
خوب پروان چڑھی دورِ قطب شاہی میں

یوں تو اُردو میں ہے موجود، ہر اک صنفِ سخن ۱۵ چار اطراف میں نکھرا ہے رباعی کا چمن
گل و بلبل سے ہے بھرپور غزل کا دامن زینتِ دامنِ اردو ہے قصیدے کی پھبن
مثنوی قوتِ تخیل کا ہے حُسنِ عمل
ہاں مگر مرثیہ تخلیق کا ہے تاج محل

مرثیہ شدتِ افکار کا بہتا دریا ۱۶ مرثیہ عظمتِ افکار کا بہتا دریا
مرثیہ شوکتِ افکار کا بہتا دریا مرثیہ نُدرتِ افکار کا بہتا دریا

مثنوی ہو کہ قصیدہ کہ رباعی کہ غزل
مرثیہ نظم کی اصناف میں سب سے افضل

مرثیہ حُسنِ خیالات میں سب سے افضل ۱۷ مرثیہ شدّتِ جذبات میں سب سے افضل
مرثیہ حمد و مناجات میں سب سے افضل مرثیہ فن کی روایات میں سب سے افضل

مدحتِ آلِ محمدؐ کا وظیفہ کہیے
ذکرِ سرکارِ دو عالم کا صحیفہ کہیے

اپنے مقصد کی طرف مجھ کو صبا لاتی ہے ۱۸ ذکر و افکار کی مجلس میں بہار آتی ہے
اوج کس درجہ مری طبع رسا پاتی ہے عرش پر آنکھ ثریّا سے لڑی جاتی ہے

ہر طرف حُسن ہے، اک عالمِ رعنائی ہے
روشنی خاک کے ذرّوں میں سمٹ آئی ہے

مدحِ ممدوحِ الہیٰ سے زباں روشن ہے ۱۹ چشم روشن ہے، مری طبعِ رواں روشن ہے
پرتوِ حُسن سے اندازِ بیاں روشن ہے جلوۂ طور ہے یا قلبِ نہاں روشن ہے

نورِ اوّل کی جو لفظوں میں جھلک پاتی ہے
مشتری چاند کے پہلو میں چھپی جاتی ہے

مصدرِ نور ہوئی مدحِ محمدؐ میں زباں ۲۰ ذکرِ سرکارؐ دو عالم سے بڑھا حُسنِ بیاں

بربطِ نطق پہ آنے لگے افکار نہاں ساغرِ دل سے چھلکنے لگا [illegible]

جذبۂ عشق مرا ، نیّرِ دیں تک پہونچا

نعرۂ صلی علیٰ عرشِ بریں تک پہونچا

باعثِ عظمتِ کونین ہے حضرتؐ کا ظہور ۲۱ روز و شب آتے تھے جبریلِ امیں جنکے حُضور

ماہ و خورشید کہاں اور کہاں پیکرِ نور ہے فقط بحثِ عبث تذکرۂ جلوۂ طور

حضرتِ یوسفؑ کنعاں میں جو زیبائی تھی

نورِ سرکارؐ دو عالم کی جھلک پائی تھی

نوُر سے جس کے منوّر تھی جبینِ آدمؑ ۲۲ ذکر سے جس کے چلا سلسلۂ لوح و قلم

جس کے قدموں کی ضیا، حُسنِ بساطِ عالم جس کی ہستی ہوئی عالم کے لئے ابرِ کرم

جس کے صدقے میں ضیا نورِ سحر نے پائی

جس کے پرتو سے چمک شمس و قمر نے پائی

وصفِ سرکارؐ دو عالم سے کھلی دل کی کلی ۲۳ آشکارا ہوئے سب راز خفی ہوں کہ جلی

موجۂ فکرِ رسا ، نور کے سانچے میں ڈھلی یک بیک آگیا ہونٹوں پہ مرے نامِ علیؑ

بعدِ تکمیلِ نبوّت جو امامت آئی

پرورش کے لئے پہلے سے نبوّت آئی

مظہرِ ختمِ رسل ، نفسِ پیمبرؑ ہیں علیؑ ۲۴ زینتِ بزمِ عمل ، رونقِ ممبر ہیں علیؑ
سطوتِ کشورِ حق ، فاتحِ خیبر ہیں علیؑ بازوئے مصطفوی ، قوتِ داور ہیں علیؑ

آپ کے واسطے سرکارؐ یہ فرماتے ہیں
" حق اُدھر جاتا ہے جس سمت علیؑ جاتے ہیں "

شاہِ ابرار علیؑ ، سیّد و سردار علیؑ ۲۵ دیں کی تلوار علیؑ ، قاتلِ کفّار علیؑ
غیرِ فرّار علیؑ ، حیدرِ کرّار علیؑ حق طلبگارِ علیؑ ، حق کے طلبگار علیؑ

حکمِ سردارؐ دو عالم ہے علیؑ اولیٰ ہیں
" جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علیؑ مولیٰ ہیں

مردِ مومن کے لئے ذاتِ علیؑ مہرِ مُبیں ۲۶ مردِ مومن کے لئے ذات علیؑ نیّرِ دیں
مردِ مومن کے لئے ذات علیؑ حبلِ متیں مردِ مومن کے لئے ذاتِ علیؑ عزم و یقیں

سرِ میدانِ وغا ، نام سے دل بڑھتے ہیں
استقامت کے لئے نادِ علیؑ پڑھتے ہیں

زندگی ، خوفِ الہٰی میں ہوئی ساری بسر ۲۷ عمر بھر حق کی حفاظت میں رہے سینہ سپر
مثل سائے کے رہے گردِ حضورؐ انور ہر نفس مرضئ معبود رہی پیشِ نظر

جب کبھی نام محمدؐ کا لیا جاتا ہے
خودبخود نامِ علیؑ ساتھ میں آ جاتا ہے

رونق دینِ مُبیں ، سطوتِ اسلام علیؑ ۲۸ باعثِ عزم و یقیں ، شوکتِ اسلام علیؑ
دولتِ حق کے امیں ، حشمتِ اسلام علیؑ دینِ احمدؐ کے معیں ، عظمتِ اسلام علیؑ

منزلت ان کے سبب دین مُبیں نے پائی
جب پڑا وقت تو اولادِ علیؑ کام آئی

جبکہ اسلام کی تذلیل ہوئی برسر عام ۲۹ اور ہونے لگا پامال شریعت کا نظام
مسخ ہونے لگے عالم میں اصولِ اسلام فسق نے کر دیا پیغامِ نبیؐ کو بدنام

دیکھ کے رنگِ سیاست کو حسینؑ ابن علیؑ
اُٹھ پڑے حق کی حفاظت کو حسینؑ ابن علیؑ

جانِ خاتونِ جناں ، جانِ پیمبر ہیں حسینؑ ۳۰ وارثِ شیرِ خدا ، ثانیٔ حیدر ہیں حسینؑ
حُسنِ اخلاقِ حَسن ، قوت شبّر ہیں حسینؑ عظمتِ نوعِ بشر ، ہادی و رہبر ہیں حسینؑ

بڑھ گیا اِن کے سبب حُسنِ قبولِ اسلام
اِن سے قائم رہے دنیا میں اصولِ اسلام

اہلِ ایماں کے لئے قوّتِ ایمان حسینؑ ۳۱ اہل تقویٰ کے لئے باعثِ ایقان حسینؑ
اہلِ عرفاں کے لئے مرکزِ عرفان حسینؑ اہلِ قرآں کے لئے بولتا قرآن حسینؑ

آپ تفسیر بنے آیت قرآنی کی
جان کی ، مال کی ثمرات کی قربانی کی

سالکِ راہِ رضا ، عزم کا پیکر ہیں حسینؑ ۳۲ راکبِ دوشِ نبیؐ مہرِ منوّر ہیں حسینؑ
مالکِ باغِ جناں ، سبطِ پیمبرؐ ہیں حسینؑ مظہرِ نورِ خدا طاہر و اطہر ہیں حسینؑ

آپ آئے تو سند بہرِ نبوت آئی
آل کی شان میں تطہیر کی آیت آئی

اک نئے رنگ سے قائم کیا عنوانِ جہاد ۳۳ عقل حیران ہے کیسے کیا اعلانِ جہاد
منفرد سارے زمانے سے تھا سامانِ جہاد ساتھ میں اُن کو لیا جنکو تھا ارمانِ جہاد

نصرتِ حق کے لئے آلِ پیمبرؐ کو لیا
جنگ کرنے کے لئے اکبرؑ و اصغرؑ کو لیا

ساتھ میں حضرتِ عباسِ دلاور کو لیا ۳۴ عون و جعفر کو لیا، دلبر شبرؑ کو لیا
باغ اسلام کے اک ایک گل تر کو لیا بہر تکمیلِ مہم ، ساتھ میں خواہر کو لیا

غازۂ حسن عمل چہرۂ اقدس پہ ملے
رونق شہر لئے شاہ مدینے سے چلے

کان میں آتی رہی دیر تلک ایک صدا ۳۵ ہائے اکبرؑ بھی گئے ، ہو گئے اصغرؑ بھی جدا
رہ گئی روتی ہوئی فاطمہ صغرا تنہا دیکھئے آتے ہیں کب پھر کے وطن میں بابا

نالے بیمار کے ، کانوں سے جو ٹکراتے تھے
ہوک اٹھتی تھی کلیجے میں ، لرز جاتے تھے

آ کے مکے میں کیا جب شہِ والا نے قیام ۳۶ حق کی امداد کے آنے لگے کوفے سے پیام
اُن کی نصرت کی حقیقت کو سمجھتے تھے امام بھیجا مسلم کو اُدھر ، ہو گئی حجت بھی تمام

حج کو عمرے میں بدل کر شہ ابرار چلے
نور کعبے کا لئے سیّد و سردار چلے

کیا بیاں کوئی کرے شہ کی قیادت کا اثر ۳۷ حق کو سینے سے لگائے تھا حسینی لشکر
کچھ نہ تکلیف کا احساس نہ مرنے کا خطر تھی فقط مرضئ معبودِ حقیقی پہ نظر

حُسنِ اخلاص سے افکار میں یکتائی تھی
سب نے مولا کی رفاقت کی قسم کھائی تھی

سرخ رو ، شوق شہادت سے تھا ہر پیر و جواں ۳۸ روشنی حق و صداقت کی تھی چہروں سے عیاں
اُن کے اعمال تھے آئینہ جذبات نہاں مثل پروانوں کے تھے گردِ شہنشاہ زماں

خونِ ناحق جو بہا ، دولتِ عقبیٰ پائی
سرفروشی کی جزا مرضئ مولا پائی

روزِ عاشور عجب وقت قیامت کا پڑا ۳۹ لُٹ گیا عصر تلک قافلۂ شاہِ ہدیٰ
جان اک ایک نے دی کوئی بھی باقی نہ رہا جنگ کرنے کے لئے رہ گئے سرور تنہا

صبر کرتے تھے بڑا ، جبکہ جلال آتا تھا
اُمتِ جد کی تباہی کا خیال آتا تھا

رن میں تنہا تھے کھڑے بادشہ عرش مقام ۴۰ نہ اعزا تھے نہ انصار ، نہ یاور نہ غلام
تھی فقط فوجِ عدو گردِ شہنشاہ انام کوئی اپنا نہ تھا موجود اکیلے تھے امام

سامنے خاک پہ تھا ، نورِ نظر کا لاشہ
جلتی ریتی پہ تھا ، اکبرؑ سے پسر کا لاشہ

باوجود اس کے نہ تھی چہرۂ اقدس پہ شکن ۴۱ دل کے ٹکڑے تھے پڑے سامنے بے گور و کفن
منتشر خاک پہ تھا فاطمہ زہرا کا چمن مطمئن قلب تھا ، تھی حق کی حمایت کی لگن

مظہر ذات خدا ثانیٔ حیدرؑ تھے حسینؑ
عزم کا کوہِ گراں ، صبر کا پیکر تھے حسینؑ

تیر آئے تو کیا فوجِ مخالف سے کلام ۴۲ مجھ سے پرخاش ہے کیا اے سپہِ کوفہ و شام
حق پرستوں پہ کئے جور زمانے کے تمام رکھ دیئے تم نے پس پشت اصولِ اسلام

کیا عجب اَجر محمدؐ کی رسالت کا دیا
آل کو اُن کی مودت کے عوض قتل کیا

آخری بار سناتا ہوں تمہیں حق کا پیام ۴۳ پیش کرتا ہوں محمدؐ کی شریعت کا نظام
پھر بتاتا ہوں تمہیں اصلِ اصولِ اسلام فرض ہے نصرتِ حق سب پہ پکارے جو امام

راہ پر اب بھی جو آ جاؤ بہل ہو تقصیر
درگزر خون سے اِن سب کے کرے گا شبیرؑ

سن کے حضرت کے یہ الفاظ ہنسے بانئ شر ۴۴ مہر تھی دل پہ لگی ، کچھ نہ ہوا اُن پہ اثر
بولے ہم کو نہیں کچھ دینِ محمدؐ کی خبر آپ کا خون بہانے پہ تُلا ہے لشکر
حق کسے کہتے ہیں ، ہم حق کے طلبگار نہیں
دینِ اسلام ہے کیا ہم کو سروکار نہیں

سرکشی دیکھ کے اعدا کی یہ سرور نے کہا ۴۵ حد سے آگے نہ بڑھو ، کچھ تو کرو خوف خدا
موجبِ قہرِ الہیٰ نہ بنے ، ظلم و جفا اس سے ہوتا نہیں کچھ ، تم کو خسارے کے سوا
وارثِ شیرِ خدا ، حیدرِ کرّار ہوں میں
موت کا خوف ہے کیا حق کا طلبگار ہوں میں

امتیاز حق و باطل کا نہیں تم کو شعور ۴۶ بس سمجھ رکھا ہے تم نے ہمیں بے بس مجبور
ہم تو ہیں تابعِ فرمانِ خداوندِ غفور سرِ تسلیم ہے خم اس کی مشیّت کے حضور
ورنہ دریا سے بھلا ہم کہیں ہٹ سکتے تھے
میرے عباس کے بازو کہیں کٹ سکتے تھے

ہائے عباس کہ جس کو نہ ملا اذنِ وغا ۴۷ ورنہ میدان کا کچھ اور ہی ہوتا نقشہ
وہ شجاعت میں علیؑ ابن ابی طالب تھا رن میں پانی کے عوض ، خون کا دریا بہتا
مرضئ حق کو لئے حق کا طلبگار گیا
دل میں ارمان لئے میرا علمدار گیا

یاد تو ہو گا تمہیں بدر و احد کا میداں ۴۸ زعم میں طاقت و کثرت کے تم آئے تھے جہاں
جب چلی حیدرِ کرّار کی تیغِ براں ۔ ایسے بھاگے تھے کہ ملتا نہ تھا قدموں کا نشاں

پھر وہی زورِ یداللہ دکھاتا ہے حسینؑ
لو ! چلو ! آؤ کہ میدان میں آتا ہے حسینؑ

یا علیؑ کہہ کے ، کیا فوج پہ حملہ اک بار ۴۹ بن گئی قہرِ خدا ، ابنِ علیؑ کی تلوار
سامنے آ کے بچا کوئی نہ پیدل نہ سوار ہر طرف کشتوں کے پشتے تھے ، سروں کے انبار

شور اُٹھا ، سپہِ شام کی شامت آئی
آسماں چیخ پڑا ، رن میں قیامت آئی

خوف سے ہو گیا میدانِ وغا زیر و زبر ۵۰ شہ کی تلوار سے کٹ کٹ کے گرے بانی شر
تن گرا ایک طرف ، ایک طرف کاسۂ سر خوں کا دریا تھا رواں بھاگ رہا تھا لشکر

شور تھا نوحؑ کے طوفاں کی نشانی دیکھو
سر سے اونچا ہوا تلوار کا پانی دیکھو

ابتری پھیل گئی رن سے ستمگر بھاگے ۵۱ کھل بلی مچ گئی کفّار کے لشکر بھاگے
جاں بچانے کے لئے ظلم کے خُوگر بھاگے منتشر چھوڑ کے افواج کو ، افسر بھاگے

اپنی فوجوں کو کچلتے ہوئے اسوار گئے
پھینک کے تیر و کماں ، رن سے کماندار گئے

پیش مولا تھا مگر وعدہ طفلی کا خیال ۵۲ یاد نانا کو کیا، تھم گیا حضرت کا جلال
خون زخموں سے بہا، ہو گئے سرکار نڈھال جلتی ریتی پہ گرے شاہ زمن وقتِ زوال

سایۂ ظلمِ عدو، نیّرِ دیں پر آیا
راکبِ دوشِ نبیؐ، فرشِ زمیں پر آیا

حال یہ دیکھ کے بھاگے ہوئے لشکر پلٹے ۵۳ جان لینے کے لئے ظلم کے خوگر پلٹے
تیر و خنجر لئے ہاتھوں میں ستمگر پلٹے منتشر فوج کے بھاگے ہوئے افسر پلٹے

گھر گئے پھر شہِ ابرار ستمگاروں میں
چھپ گیا مہرِ مبیں شام کی تلواروں میں

تھے جو مصروف، عبادت میں شہِ جنّ و بشر ۵۴ تیر مارا کسی ظالم نے کسی نے پتھر
گر پڑے خاک پہ تیورا کے حضورِ انور عصر کا وقت تھا، سجدے میں گیا آپکا سر

فرضِ طاعت کو ادا، وقتِ قضا کرتے تھے
ساتھ میں بخششِ اُمتّ کی دعا کرتے تھے

روح فرسا تھا عجب دشت بلا کا منظر ۵۵ اک طرف بیکس و مجبور علیؑ کی دختر
اک طرف چُور تھا زخموں سے محمدؐ کا پسر ناگہاں خوں میں بھرا شمرِ شقی کا خنجر

بھوکے پیاسے نے جو معراجِ عبادت پائی
آندھیاں سُرخ اُٹھیں شہ نے شہادت پائی

کر دیا سید لولاکؐ کے پیارے کو شہید ۵۶ کر دیا فاطمہؑ کی آنکھ کے تارے کو شہید
کر دیا حیدر و صفدر کے دُلارے کو شہید کر دیا زینبؑ بیکس کے سہارے کو شہید
خاک اُڑاتی تھی زمیں ، چشمِ فلک گریاں تھی
لاش شبیر کی ، پامالِ سُمِ اسپاں تھی

بے سہارا جو ہوئیں زینبؑ و اُمِّ کلثوم ۵۷ یادِ خالق میں تھیں مصروف بہ حالِ مغموم
جابجا چھپ گئے سہمے ہوئے بچے معصوم جانبِ خیمہ بڑھا فوج مخالف کا ہجوم
دولتِ فاطمہ و حیدر کرارِ لُٹی
آگ خیموں میں لگی عترتِ اطہار لُٹی

ظلم پر اپنے تھا مسرور یزیدی لشکر ۵۸ لوٹنے کے لئے خیموں کو بڑھے بانیٔ شر
چھین لی زینبِ مظلوم کے سر سے چادر شمر نے نوچ لئے بالی سکینہ کے گہر
شور تھا ، آلِ محمدؐ کا گھرانا لُوٹو
دینِ اسلام کے بانیؑ کا خزانہ لُوٹا

اے قلم صبر کہ لکھنے کی نہیں تاب و تواں ۵۹ جابجا دامن قرطاس سے اُٹھتا ہے دھواں
مومنوں کے لئے کافی ہے شہادت کا بیاں اشک آغاؔ کے نہیں ، بحرِ مؤدت ہے رواں
منزلت اور بھی کچھ طبع رسا پائے گی
عاقبت مرثیہ کہنے سے سنور جائے گی

مرثیہ نمبر ۳

فکر کی ارض و سماوات میں جولانی ہے

فکر کی ارض و سماوات میں جولانی ہے ۱ شیشۂ دل کی رجلا قوتِ ایمانی ہے
قلزمِ حسنِ خیالات میں طغیانی ہے رب اکبر کی عنایات میں ارزانی ہے
دستِ خامہ میں نیا رنگِ حنا بھرتا ہوں
دینِ اسلام کو عنوانِ بیاں کرتا ہوں

دینِ اسلام ہے سرچشمۂ فیضِ یزداں ۲ دینِ اسلام ہے احکامِ الٰہی کا بیاں
دینِ اسلام ہے دستورِ حیاتِ انساں دینِ اسلام ہے انساں کے عمل کا میزاں
نوعِ انساں کو ہدایت کا یہ پروانہ ہے
امتیازِ حق و باطل کا یہ پیمانہ ہے

دینِ اسلام ہے توحید و عدالت کا بیاں ۳ دینِ اسلام ہے پیغام و نبوّت کا بیاں
دینِ اسلام ہے ایمان و امامت کا بیاں دینِ اسلام ہے قرآن و قیامت کا بیاں
نوعِ انساں کو ہے پیغامِ رسولِؐ اسلام
پانچ ارکان پہ مبنی ہیں اصولِ اسلام

پہلے توحید کہ اللہ نہیں اس کے سوا ۴ دوسرے عدل کہ عادل ہے وہ ذاتِ یکتا
پھر نبوت کہ نبی لائے ہیں پیغامِ خدا اور اِمامت کہ حفاظت میں رہے دینِ ہدیٰ
پانچواں رُکن ہے ، اقرارِ قیامت کرنا
پھر شریعت پہ عمل کر کے عبادت کرنا

حق کا پیغام زمانے میں نبی لاتا ہے ۵ دیں کے احکام زمانے میں نبی لاتا ہے
لطف و اکرام زمانے میں نبی لاتا ہے فضل و انعام زمانے میں نبی لاتا ہے
بندۂ خاص ہے ، معصوم و امیں ہوتا ہے
ہر نبی آئینۂ نورِ مُبیں ہوتا ہے

سارے نبیوں کے ہیں سرتاج حضورِ انور ۶ دینِ اسلام کی تکمیل ہوئی ہے جن پر
ربِّ اکبر نے عطا کر دیا جن کو کوثر آلِ اطہار بڑھی ، ہو گئے دشمن ابتر
فرض ہے آلِ محمدؐ سے محبّت کرنا
اجرِ تبلیغِ رسالت ہے ، مودّت کرنا

مدحتِ آلِ محمدؐ ہوئی ، عنوانِ سخن ۷ نوکِ خامہ بنی صد رشکِ زبانِ سوسن
ہمہ تن گوش ہوئے زمزمہ پردازِ چمن قلبِ مومن میں ہوئی شمعِ مودّت روشن
سامنے مصحفِ ناطق کے وَرَق روشن ہیں
اہلِ ایماں کے لئے چودہ طبق روشن ہیں

نور سینے میں لئے کلکِ طرحدار چلا ۸ سر عقیدت سے جھکائے ہوئے زوّار چلا
صبحِ صداق کو لئے مطلعِ انوار چلا دُرفشانی کے لئے ابرِ گہر بار چلا

شب معراج نے لکھنے کو سیاہی دے دی
سنگِ اسود نے امامت کی گواہی دے دی

بربطِ نُطق پہ جذبات اُبھر کر آئے ۹ چشمۂ روح سے نغمات اُبھر کر آئے
ساغرِ دل سے خیالات اُبھر کر آئے مرثیہ لکھنے کے لمحات اُبھر کر آئے

زورِ تحریر جو چٹکی میں سمٹ کر آیا
معجزہ دیکھنے خورشید پلٹ کر آیا

مرثیہ معجزۂ فن ہے بہ فیضِ یزداں ۱۰ جابجا اس میں ہے آیاتِ الٰہی کا بیاں
حُسنِ انداز پہ نقاشیٔ مانی قرباں نقطے نقطے پہ ہے ترشے ہوئے ہیروں کا گماں

مرتبہ کیسا مجھے میرے سخن نے بخشا
قصرِ فردوسِ بریں، شاہِ زمن نے بخشا

تھی تمنائے دلی مرضیٔ مولا کا حصول ۱۱ دل سے نکلی تھی دعا ہو گئی آخر مقبول
فکرِ پاکیزہ پہ ہونے لگا رحمت، کا نزول حُسنِ تخئیل بنا، تذکرۂ آلِ رسولؐ

زیرِ لب فن کی سند، ماہرِ فن دیتے ہیں
ہو کے خوش اہلِ سخن، دادِ سخن دیتے ہیں

اہلِ مجلس میں ہوا تذکرۂ آلِ عبا ۱۲ مطلعِ روزِ ازل آئینۂ حُسن بنا
بارشِ نور ہوئی ہو گئی معمور فضا برکتیں ساتھ لئے سلسلۂ نور چلا

گل عقیدت کے کھلے بادِ بہاری آئی
قائمِ آلِ محمدؐ کی سواری آئی

عرش و کرسی سے سوا مرتبۂ آلِ عبا ۱۳ جن کو خالق نے کیا طیّب و طاہر پیدا
کوئی بھی امر بجز حکمِ الہیٰ نہ کیا اپنے نفسوں کو جو بیچا تو ملی حق کی رضا

برکتیں عام ہیں، نعمات کی فیاضی ہے
یہ جو راضی ہیں بشر سے تو خدا راضی ہے

وارثِ علم نبیؐ، عکسِ صفاتِ یزداں ۱۴ رونقِ صبحِ ازل، موجۂ نورِ ایماں
مبداء فیضِ خدا، واقفِ اسرارِ نہاں شارحِ دینِ مُبیں، نطقِ حدیث و قرآں

بحرِ حیرت میں زمانے کو ڈبو دیتے ہیں
ایک نقطے میں یہ قرآن سمو دیتے ہیں

ان کے دامن سے ہے وابستہ رضائے معبود ۱۵ حکمِ خالق سے یہ شاہد ہیں زمانہ مشہود
ان کی توقیر ہے کس درجہ خدا کو مقصود جزوِ ایمان ہوا، آلِ محمدؐ پہ درود

عاقبت بنتی ہے، دنیا بھی سنور جاتی ہے
زندگی اِن کے تمسّک سے نکھر آتی ہے

زینتِ منبر و محرابِ عبادت ہیں یہی ۱۶ حاملِ روشنیٔ عرشِ ولایت ہیں یہی
وارثِ سلطنتِ علمِ امامت ہیں یہی جانشینِ شہِ سرکارِ رسالت ہیں یہی

شاہدِ کون و مکاں ، نیرِ دیں کہتے ہیں
اہلِ ایمان انہیں نُورِ مُبیں کہتے ہیں

مردِ میداں ہیں یہی ، شاہِ شہیداں ہیں یہی ۱۷ دین و ایمان ہیں یہی صاحبِ ایماں ہیں یہی
کلمۂ حق ہیں یہی ، حق کے نگہباں ہیں یہی نوکِ نیزہ کی قسم بولتا قرآں ہیں یہی

حق کی تائید میں کافی ہے شہادت انکی
بخشوائیگی سرِ حشر امامت اِن کی

اِن کو ورثے میں ملا حق و صداق کا پیام ۱۸ ہیں یہی صاحبِ حق بعدِ رسولؐ اسلام
اِن کے اعمال کا آئینہ شریعت کا نظام مقتدی سارا زمانہ ، یہ زمانے کے اِمام

نوعِ انساں کو اگر حق کی طلبگاری ہے
الفتِ آلِ عبا ، شرطِ وفاداری ہے

باعثِ عظمتِ انساں ہے وفا کا جوہر ۱۹ موجبِ سطوتِ انساں ہے وفا کا جوہر
مظہرِ قوتِ انساں ہے وفا کا جوہر زینۂ رفعتِ انساں ہے وفا کا جوہر

نام مٹ جاتا ہے ، دنیا سے جہانداروں کا
ہاں مگر تذکرہ رہتا ہے وفاداروں کا

حاملِ رایتِ اقلیمِ وفا ہیں عباسؑ ۲۰ باعثِ تقویتِ فوجِ خدا ہیں عباسؑ
پیکرِ طاعت و تسلیم و رضا ہیں عباسؑ رونقِ سلطنتِ دینِ ہدیٰ ہیں عباسؑ
ہے جو شانے پہ علَم ، غالبِ کُل غالب کا
ورثہ پایا ہے علیؑ ابن ابی طالب کا

قوتِ بازوئے شبیرؑ جنابِ عباسؑ ۲۱ نازشِ زینبِؑ دلگیر جنابِ عباسؑ
ہاشمی خون کی تنویر جنابِ عباسؑ آلِ عمران کی تفسیر جنابِ عباسؑ
جوہرِ خاص وراثت میں چلے آئے ہیں
جُز امامت کے ، کل اوصاف علیؑ پائے ہیں

مرکزِ حق و صداقت ہیں جنابِ عباسؑ ۲۲ محورِ عزم و شجاعت ہیں جنابِ عباسؑ
واقفِ رمزِ اطاعت ہیں جنابِ عباسؑ سایۂ حُسنِ امامت ہیں جنابِ عباسؑ
یاد کس طرح سے معصوم نے فرمایا ہے
عبدِ صالح کا زیارت میں لقب آیا ہے

مظہرِ حیدرِ کرّار جنابِ عباسؑ ۲۳ ثانیٔ جعفرِ طیّار جنابِ عباسؑ
پسرِ سیّدِ ابرار جنابِ عباسؑ لشکرِ حق کے علمدار جنابِ عباسؑ
حق ادا کر دیا شبیرؑ کی غمخواری کا
آج تک نام ہے دنیا میں علمداری کا

روزِ اوّل جو محمدؐ نے سجایا تھا علَم ۲۴ رونقِ دینِ مبیں بن کے جو آیا تھا علَم
جنگِ خیبر میں جو حیدر نے اٹھایا تھا علَم کربلا میں وہی عباسؑ نے [illegible] علم

نامِ عباسؑ لئے فتح کا پیغام بڑھا
ہاتھ مولا کے لئے ، پرچمِ اسلام بڑھا

ذاتِ عادل کی عدالت کی نشانی ہے علَم ۲۵ کارِ تبلیغ نبوّت کی نشانی ہے علَم
مرکزِ نور امامت کی نشانی ہے علم حق و انصاف و صداقت کی نشانی ہے علم

جلوۂ طور پھریرے سے عیاں ہوتا ہے
لوحِ محفوظ کا پنجے پہ گماں ہوتا ہے

سطوتِ مذہبِ حقّہ کی نشانی ہے علَم ۲۶ رفعتِ مذہبِ حقّہ کی نشانی ہے علَم
شوکتِ مذہبِ حقّہ کی نشانی ہے علَم عظمتِ مذہبِ حقّہ کی نشانی ہے علَم

گوشے گوشے سے بصد جاہ و حشم اٹھتا ہے
نامِ عباس کا دنیا میں علم اُٹھتا ہے

مرکزِ دولتِ ایماں کی علامت ہے علَم ۲۷ منبع چشمۂ عرفاں کی علامت ہے علَم
سطوتِ حاملِ قرآں کی علامت ہے علَم قوتِ شاہِ شہیداں کی علامت ہے علَم

دل کے جذبات پھریرے سے عیاں ہیں ابتک
خونِ عباسؑ کے چھینٹوں کے نشاں ہیں ابتک

مردِ مومن کے لئے باعثِ ایقاں ہے علَم ۲۸ منبع علم و یقیں ، قوّتِ ایماں ہے علَم
مظہرِ نورِ خدا ، مرکزِ عرفاں ہے علَم اہلِ دانش کے لئے فکر کا ساماں ہے علَم

کربلا جبکہ تصوّر میں نظر آتی ہے
خشک مشکیزے کی تصویر اُبھر آتی ہے

موجۂ نور ہدیٰ شہ کے علَم کا سایہ ۲۹ چشمۂ آب بقا ، شہ کے علَم کا سایہ
شاخِ طوبیٰ سے سوا شہ کے علَم کا سایہ سایۂ آلِ عبا ، شہ کے علَم کا سایہ

عہد و پیماں جو ہے حضرت سے وفاداری کا
کیسا روشن ہے نشاں شہ کی وفاداری کا

باعثِ قوّتِ ایمان عزاداری ہے ۳۰ مردِ مومن کی رگِ جان عزاداری ہے
قوم کی زیست کا سامان عزاداری ہے فاطمہؑ بی بی کا ارمان عزاداری ہے

مرتبے بڑھتے ہیں شبیّر کے غم خواروں کے
اشک رومال میں چُنتی ہیں عزاداروں کے

غمِ شبیر میں مجلس جو بپا ہوتی ہے ۳۱ موجبِ پیرویٔ آلِ عبا ہوتی ہے
ذکر و افکار سے معمور فضا ہوتی ہے شاملِ حال شہیدوں کی دعا ہوتی ہے

زینبؑ عالیہ آتی ہیں حسینؑ آتے ہیں
اس میں شرکت کو رسولؐ الثقلین آتے ہیں

ملبِ فردوسِ بریں فرشِ عزائے مجلس ۳۲ اوج گردوں سے سوا اوجِ فضائے مجلس
حکمِ سرکار دو عالمؐ ہے ، بنائے مجلس کم عبادت سے نہیں ، شورِ نوائے مجلس

حق کی تائید جو ہے گریۂ پیہم کی صدا
قصر باطل کو ہلا دیتی ہے ماتم کی صدا

پھر سے مڑتا ہے سوئے ذکر علمدار قلم ۳۳ تاکہ کچھ کر سکے مولا کی شجاعت کو رقم
مدح عباس کی ہے ، مدحِ شہنشاہِ اُمم مشعلِ راہ ہیں سقائے سکینہ کے قدم

تذکرہ ہوتا ہے عباس کی غمخواری کا
ذکر پھر چھڑتا ہے آئینِ وفاداری کا

ذکرِ عباسِ علیؑ جبکہ ہوا وردِ زباں ۳۴ پھر گیا سامنے نظروں کے وغا کا میداں
ولولہ جوش و شجاعت کا تھا چہرے سے عیاں موج زن دل میں تھا شمشیر زنی کا ارماں

شہ کا ادنیٰ سا اشارہ بھی اگر ہو جاتا
پھر یہ میدانِ وغا زیر و زبر ہو جاتا

کارِ تبلیغِ امامت میں تھے مصروف امام ۳۵ اپنے سینے سے لگائے ہوئے نانا کا پیام
ساتھ تھے حضرت عباسِ علیؑ مثلِ غلام سرِ تسلیم تھا خم ، پیشِ شہنشاہِ انام

حکم آقا کا بصد شوق بجا لاتے تھے
لاشے میداں سے شہیدوں کے اٹھا لاتے تھے

یک بیک خیمے سے نکلی جو سکینہ معصوم ۳۶ چار اطراف میں بی بی کے تھا بچوں کا ہجوم
جاں بلب پھرتے تھے اطفالِ حسینِ مظلوم بولے آقا سے یہ عباسؑ بہ حالِ مغموم

دیکھی جاتی نہیں اب تشنہ دہانی آقا
کہیئے لے آؤں ابھی نہر سے پانی آقا

دی جو حضرت نے رضا، حق کا علمدار چلا ۳۷ پانی لینے کے لئے شہ کا وفادار چلا
سوئے میدانِ وغا، قاتلِ کُفّار چلا غیرِ فرّار چلا، حیدرِ کرّار چلا

ہوش مقتل میں شجاعوں کے اُڑے جاتے ہیں
شور دریا پہ ہے، عباس علیؑ آتے ہیں

کیا بیاں کوئی کرے دبدبۂ و رعب و جلال ۳۸ پیشِ عباسؑ کوئی آئے یہ کس کی تھی مجال
جنگ ممکن تھی کہاں بھاگ کے جانا تھا محال تھا فقط پیشِ نظر جان بچانے کا سوال

لی جگہ اپنی پس فوج جو سرداروں نے
راستہ دے دیا، دریا کا ستمگاروں نے

بیچ دریا کے جو سقائے سکینہ آیا ۳۹ اہلِ باطل کو ندامت سے پسینہ آیا
بڑھ کے تعظیم کو موجوں کا سفینہ آیا سر جھکائے ہوئے پانی کا خزینہ آیا

تھا علمدار جو مشکیزۂ معصوم لئے
بڑھ کے دریا نے عقیدت سے قدم چوم لئے

دیدۂ موج نے تلوؤں سے لگائیں آنکھیں ۴۰ بڑھ کے گرداب نے قدموں میں بچھائی آنکھیں
ابرِ باراں نے خجالت سے جھکائیں آنکھیں مارے غیرت کے نہ دریا نے اٹھائیں آنکھیں
سانس ٹھنڈی جو ستمگار کے لشکر نے بھری
مشک سوکھی ہوئی عباسؑ دلاور نے بھری

بھر کے مشکیزہ بصد ناز علمدار چلا ۴۱ آبرو بڑھ گئی دریا سے وفادار چلا
تشنہ لب ساحلِ دریا سے جو اسوار چلا گھونٹ پانی نہ پیا، پیاس میں رہوار چلا
علَمِ پاک کو دریا میں جو ہرایا ہے
آج عباسؑ نے غازی کا لقب پایا ہے

خوف سے فوجِ یزیدی پہ تھا سکتہ طاری ۴۲ ہاتھ پیروں سے تھا، ہر اک کے پسینہ جاری
غرق تھی بحرِ خجالت میں سپاہِ ناری ایک عباسؑ اکیلے تھے سبھوں پر بھاری
آتشِ بُغض سے کفّار جلے جاتے تھے
شیر کی طرح سے عباسؑ چلے جاتے تھے

یک بیک شمرِ بد اختر نے کیا بڑھ کے کلام ۴۳ ہوش میں آؤ ذرا، اے سپہِ کوفہ و شام
کر دیا تم نے شجاعانِ عرب کو بدنام تنِ تنہا سے ہو مرعوب ہے ذلّت کا مقام
آن پر حرف نہ اپنی کوئی آنے پائے
بچ کے عباسؑ نہ میدان سے جانے پائے

سن کے یہ بات ہوا سَن سے یزیدی لشکر ۴۴ بن گیا قہرِ خدا ، فاتحِ خیبر کا پسر
تھے جو اسوار پراگندہ تو پیدل ابتر مرنے والوں کو نہ کچھ موت کی ہوتی تھی خبر

جسم کہتا تھا کہ نیزے کی اَنی نے مارا
جان کہتی تھی کہ ہیرے کی کَنی نے مارا

باوجودیکہ حفاظت کو تھا خالی نیزا ۴۵ زد پہ عباسؑ کے آکر کوئی جیتا نہ بچا
لاش پہ لاش گری ، بھر گیا میدانِ وغا گِرد عباسؑ کے تھا خون کا بہتا دریا

کھا کے نیزے کی اَنی گر کوئی بل کھاتا تھا
جان کے ساتھ کلیجہ بھی نکل آتا تھا

جنگ کے خوف سے تھی فوجِ یزیدی بے حال ۴۶ دل شکستہ جو تھے اسوار تو پیدل تھے نڈھال
مرنا آسان نہ تھا ، بھاگ کے جانا تھا محال منہ پر عباسؑ کے آئے کوئی ، کس کی تھی مجال

سرِ میدانِ وغا شہ کا علمدار بڑھا
زور باطل کا گھٹا ، حق کا طلبگار بڑھا

ابتری دیکھ کے یہ شمرِ ستمگر نے کہا ۴۷ چارہ کوئی نہیں اب پشت سے حملے کے سوا
وار تلوار کا حضرت پہ اچانک جو ہوا تن سے بازو ہوا سقائے سکینہ کا جدا

ہاتھ کٹ جانے سے نیزے کا سہارا ٹوٹا
غُل ملائک میں ہوا ، عرش کا تارا ٹوٹا

ناگہاں دوسرے بازو پہ بھی اک وار ہوا ۴۸ ساتھ میں ہو گیا ٹھنڈا علمِ فوج خدا
باوجود اس کے بھی سقائے سکینہ نہ تھما ہاتھ کٹ جانے پہ مشکیزے کو دانتوں میں لیا

چار اطراف سے گو تیر چلے آتے تھے
صورت سرو رواں آپ چلے آتے تھے

ہائے پھر مشکِ سکینہ پہ جو اک تیر لگا ۴۹ جھک گئے گھوڑے پہ پانی کو بچانے مولا
یک بیک پشت سے اک گرزِ گراں بار اٹھا آسماں ٹوٹ پڑا ، رن میں اندھیرا چھایا

خون چہرے پہ جو روشن تھا وفاداری کا
خوب ماتھے پہ سجا تاج علمداری کا

دی علمدار نے آواز کہ یاشاہِ اَنام ۵۰ پہونچے عباسؑ کا سرکار کی خدمت میں سلام
آخری وقت زیارت کو تڑپتا ہے غلام خاک پر بیٹھ گئے سُن کے یہ آواز امام

پاؤں تھرّائے جگر تھام کے اُٹھّا نہ گیا
تھا یہ صدمہ کہ کمر تھام کے اُٹھّا نہ گیا

غمِ عباسؑ سے گو شہ کا کلیجہ تھا فگار ۵۱ یا علیؑ کہہ کے اُٹھے خاک سے مولا یک بار
سوئے دریا چلے کہتے ہوئے میرے غمخوار دل میں ارمانِ وغا لے کے سدھارے میں نثار

تم کو شمشیر زنی کی جو اجازت ہوتی
اسی میداں میں قیامت پہ قیامت ہوتی

پاس عباسؑ کے پہنچے جو شہنشاہِ ہدیٰ ۵۲ بھائی کو خون کے دریا میں تڑپتا پایا
منہ پہ منہ رکھ دیا، سرور کا عجب حال ہوا شانے چومے کبھی جھک کر کبھی ماتھا چوما

فرطِ گریہ سے جو حضرت نہ سنبھل پاتے تھے
کہہ کے بھائی، کبھی بھائی سے لپٹ جاتے تھے

لے کے پھر گود میں سر بھائی کا سرور نے کہا ۵۳ حق ادا کر دیا عباسؑ وفاداری کا
ہاں مگر ایک ہے ارمان جو پورا نہ ہوا بھائی مجھ کو نہ کہا، عمر بھر آقا کے سوا

اپنے بھائی کو کلیجے سے لگا لو عباسؑ
آخری وقت، مجھے بھائی پکارو عباسؑ

بولے عباسؑ کہ سو جان سے آقا پہ نثار ۵۴ دلِ محزوں کو ہوا آپ کے آنے سے قرار
میں کہاں اور کہاں جانِ رسولِ مختارؐ ہاں مگر ایک تمنّا ہے ، شہِ عرش وقار

میرا دنیا سے گزرنا بھی عبادت ہو جائے
آخری وقت جو حضرت کی زیارت ہو جائے

آ کے پلکوں پہ جو ٹھہرا ہے لہو زخموں کا! ۵۵ کر نہیں سکتا میں حضرت کی زیارت آقا
بے بسی دیکھ کے عباسؑ کی روئے مولا دامن پاک سے آنکھوں کا لہو پاک کیا

اپنے آقا کو بھی دیکھا تو نہ کچھ جان سکے
ہائے شبیرؑ کو عباسؑ نہ پہچان سکے

رو کے یہ حضرت عباسؑ نے سرور سے کہا ۵۶ میں ہوں شہزادی سکینہ سے بہت شرمندہ
پانی لانے کا جو وعدہ تھا وہ پورا نہ ہوا لاش خیمے میں نہ لے جائیں مری بہرِ خدا

کہتے کہتے یہ سخن شہ سے ، سدھارے عباسؑ
مومنو ! ہو گئے اللہ کو پیارے عباسؑ

ہائے شبیرؑ پہ کیا ٹوٹ پڑا کوہِ الم ۵۷ بھائی دیکھا کیا اور توڑ دیا بھائی نے دم
منتظر تھے شہِ والا کے جو خیمے میں حرم لے کے مولا چلے عباسِؑ دلاور کا علم

راہ میں شدتِ گریہ سے جو تھراتے تھے
یاد آتی تھی سکینہ تو سنبھل جاتے تھے

پہونچے خیمے کے قریں جبکہ شہِ عرش مقام ۵۸ دوڑی فضّہ سرِ مقتل کہ نہ گر جائیں امام
جاتے جاتے یہ دیا حضرتِ زینبؑ کو پیام سرنگوں ہو گیا بی بی علمِ شاہِ انام

گود میں بالی سکینہ کو اٹھا لو بی بی
غم سے مرجائیں گے ، بچوں کو سنبھالو بی بی

آ کے ٹھہرے درِ خیمہ پہ امامِ مظلوم ۵۹ دی یہ آواز کہ اے زینب و اُمِّ کلثوم
ہیں کہاں فضل و رقیہؑ و سکینہ معصوم بھائی کو دشت میں چھوڑ آیا حسینِؑ مظلوم

میرے بھائی مرے غمخوار کا پرسا دے دو
مجھ کو عباسِؑ علمدار کا پرسا دے دو

اے قلم صبر، کہ ہوتا ہے کلیجہ پانی ۶۰ تھم گئی طبعِ رسا، ختم ہوئی جولانی
بعدِ عباسؑ ہے خیموں میں عجب ویرانی بچے خاموش ہیں، سہمی ہے سکینہ جانی
نہر پہ حضرتِ عباسؑ علیؑ سوتے ہیں
غم میں فرزند کے زہراؑ و علیؑ روتے ہیں

○

پڑھوں گا نادِ علی میں جواب سے پہلے
لحد میں آئیں گے مولا حساب سے پہلے
خدا گواہ ہے، شاہد نبیؐ ہیں خیبر میں
کہ فتح ہو نہ سکی بوتراب سے پہلے
کہاں ہے دینِ مبیں میں نظامِ جمہوری
نبیؐ کی بات سنو انتخاب سے پہلے

مرثیہ نمبر ۴

ہے آج پھر قلمِ نکتہ رس، وقارِ سخن

ہے آج پھر قلمِ نکتہ رس وقارِ سخن ۱ نسیم فکر کے جھونکوں میں ہے بہارِ سخن
اُڑا ہے رخشِ تخیّل پہ شہسوارِ سخن خراج لے گا زمانے سے تاجدارِ سخن
چلا ہے پرچمِ دینِ مُبیں اُڑائے ہوئے
بصد ادب ہیں، مضامین سر جھکائے ہوئے

درست کی ہے جو الفاظ نے صفتِ تنظیم ۲ محاورات بھی حاضر ہوئے پئے تعظیم
اشارے کر کے کنائے بھی ہو چکے ہیں مقیم اور استعارے بھی موجود ہیں بہ قلبِ صمیم
دریچہ وا جو ہوا ہے، کلامِ مجمل کا !!!
کُھلا ہے بابِ حقیقت مجازِ مرسل کا

ادھر قلم بھی بصد ناز و عزّ و جاہ چلا ۳ اُٹھا یہ شور کہ اقلیمِ فن کا شاہ چلا
برائے فکر و تجسّس فلک نگاہ چلا قدم قدم پہ جلاتا چراغِ راہ چلا
قلم کہ شاخ ثمرِ دار کا نمونہ ہے
جو نقش ہے خطِ گلزار کا نمونہ ہے

چمک رہا ہے جو قرطاس کا خطِ تقدیر ۴ فرازِ عرش پہ لرزاں ہے حُسنِ بدرِ منیر
کھنچے گی عکسِ خیالات کی نئی تصویر کہ آج سر پہ ہے پھر سایۂ جناب امیرؑ

افق سے تا بہ اُفق ہے فضائے ایمانی

علیؑ کی ذات ہے وجہِ ضیائے ایمانی

متاعِ نوعِ بشر ہے ضیائے ایمانی ۵ جمالِ نورِ سحر ہے ضیائے ایمانی
سرورِ دردِ جگر ہے ضیائے ایمانی شعاعِ حسنِ نظر ہے ضیائے ایمانی

اسی سے جلوہ بد اماں ہے داستانِ حیات

رواں دواں ہے زمانے کا کاروانِ حیات

یہی ہے لغزشِ آدم کا اصل کفارا ۶ سیاہ خانۂ دنیا میں نور کا دھارا
ہے سالکانِ وفا کے لئے قطب تارا چراغِ راہ گزر ، روشنی کا مینارا

فضائے دہر میں سورج نیا اُبھرتا ہے

اسی سے رنگِ رُخِ زندگی نکھرتا ہے

اسی سے ہوتی ہے تطہیرِ روحِ انسانی ۷ اسی سے ہوتی ہے ذہنِ رسا کی جولانی
اسی سے ہوتی ہے تحقیرِ زعمِ سلطانی اسی سے ہوتی ہے تفسیرِ حکمِ ربانی

یہ بے دھڑک سرِ دربار ٹوک دیتی ہے

انانیت کے سمندر کو روک دیتی ہے

اسی سے کھلتے ہیں عالم پہ وصفِ انسانی ۸ اسی کے نور سے روشن بشر کی پیشانی
اسی سے کرتا ہے مومن دلوں پہ سلطانی اسی سے جاتی ہے قلب و نظر کی ویرانی

بنا ہے طور ، دلِ داغدار آدم کا
اسی کے دم سے ہے قائم وقار آدم کا

یہی بنا گئی سلمانؓ کو صاحبِ کردار ۹ اسی کے دم سے تھی بوذرؓ میں گرمیٔ گفتار
یہی تھی باعثِ توقیرِ میثمِ تمّار اسی کے نور کے حامل تھے حضرتِ عمّار

یہ وہ ہیں جن پہ صداقت کو ناز ہے ابتک
عمل پہ جن کے شہادت کو ناز ہے ابتک

یہی وہ تھے کہ بنا جس سے قوم کا کردار ۱۰ جھکا سکی نہ جنہیں ظلم و جور کی تلوار
تھے خاک ان کے نگاہوں میں درہم و دینار انہیں کے خوف سے اہلِ دوَل تھے سینہ فگار

سروں کا بار جو بنتا تھا تاج شاہوں کا
غرور خاک میں ملتا تھا کج کلاہوں کا

بنا دیا انہیں عزم و یقیں نے لافانی ۱۱ بجا ہے ان کو کہیں فخرِ نوعِ انسانی
متاعِ دیں سے جو قلب و نظر تھے نورانی زباں تھی ان کی کلیدِ رموزِ قرآنی

جہاں بھی جاتے تھے جب بھی کلام کرتے تھے
یہ ذکرِ آلِ محمدؐ کو عام کرتے تھے

ہمیشہ رہتے تھے عشقِ رسولؐ میں سرشار ۱۲ زباں پہ رہتی تھی توصیفِ حیدرِؑ کرّار
کبھی جو پڑ گئی ان کی نگاہِ آتش بار بدل کے رہ گئی شاہانِ وقت کی رفتار

کوئی شہید ہوا کوئی سوئے دار بڑھا
انہیں کے ساتھ میں اسلام کا وقار بڑھا

مجھے بھی خالقِ یکتا نے یہ شرف بخشا ۱۳ کہ دل میں ولولۂ مدحِ اہلبیتؑ اُٹھا
سرور و کیف کی چھانے لگی جہاں پہ فضا فلک سے رحمتِ حق کا نزول ہونے لگا

قلم کا زور بڑھا ، فکر نے جلا پائی
صریرِ خامہ سے آواز حل اتیٰ آئی

پڑی جو گلشنِ مدّاحِ اہلِ حق پہ نظر ۱۴ چمک رہے تھے مضامینِ نو کے لعل و گہر
کمالِ حسنِ تخیّل تھا ماورائے بشر کھلا تھا معنی و علم و بیان کا دفتر

خدا کا فضل تھا تائید آسمانی تھی
ہر ایک سمت مؤدت کی ضو فشانی تھی

یہ بات دیکھ کے میں نے بھی کی خدا سے دعا ۱۵ حضور پاک کا صدقہ مجھے بھی کچھ ہو عطا
خلوصِ دل سے تھا کہنا ، مرا قبول ہوا پلا دیا مرے ساقی نے مجھ کو جامِ ولا

سرورِ ساغرِ تسنیم رنگ لاتا ہے
قلم کی نوک پہ مضمون بن کے آتا ہے

مرے قلم نے جو تائیدِ ایزدی پائی ۱۶ جھکا کے سر کو بڑھا حُسنِ چرخِ مینائی
شعاعِ شمس و قمر ہاتھ باندھ کر آئی فضا نے پیش کی قوسِ قزح کی رعنائی

حنا کا رنگ جو حورِ شفق نے عام کیا
صبا نے بڑھ کے ادب سے مجھے سلام کیا

مہکتی آئی چمن سے گلاب کی خوشبو ۱۷ نظر کا نور لئے آئی نرگسِ جادو
جگر کا خون لئے آیا لالۂ خوشرو بہار طشت میں لائی گلوں کے جام وسبو

ولائے آلِ محمدؐ کا جب خمار بڑھا !
تو جھومتا ہوا گلشن سے سبزہ زار بڑھا

بھری تھی کیف سے ہر سو فضائے مستانہ ۱۸ چھلک رہا تھا مودت سے دل کا پیمانہ
ولائے آل محمدؐ سے پُر تھا میخانہ کسی طرف سے یہ آئی صدائے رندانہ

بہارِ گلشنِ ایمان یا علیؑ حیدرؑ
دیارِ حق کے نگہبان یا علیؑ حیدر

عجیب جوشِ عقیدت نے رنگ دکھلایا ۱۹ علیؑ کے نام نے مجلس کو خوب گرمایا
زباں پہ جذبۂ دل یک بیک اُبھر آیا کیا وہ کام ، عبادت کا مرتبہ پایا

فروعِ دیں سے ہیں افضل اصول کی باتیں
خدا کا ذکر ہے نفسِ رسولؐ کی باتیں

ادھر قلم نے بھی دکھلائی خوب جولانی ۲۰ اَدَق رہے نہ مضامین ہو گئے پانی
چمک رہی تھی جو نُورِ وِلا سے پیشانی کچھ اور بڑھ گئی تقدیس مرثیہ خوانی

شعاعِ مہر کا دامن نچوڑ کر لایا !!!
یہ آسماں سے تاروں کو توڑ کر لایا !!!

بیان جب کیے اس نے رموزِ قرآنی ۲۱ تو دنگ رہ گئی عقلِ رسائے انسانی
مفسّروں کو تھی تفسیر پر پریشانی عَرَق عَرَق تھی ندامت سے اُنکی پیشانی

قیاس نے انہیں تاریکیوں میں ڈالا تھا
قلم کا ، فیضِ اِمامت سے ، بول بالا تھا

لکھی جو حمدِ خداوندِ قادرِ مطلق ۲۲ تو یاد آ گیا یکتائی خدا کا سبق
رسولِ پاک کی تخلیق کا کھُلا جو وَرَق حدیثِ نور سے روشن ہوئے دلوں کے طبق

حضور نقطۂ انجام ہیں رسالت کا
کہ جن کے بعد چلا سلسلہ امامت کا

بقائے حق کے لئے شرط ہے وجودِ امام ۲۳ کہ برقرار رہے تا بہ حشر حق کا پیام
جو یہ نہیں تو شبِ قدر کا کہاں ہے مقام فرشتے لاتے ہیں کس کی طرف پیام و سلام

زمیں رہے گی نہ حق کے پیام سے خالی
کبھی نہ ہو گا زمانہ امام سے خالی

امام حجتِ حق ہے ، امام نورِ مبیں ۲۴ امام رحمتِ یزداں ، امام نیّرِ دیں
امام رہبرِ کامل ، امام صبحِ یقیں امام ، سارا زمانہ ہے جس سے
امام ، شر سے شیاطین کے بچاتا ہے
جو پیروی کرے اس کی نجات پاتا ہے

امامِ وقت نے مجھ کو بھی آگہی بخشی ۲۵ کمالِ لطف سے ذرّے کو روشنی بخشی
سکونِ قلب دیا ، روح کو خوشی بخشی کلام کو مرے پھولوں کی تازگی بخشی
زباں کے تار میں لعل و گہر پروتا ہوں
وِلا کے ہار میں شمس و قمر پروتا ہوں

غرور کچھ نہیں اپنی سخنوری کا مجھے ۲۶ مگر دیا ہے صلہ مدح گستری کا مجھے
ملا ہے بخت ہے جو شاہان حیدری کا مجھے خیال آتا ہے گردوں سے ہمسری کا مجھے
سند کے واسطے کیا رتبۂ قبول ملا
کرم سے شہ کے مجھے منبرِ رسولؐ ملا

عروج اس کے سوا ، اور مجھ کو کیا ہو گا ۲۷ کہ ایک سال میں چوتھا یہ مرثیہ لکھا
سبھوں کے سامنے منبر پہ میں بلند ہوا بنا ہے تاج مرے سر کا پرچمِ مولا
جہاں میں دولتِ عقبیٰ کی فکر کرتا ہوں
شہادتِ علیؑ اکبر کا ذکر کرتا ہوں

بہارِ گلشنِ شبیرؑ ہیں علیؑ اکبر ۲۸ حسنؑ کے حُسن کی تنویر ہیں علیؑ اکبر
علیؑ کے نام کی تفسیر ہیں علیؑ اکبر رسولِؐ پاک کی تصویر ہیں علیؑ اکبر
بلائیں لینے کو حوروں کے ہاتھ بڑھتے ہیں
وہ نور ہے کہ فرشتے درود پڑھتے ہیں

مثالِ نیرِ تاباں ہے چہرۂ انور ۲۹ ہلال ابروِ خمدار وجہ نورِ قمر
جمال ایسا کہ خیرہ نگاہِ بد اختر جلال ایسا کہ جلنے لگے عدو کی نظر
انہیں کے دم سے محمدؐ کے گھر اُجالا ہے
جنابِ ثانئ زہراؑ نے ان کو پالا ہے

ہیں شرحِ آیۂ واللیل گیسوئے خمدار ۳۰ کمالِ لعلِ بدخشاں ہیں نقرئ رخسار
جوابِ نغمۂ داوٗدؑ ہیں لبِ گفتار مثالِ یوسف کنعان ہیں صاحبِ کردار ہیں
ریاضِ فاطمہؑ زہراؑ کے گلعذار ہیں یہ
صفاتِ آلِ محمدؐ کے ورثہ دار ہیں یہ

چلی جو بادِ مخالف بروز عاشورا ۳۱ چراغِ حق کو بچانے اُٹھے امامِ ھدیٰ
ہر ایک سمت سے باطل نے سر اٹھایا تھا مگر تھا دیں کی سپر نورِ عین حیدر کا
جوان بیٹے کو برچھی جگر پہ کھانے دی
مگر نہ دینِ محمدؐ پہ آنچ آنے دی

حسینؑ ساتھ میں لائے تھے منفرد لشکر ۳۲ جواب جس کا نہیں ہے بساطِ ہستی پر
کمالِ حُسنِ تدبّر تھا انتخابِ نظر صفِ جہاد میں شامل تھا شیر خوار پسر
عدو بھی رو دئے سوکھی زبان دکھانے پر
صفیں الٹ گئیں اصغر کے تیر کھانے پر

جہاد ایسا نہ چشمِ فلک نے دیکھا تھا ۳۳ کہ امتیاز مٹا تھا غلام و آقا کا
پلٹ کے رکھ دیا ہر اک نے جنگ کا نقشا لہو سے سرخ ہوا ریگ زارِ کرب و بلا
رہِ جہاد میں دینِ مُبیں پہ مرتے تھے
یہ حق پرست تمنائے موت کرتے تھے

تمام ہو گیا جس دم حسینؑ کا لشکر ۳۴ شہید ہو گئے انصارِ با وفا حق پر
اجل نے لوٹ لیا باغِ سبطِ پیغمبر رہا نہ کوئی بھی باقی بجُز علیؑ اکبر
سوئے پدر پسرِ خوشخصال نے دیکھا
پسر کی شکل کو زہرا کے لال نے دیکھا

کہا حسینؑ نے اکبر تمہیں ہے اذنِ وغا ۳۵ کیا تھا میں نے جو وعدہ وہ ہو گیا پورا
تمہارے خون سے نکھریگا رنگِ حُسنِ وفا علیؑ کا لال محمدؐ سے سرخ رو ہو گا
رکاب تھام کے ہلکا غموں کا بار کیا
حسینؑ نے علیؑ اکبر کو خود سوار کیا

ادب سے گھوڑے پہ جونہی بڑھا جوان پسر ۳۶ کمر کو تھام کے خود ساتھ ہو لئے سرور
یہ کہتے جاتے تھے آہستہ اے علیؑ اکبر پدر نثار تمہارے شبیہہِ پیغمبر

تمہاری شکل سے نانا کی یاد آتی ہے
رسولِ پاک کی تصویر رن کو جاتی ہے

یہ کہہ کے دیکھا جو حضرت نے سوئے لختِ جگر ۳۷ تو سر کو پاسِ ادب سے جھکائے تھے اکبرؑ
فرس رکا تھا، قدم تھے رکاب سے باہر یہ حال دیکھ کے بیتاب ہو گئے سرور

کہا حسینؑ نے لختِ جگر، خدا حافظ
ضعیف باپ کے نورِ نظر، خدا حافظ

برائے جنگ جو وہ صاحبِ کمال بڑھا ۳۸ اُٹھا یہ شور کہ خیبر کشا کا لال بڑھا
مثالِ نورِ مُبیں، حُسنِ لازوال بڑھا جلال آیا تو کچھ اور بھی جمال بڑھا

اُٹھا یہ غل کہ ہٹو قلعہ گیر آتے ہیں
قیامت آئی جناب امیرؑ آتے ہیں

فرس اُڑا کے جو اکبر چلے سوئے مقتل ۳۹ در آیا فوجِ عدو میں سوارِ رخشِ اجل
سمند کانپے، سواروں میں مچ گئی ہلچل لرز کے رہ گئے آگے نہ بڑھ سکے پیدل

سموں میں گھوڑوں کے پنہاں نشانِ شاہی تھے
قدم جو تھک گئے، ملک عدم کے راہی تھے

صفوں میں فوجِ مخالف کے تھی پریشانی ۴۰ ملا تھا خاک میں زعم و غرورِ سلطانی
لہو سے سرخ تھا نہرِ فرات کا پانی بنا تھا قہرِ الہیٰ حسینؑ کا جانی
غضب خدا کا تھا سیلِ رواں گزرتا تھا
لہو میں ڈوب کے دشمن کا سر ابھرتا تھا

جہاد کے لئے جس سمت بھی بڑھے اکبرؑ ۴۱ صفیں الٹ گئیں ، بھاگا یزید کا لشکر
کوئی یہ کہتا تھا آتے ہیں حمزہؑ و جعفرؑ گماں تھا اس کا کہ لڑتے ہیں حیدرؑ و صفدر
ملا نہ وقت لعینوں کو سر اٹھانے کا
بلند نام کیا ہاشمی گھرانے کا

دعائیں کرتے تھے بچنے کی سب صغیر و کبیر ۴۲ وہ خوف تھا کہ غلاموں میں چھپ گئے تھے امیر
بچاؤ کی نہ مؤثر ہوئی کوئی تدبیر عقب سے دفتاً آیا حصین ابنِ نمیر
دلِ حسینؑ پہ ظالم نے آ کے وار کیا
سپر کی آڑ سے نیزہ جگر کے پار کیا

لگا جو سینے میں نیزا بصد فریب و ریا ۴۳ جری نے غیظ سے نیزے پہ ہاتھ ڈال دیا!
بس ایک جھٹکے سے برچھی کے پھل کو توڑ لیا نہ جان جانے کا اکبرؑ نے کچھ خیال کیا
لگی جو پیاس تو ہاتھوں سے دل کو تھام لیا
بڑھا جو درد تو مشکل کشا کا نام لیا

حسینؑ دیکھ رہے تھے جہاد اکبرؑ کا ۴۴ کہ نا گہاں نظر آیا نہ شہ کو ماہ لقا
سمجھ گئے کہ فدا ہو گیا جواں بیٹا بھر آئے آنکھ میں آنسو جگر میں درد اٹھا

کمالِ صبر دکھانے ضعیف باپ چلا
جواں کی لاش اُٹھانے ضعیف باپ چلا

فضا خموش تھی دلدوز تھا عجب منظر ۴۵ عدو کے نرغے میں مولا کو تھی تلاشِ پسر
گئے حسینؑ کئی مرتبہ اِدھر سے اُدھر پکارتے تھی کہ آواز دو علیؑ اکبرؑ

غبار نے مرے نور نظر کو گھیرا ہے !!
جواب دو علیؑ اکبرؑ بڑا اندھیرا ہے

ادھر حسینؑ کو تھی آرزوئے دیدِ پسر ۴۶ اُدھر تھا فوجِ مخالف کا کچھ عجب منظر
تھما تھا کہہ کے یہ ہر سو یزید کا لشکر کہ آج دیکھیں گے ہم صبرِ سبطِ پیغمبر

جگر کو تھامیں گے یا قلب کو سنبھالیں گے
حسینؑ کس طرح برچھی کا پھل نکالیں گے

سرہانے جب علیؑ اکبرؑ کے شاہِ دیں آئے ۴۷ کلیجہ کانپ گیا ہاتھ پاؤں تھرّائے
خدا نہ داغ پسر دشمنوں کو دکھلائے ضعیف باپ نہ بیٹے کی لاش پر جائے

مگر حسینؑ نے وہ کارِ بے مثال کیا
جگر سے بیٹے کے برچھی کا پھل نکال لیا

کھلا جو زخم تو بہنے لگا جگر کا لہو ۴۸ اُٹھا وہ درد کہ تھرّائے اکبرِ مہرد
چراغ گل ہوا گل سے نکل گئی خوشبو حسینؑ رو نہ سکے خشک ہو گئے آنسو
ضعیف باپ پہ کیسا فلک نے غم توڑا
عدو بھی رو دیئے جب نوجواں نے دم توڑا

چلے حسینؑ جو مقتل سے لے کر لاشِ پسر ۴۹ خدا کی راہ میں لختِ جگر تھا ہاتھوں پر
پکاری دیکھ کے یہ حال ، زینبِ مضطر مدد کو آیئے للہ حیدر و صفدر
پسر کی لاش ہے عجلت سے کام لو بابا
حسینؑ سے علیؑ اکبرؑ کو تھام لو بابا

ادھر یہ حال تھا خیمے میں اُمِّ لیلیٰ کا ۵۰ رواں تھا بی بی کے آنکھوں سے خون کا دریا
جگر کو تھام کے فضّہ سے یہ سوال کیا پسر کی لاش کو لے آئے کیا شہِ والا
میں اپنے چاند سے کڑیل جواں کو دیکھوں گی
لگی کہاں پہ ہے برچھی نشاں کو دیکھوں گی

ابھی یہ بات کہی تھی کہ ایک شور اُٹھا ۵۱ کہ لاش خیمے میں لاتے ہیں سیّدِ والا
عبا تھی سرخ لہو سے تو زرد تھا چہرہ زمیں پہ رکھ دیا لاشہ زباں سے کچھ نہ کہا
پسر کا داغ ہے کس طرح دل کو کل آئے
حسینؑ خیمے سے روتے ہوئے نکل آئے

بس اے قلم کہ کلیجہ فگار ہوتا ہے ۵۲ شکستہ غم سے دلِ بے قرار ہوتا ہے

نڈھال ابنِ شہِ ذوالفقار ہوتا ہے   ہر اک اہلِ عزا اشکبار ہوتا ہے

ضریح چوم کے منت بڑھائی جاتی ہے

زیارتِ علیؑ اکبرؑ پڑھائی جاتی ہے

○

کھاتا ہوں قسم ، خدمتِ اسلام کروں گا

جو دشمنِ دیں ہیں انہیں بدنام کروں گا

بخشا ہے مجھے زورِ بیاں ربِ علا نے

شبیرؑ کے پیغام کو میں عام کروں گا

○

رشک سے دیکھیں گے مجھ کو اہل محشر دیکھنا

کام آئے گا وہاں یہ دیدۂ تر دیکھنا

کش مکش سے خیر و شر کی ، سرخرو ہوتا ہے کون

حلقِ سرور دیکھنا ، باطل کا خنجر دیکھنا

مرثیہ نمبر ۵

آج پھر کاوشِ آرائشِ فن کرتا ہوں

ج پھر کاوشِ آرائشِ فن کرتا ہوں ۱ سرخئ خونِ جگر جلوہ فگن کرتا ہوں

لِ افکار سے معمور ، چمن کرتا ہوں زورِ تخئیل کو پابندِ سخن کرتا ہوں

نفسِ مضموں جو مرا طور سے بالا ہوگا

زورِ تحریر سے مجلس میں اُجالا ہو گا

مشعلِ راہ جو ہے روشنئ داغِ جگر ۲ گوشے گوشے میں نظر آتی ہے تنویرِ سحر

ربطِ آفاق جو ہے سلسلۂ تارِ نظر نوکِ مژگاں پہ چمکتے ہیں ستاروں کے گہر

فکر انگیز جو ہیں شعر و سخن کی باتیں

آج ہو جائیں نہ کیوں عظمتِ فن کی باتیں

بخشا اللہ نے فنکار کو کیا ذوقِ جمال ۳ گل کو گلدستہ بنا دیتا ہے گلچیں کا خیال

آگ پانی میں لگا دیتا ہے شاعر کا جلال حُسنِ فطرت کا نگہباں ہے مصوّر کا کمال

موجِ طوفاں کو جو انگلی کا اشارہ کر دے

منجمد وقت کا بہتا ہوا دھارہ کر دے

عطر، عطار کی کاوش کا ہے روشن پہلو ۴ کھینچ لیتا ہے جو موتی میں گلوں کی خوشبو
اپنی تخلیق میں فنکار سموتا ہے لہو جذب ہو جاتے ہیں پتھر میں سلگتے آنسو

سرخیٔ خونِ جگر فکر کی اُفتاد میں ہے
حُسنِ شیریں کی جھلک تیشۂ فرہاد میں ہے

ذہنِ فنکار میں جس دم کہ بکھرتے ہیں نقوش ۵ صورتِ گیسوئے خمدار سنورتے ہیں نقوش
نقد کی آنچ سے سو بار گزرتے ہیں نقوش تب کہیں تاج محل بن کے اُبھرتے ہیں نقوش

عظمتِ فکر رہی خاک کا پیکر نہ رہا
آئینہ رہ گیا دنیا میں سکندر نہ رہا

اپنی تہذیب کا آئینہ ہے فنکار کا فن ۶ ہیں امیں عہدِ گزشتہ کے یہ آثار کہن
ہاں مگر یہ ہے حقیقت کہ کرے لاکھ جتن پا نہیں سکتا کوئی مرتبۂ اہلِ سخن

عصرِ حاضر کو یہ ماضی سے ملا دیتا ہے
چھپ کے الفاظ کے پردے میں صدا دیتا ہے

آج مجلس میں ہے پھر گرمیٔ بازارِ سخن ۷ فکر انگیز ہے کیا شدّتِ افکارِ سخن
رشکِ دربارِ جہاندار ہے دربارِ سخن ہیں مقر مرثیہ گوئی کے طرفدار سخن

طلبِ خیر ہو تب دُرِّ نجف ملتا ہے
ورنہ کب مرثیہ گوئی کا شرف ملتا ہے

جوش میں آج ہے پھر چشمۂ فیضِ یزداں ۸ قلبِ مومن کو جِلا دے گی شعاعِ ایماں
اہلِ دانش کے لئے فکر کا ہو گا ساماں زورِ تحریر بڑھائیں گے دلیل و برہاں

خون اُگلے گا قلم ، ذکرِ شہیداں ہو گا !!

مانیٔ ناطقہ ، انگشت بہ دنداں ہو گا

غوطہ زن قلزمِ عرفاں میں ہے غوّاصِ قلم ۹ حُسنِ بے پایاں سے روشن ہے بساطِ عالم
چشمِ بینا کے تصوّر میں ہے تصویرِ ارم وہ تجلّی ہے کہ جلتے ہیں نگاہوں کے قدم

دم بخود عقل ہے جلووں کی فراوانی سے

دل پہ قابو نہیں جذبات کی طغیانی سے

اوجِ گردوں پہ جو پہنچا ہے قلم کا اقبال ۱۰ ضو فگن نُورِ ہدایت سے ہے قندیلِ خیال
دامنِ فکر میں ہے عالمِ امکاں کا جمال حُسنِ ترتیب سے الفاظ نے پایا ہے کمال

برقِ تخیُّل جو الفاظ میں لہراتی ہے

صاف جذبات کی تصویر نظر آتی ہے

ہے مرے پیشِ نظر ذکرِ شہنشاہِ حجاز ۱۱ کیوں نہ معراج پہ ہو فکرِ رسا کی پرواز
حاصلِ "کن فیکوں" ، جلوۂ حرفِ آغاز بس یہی ہے مرے مولا کے کرم کا اعجاز

سانس لینا بھی یہاں وقفِ عبادت ہو گا

باعثِ رحمتِ حق ذکرِ رسالت ہو گا

ذاتِ سرکار دو عالم ہے خدا کی رحمت ۱۲ باعثِ عظمتِ کونین وجودِ نعمت
حُسنِ تخلیق کا آئینہ بشر کی عظمت آپ خود اس کی ثناخواں ہے زبانِ قدرت

جس جگہ تذکرۂ شاہِ زماں ہوتا ہے
بیتِ معمور سے روشن وہ مکاں ہوتا ہے

آپ کی ذات پہ ایمان ہے خدا پر ایماں ۱۳ نطقِ سرکار دو عالم ہیں حدیث و قرآں
مُنکرِ ذاتِ محمدؐ ہے وہ کافر ناداں جس کی قسمت میں ہے محرومیٔ فیضِ یزداں

ڈھونڈتا نور ہے جو فکر کی باریکی میں
مثلِ ابلیس بھٹکتا ہی وہ تاریکی میں

دینِ اسلام کی بنیاد ہے ایماں بالغیب ۱۴ صرف اللہ ہے، اللہ کی ذاتِ بے عیب
لامکاں، ربِّ جہاں، خالقِ یکتا لاریب بندے اس کے ہیں سبھی موسیٰ و عیسیٰ و شعیب

جب کبھی آئے ہیں جتنے بھی نبی آئے ہیں
اس کی توحید کی دنیا میں خبر لائے ہیں

ارفع و اعلیٰ و اولیٰ ہے وہ قائم بالذات ۱۵ حیّ و قیّوم و توانا و مجیب الدعوات
ذات میں اپنی اَحد ہے تو ہے واحد بہ صفات کفر اس کی ہے نفی دین ہے اس کا اثبات

ذاتِ واجب کی عنایات کا مظہر ہیں حضورؐ
اس کا شاہد ہے خدا، نور کے پیکر ہیں حضورؐ

مومنو ! معرفت حق کا وسیلہ ہیں حضورؑ ۱۶ کل کے مختار ہیں یہ ، باقی زمانہ مجبور

دے چکا اپنی رضا ، اِن کو خداوند غفور اسکو منظور ہے ، وہ جو بھی ہے ان کو منظور

دین انکا ہے ، خدا انکا رسالت انکی

طاعت حق ہے ، حقیقت میں اطاعت ان کی

ہر عمل انکا ، خدا اپنا عمل فرمائے ۱۷ جو کہیں بات یہ فرمانِ خدا کہلائے

عرش جو آپ کی انگلی کا اشارہ پائے چاند دو ٹکڑے ہو ، خورشید پلٹ کر آئے

منحرف ذات سے اللہ کی شیطان نہ تھا

بات اتنی تھی فقط آپ پر ایمان نہ تھا

آپ کی ذات پہ ایمان ہے اصلِ ایماں ۱۸ آپ کی ذات کا عرفان ہے اصلِ عرفاں

آپ کی ذات کا ایقان ہے اصلِ ایقاں آخرت کا یہی سامان ہے ، اصلِ ساماں

یہ وہ دولت ہے کہ مفلس بھی تو نگر ہو جائے

اصلِ ایماں ہو تو بے زر بھی ابوذرؓ ہو جائے

جو بھی سرکارِ رسالت کا پرستار ہوا ۱۹ چشمۂ فیضِ الہیٰ سے وہ سرشار ہوا

مومن و متّقی و عابد و دیندار ہوا سالکِ راہِ رضا حق کا طلبگار ہوا

نام دنیا میں رہا ، صاحبِ ایماں بنا

اہلِ جنّت میں ہوا میثمؒ و سلمانؓ بنا

یوں تو اللہ کے قائل تھے نصاریٰ و یہود ۲۰ پاس ان کے بھی تھے احکامِ شریعت موجود
اور سمجھتے تھے خداوندِ عُلا کو معبود زعم میں اپنے تھے پابندِ قیام اور قعود
اپنی جانب میں بڑا ذکرِ خدا کرتے تھے
فرض طاعت کا ادا صبح و مسا کرتے تھے

ہاں مگر ذاتِ محمدؐ پہ جو ایمان نہ تھا ۲۱ رسم دنیا میں گرفتار تھے ایقان نہ تھا
دل تھے بے نور تو فیضان کا امکان نہ تھا بخدا ان میں کوئی صاحبِ ایمان نہ تھا
اپنے مطلب کی جو باتیں تھیں وہ چن لیتے تھے
ورنہ احکامِ شریعت کو بدل دیتے تھے

ابنِ مریم کو سمجھتے تھے خدا کا بیٹا ۲۲ جانے کیا حضرتِ موسیٰ کو بنا رکھا تھا
مستحق ہیں وہی جنت کے تھا ان کا دعویٰ لب پہ تھا نامِ خدا، شرک تھا سینوں میں چھپا
حق و انصاف سے اخلاص سے دل عاری تھے
عظمتِ نورِ محمدؐ کے وہ انکاری تھے

اُن کے انکار سے سرکار کی عظمت نہ گئی ۲۳ دہر میں احمد مختار کی عظمت نہ گئی
دین کے قافلہ سالار کی عظمت نہ گئی سیدِ و سرور و سردار کی عظمت نہ گئی
پرچمِ حق کو لئے نورِ ہدایت اُبھرا
دُور باطل ہوا خورشیدِ رسالت اُبھرا

دعوتِ حق کو لئے جبکہ بڑھا "خُلقِ عظیم" ۲۴ عدل و انصاف و مساوات کی پھیلی تعلیم
حُسنِ اعمال پہ کی نوعِ بشر کی تعلیم دینِ اسلام کی قائم رہیں اقدارِ قدیم

عظمتِ نوعِ بشر شرط تھی ایماں کے لئے
عملِ خیر عبادت ہوا ، انسان کے لئے

ٹھوکریں کھانے لگا جابجا عفریتِ غرور ۲۵ حق کے آنے سے ہوئی ظلمت باطل کافور
دم بخود سر بہ گریباں تھا پُرانا دستور دین کی ترویج سے روشن ہوا انسان کا شعور

نفس امّارہ سے جو برسرپیکار ہوا
حق کی نظروں میں وہی صاحبِ کردار ہوا

بہ ایں اوصاف بڑا صاحبِ کردار تھا حُر ۲۶ پاک طینت تھا بہادر تھا نکو کار تھا حُر
خلق و آئین و شرافت کا پرستار تھا حُر گو تھا اعدا میں مگر حق کا طلبگار تھا حُر

ضربتِ فکر سے باطل کا فسوں توڑ دیا
حُر نے بہتی ہوئی تاریخ کا رخ موڑ دیا

اہلِ دانش کے لئے حُر کا ہے کردار مثال ۲۷ حق کے جو یا کے لئے کوئی نہیں امر محال
دل میں ہو جذبۂ صادق تو ملے اوجِ کمال پائے وہ دولتِ عقبیٰ کہ نہیں جس کو زوال

مرد حق کوش زمانے کو ہلا دیتا ہے
خاک میں افسرِ شاہی کو ملا دیتا ہے

حُر کی تقدیر کو چمکا گئی عاشور کی شب ۲۸ مثل کا فور اُڑی دولت دنیا کی طلب
آگیا حق کی طرف چھوڑ دیا عیش و طرب صبح عاشور کھُلا رات کی مہلت کا سبب

نوکِ پاپوش پہ تھی سطوتِ دربارِ یزید
فیصلہ حُر کا طمانچہ تھا بہ رخسارِ یزید

امتیازِ حق و باطل میں کٹی رات تمام ۲۹ اک طرف تھا پسرِ سعد کا لطف و اکرام
دوسری سمت تھا اخلاقِ حسنَ خُلقِ امام اس طرح برسرِپیکار رہی صبح سے شام

عقل حاوی نہ ہوئی عشق کی بے تابی پر
کش مکش ختم ہوئی حق کی ظفر یابی پر

نورِ حق دل میں لئے حُر سوئے شبیرؑ چلا ۳۰ بخشوانے کے لئے شاہ سے تقصیر چلا
ہاتھ رومال میں باندھے ہوئے دل گیر چلا زیر لب پڑھتا ہوا ، آیت تطہیر چلا

جذبۂ عشقِ حقیقی نے اُبھارا اس کو
مل گیا سورۂ توبہ کا سہارا اس کو

منزل حق کی طرف حُر نے اٹھائے جو قدم ۳۱ سامنے آئی نظر روشنیٔ باغِ ارم
جذب کرتی تھی اسے بار گہِ شاہِ اُمم مسندِ شاہ سے تھا تختِ سلیمان بھی کم

صف سے اعدا کی نکل کر جو وہ دیں دار چلا
پیشوائی کے لئے شہ کا علمدار چلا

پہونچا دربارِ حسینی میں جھکائے ہوئے سر ۳۲ گر پڑا قدموں پہ حضرت کے اُٹھائی نہ نظر
اپنے سینے سے لگا کر اسے بولے سرور حُر نہ شرما کہ ترے حال کی ہے مجھ کو خبر

نام شامل ہے ترا حق کے طلبگاروں میں
تا ابد ذکر رہے گا ترا دینداروں میں

حُر نے کی عرض کہ اے بادشہِ کون مکاں ۳۳ مجھ کو اس بات کا بالکل ہی نہ تھا وہم و گماں
ورنہ میں مانتا حکمِ پسرِ سعد کہاں ؟ آپ کے قتل کا اُمّت نے کیا ہے ساماں

میں جو باعث ہوا حضرت کی دل آزاری کا
ہوں مقر اپنے گناہوں کا خطا کاری کا

اپنے اعمال پہ خفّت ہے ندامت ہے مجھے ۳۴ کہہ نہیں سکتا کہ کس درجہ خجالت ہے کہاں مجھے
اب کسی بات کی خواہش ہے نہ حسرت ہے مجھے بس فقط ایک تمنائے شہادت ہے مجھے

میرے مولا مجھے اب اذنِ وغا مل جائے
جاں قربان کروں ، مجھ کو رضا مل جائے

دی جو حضرت نے رضا حُر سرِ میدان بڑھا ۳۵ ہو کے مسرور غلامِ شہِ ذیشان بڑھا
نصرتِ حق کا لئے سینے میں ارمان بڑھا زور باطل کا گھٹا صاحبِ ایمان بڑھا

برہمی پائی جو لشکر میں ستمگاروں نے
فوج کو اپنی دلاسہ دیا ، سرداروں نے

صورتِ برق چلی حُرِ جری کی تلوار ۳۶ اہلِ باطل کے لئے ہو گیا جینا دشوار
خاک پر خون میں غلطاں نظر آتے تھے سوار کچلے دیتے تھے پیادوں کو ہر اک سور ہوار

گر تھما رن میں کوئی نقش بہ دیوار ہوا
حُر کی تلوار کے اک وار سے فی النّار ہوا

قابلِ دید تھا، ہنگامِ وغا حُر کا جلال ۳۷ طالعِ فوجِ عدد رن میں ہوا رُو بہ زوال
تن تنہا سے تھے سب خوف زدہ یہ تھا کمال موت کے خوف سے بے حال ہوئے بداعمال

قلب سینوں میں جو کفار کے تھرّاتے تھے
ایسی دہشت تھی کہ بے موت مرے جاتے تھے

حملۂ حُر سے ہراساں تھا یزیدی لشکر ۳۸ موت سے ڈھونڈتا پھرتا تھا ہر اک راہِ مفر
وہ تلاطم تھا، نہ تھی باپ کو بیٹے کی خبر نفسا نفسی تھی ہر اک سمت بپا تھا محشر

میمنہ قلب سے لشکر کے جو ٹکراتا تھا
میسرہ فرطِ ندامت سے گڑا جاتا تھا

شمر نے حال یہ دیکھا تو بہت گھبرایا ۳۹ جسم تھرّا گیا، ماتھے پہ پسینہ آیا
بزدلی فوج کی دیکھی تو بہت شرمایا روزِ بد حُرِّ دلاور نے اسے دکھلایا

تھرتھراتا تھا کبھی اور کبھی بل کھاتا تھا
آتشِ غیظ میں خود آپ پھنکا جاتا تھا

کھائے جاتا تھا قلق شمر کو رسوائی کا ۴۰ دل میں کہتا تھا کہ جیتی ہوئی بازی ہارا
حُر کی تلوار نے میدان کا نقشہ بدلا سب ہوا ہو گئے میدان میں رہا
نام کرنے کو جو آئے تھے وہ گمنام ہو گئے
فوج کوفے گئی ، سردار سوئے شام گئے

اپنے بھاگے ہوئے لشکر سے یہ کہتا تھا لعین ۴۱ موت سے بچ کے نکل پاؤ گے ہر گز نہ کہیں
اب فقط ایک ہی تدبیر پہ ہے مجھ کو یقین توڑ اس زور کا تیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
خالی ترکش کئے اس بات پہ بے پیروں نے
حُر کو گھوڑے پہ سنبھلنے نہ دیا تیروں نے

اس قدر تیر چلے دن شبِ دیجور ہوا ۴۲ زخم پہ زخم لگے حُر کا بدن چُور ہوا
دی یہ عباسؑ کو آواز میں مجبور ہوا جان دینا میرا اللہ کو منظور ہوا
کہیئے مولا سے مرے حق میں دعا فرمائیں
عفو اس بندہ عاصی کی خطا فرمائیں

جبکہ مولا کو ملا حُرِؑ دلاور کا پیام ۴۳ دوڑے مقتل کی طرف بادشہِ عرش مقام
ساتھ میں ہو لئے عباسِ علیؑ ، مثلِ غلام ڈر تھا اس بات کا بے ہوش نہ ہو جائیں اِمام
پاؤں حضرت کے رکابوں میں جو تھراتے تھے
ایسا صدمہ تھا کہ گھوڑے سے گرے جاتے تھے

پہونچے بالیں پہ جو مولا تو عجب حال ہوا ۴۴ اپنے مہمان کو تیروں میں تڑپتا دیکھا
چار اطراف میں پیاسے کا لہو بہتا تھا دیکھ کے حال یہ عباسؑ سے بولے مولا

حُر کو جلتی ہوئی ریتی سے اُٹھا دو بھائی
میری آغوش میں مہمان کو لِٹا دو بھائی

جس گھڑی حُر نے سنی شاہِ زمن کو آواز ۴۵ جوڑ کے ہاتھوں کو بولا وہ بصد و عجز و نیاز
یہ فقط آپ کی ہے چشمِ کرم کا اعجاز میں ہوں ممنون بہت ابنِ شہنشاہِ حجاز

آخری وقت میں حضرت کا جو دیدار ہوا
سرخ رو مجھ سے سا زمانے میں گہنگار ہوا

اپنی گستاخی پہ نادم ہوں، پشیماں ہوں میں ۴۶ اُمتی آپ کا ہوں تابعِ فرماں ہوں میں
کچھ نہیں زادِ سفر بے سرو ساماں ہوں میں آخری وقت ہے کچھ دیر کا مہماں ہوں میں

ہے یقیں اس کا کہ فردوسِ بریں جاؤں گا
منہ مگر کس طرح سرکار کو دکھلاؤں گا

سن کے یہ بات تڑپ اُٹھے شہِ نیک خصال ۴۷ کس قدر شاہ کو تھا حُر کی وصیت کا خیال
بخشا مہمان کو، خاتونِ جناں کا رومال حُر کی تقدیر کو چمکا گئے اس کے اعمال

روزِ روشن سے سوا نور تھا پیشانی کا
سر پہ سہرا تھا بندھا قوتِ ایمانی کا

ناگہاں حُرِؓ دلاور کو جو ہچکی آئی ۴۸ پتلیاں پھر گئیں اور سلب ہوئی گویائی
لوَیں کانوں کی مڑیں ، رُخ پہ سپیدی چھائی حر نے آغوشِ امامت میں شہادت پائی

سوئے فردوس غلامِ شہِ ذیشان گیا
لے کے مولا کی دعا صاحبِ ایمان گیا

لاشۂ حُر پہ جو سرور نے بہائے آنسو ۴۹ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو
چشمِ خورشید نے پلکوں سے اٹھائے آنسو مرنے والے نے کلیجے سے لگائے آنسو

حُر کا اخلاص تھا ، اعمال جو مقبول ہوئے
اشک معصوم کے میّت کے لئے پھول ہوئے

○

آداب کے دامن کو نہ چھوڑا میں نے
دھارا سخن و فکر کا موڑا میں نے
انداز نیا ، فکر نئی ، بات نہیں
فرسودہ روایات کو توڑا میں نے

○

دامن میں لیا سبطِ پیمبر نے مجھے
پروانہ دیا حیدر و صفدر نے مجھے
بخشش ہوئی بے پوچھ گچھ روزِ حساب
اور کچھ نہ کہا داورِ محشر نے مجھے

مرثیہ نمبر ۶

آتش بدوش نغمۂ سازِ سخن ہے آج

آتش بدوش نغمۂ سازِ سخن ہے آج ۱ شعلہ بہ دست لالۂ صحنِ چمن ہے آج
افسردہ حال طوطئ گل پیرہن ہے آج ہر سُو محیط عالمِ رنج و محن ہے آج
سینہ قلم کا شق ہے کلیجے پہ داغ ہے
طوفاں کی زد میں نوعِ بشر کا چراغ ہے

دنیا ہے یا کہ آتشِ نمرود کا غبار ۲ مشرق میں خلفشار ہے مغرب میں انتشار
زندانِ زندگی میں ہے آوازِ گیرو دار تہذیب کے گلے پہ ہے تیغِ انا کی دھار.
وہ کش مکش ہے سانس کا لینا محال ہے
ایسا دھواں گھٹا ہے کہ جینا وبال ہے

اُمنڈا ہوا ہے چار طرف سیلِ آتشیں ۳ عفریتِ ظلم و جور چڑھائے ہے آستیں
ماحول میں گھٹن ہے شرابور ہے جبیں آنکھوں میں وہ جلن ہے کہ کچھ سوجھتا نہیں
خنجر ہے ہاتھ میں سمِ قاتل نگاہ میں
منہ پھاڑے موت بیٹھی ہے منزل کی راہ میں

حرص و ہوس کی لاش پہ زندہ ہے آدمی ۴ حمزہ کا دل چبائے وہ ہندہ ہے آدمی
صحرائے زندگی میں درندہ ہے آدمی ہے شیش ناگ مار گزندہ ہے آدمی

انسانیت کا خون ہے منہ کو لگا ہوا
لیتا نہیں ہے لہر بھی اس کا ڈسا ہوا

اپنی اَنا کے زعم میں اژدر ہے آدمی ۵ ابلیست شعار ہے، خودسر ہے آدمی
فرعونِ وقت و مرحب و عنتر ہے آدمی ابنِ زیاد، شمر ستمگر ہے آدمی

صحن چمن میں سرخیٔ خونِ بہار ہے
انسانیت کے حلق پہ قاتل سوار ہے

اوجھل ہوئی ہے منزلِ مقصودِ زندگی ۶ تاریکیاں محیط ہیں، عنقا ہے روشنی
آتش فشاں پہاڑ ہے دنیا بنی ہوئی جھلسا رہی ہے آگ پریشاں ہے آدمی

شعلے بھڑک رہے ہیں جو بغض و عناد کے
دوزخ بنے ہوئے ہیں، بگولے فساد کے

نوعِ بشر کی آج ہے دشوار زندگی ۷ چاروں طرف ہے باعثِ آزارِ زندگی
کیسے اٹھائے طوقِ گرانبار زندگی عالم میں کھچ رہی ہے سرِ دار زندگی

زعمِ اَنا میں طُرفہ تماشا ہے آدمی
اک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے آدمی

منکر ہوا ہے دین سے دنیا سے آدمی ۸ امن و سکون ختم ہے پھیلی ہے ابتری
ہر سو لہولہان ہے کانٹوں پہ زندگی پھر بھی پکارتے ہیں یہ ایمان و آگہی

جاری جہاں میں چشمۂ آبِ حیات ہے
دینِ مُبیں وسیلۂ راہِ نجات ہے

دینِ مُبیں چراغِ ہدایت ہے آج بھی ۹ دینِ مُبیں وسیلۂ رحمت ہے آج بھی
دینِ مُبیں پیامِ محبّت ہے آج بھی دینِ مُبیں جہاں کی ضرورت ہے آج بھی

حق کے نظامِ عدل کا آئینہ دار ہے
دینِ مبیں عطیۂ پروردگار ہے

ہے سب پہ فرض تذکرۂ ذاتِ ذوالجلال ۱۰ کرتا ہوں میں بھی حمدِ خداوندِ بے مثال
جس کی عطا سے ذرّوں نے پایا ہے یہ کمال خورشید پُر جلال ہے، مہتاب پُر جمال

پنہاں فضائے دہر میں دریائے نور ہے
ذرّوں میں عکسِ روشنئ کوہ طور ہے

اوّل بھی اس کی ذات ہے آخر بھی اس کی ذات ۱۱ اس کی صفات ذات ہیں اور ذات ہے صفات
قبضے میں اس کے دن ہے تصرّف میں اس کی رات اک لفظ "کُن" ہے باعثِ تخلیقِ کائنات

صورت میں گو بشر ہیں حقیقت میں نور ہیں
نورِ مُبیں ہیں نقطۂ اول حضورؐ ہیں

وردِ زباں ہوا جو مرے ذکرِ مصطفیٰ ۱۲ آنے لگی درود کی افلاک سے صدا
یہ سب جمال و حُسن ہے صدقہ حضور کا نعمات کا جہاں کو خزانہ عطا کیا
کرتا خدا نہ قصد جو ان کے ظہور کا
دریا کہاں سے ہوتا زمانے میں نور کا

ہے ان کی ذات باعثِ تخلیقِ کائنات ۱۳ قرآن کہہ رہا ہے انہیں مجمع الصفات
ان کی وِلا ہے اصل میں سرمایۂ حیات ان کے سبب ہے سلسلۂ خیر کو ثبات
خُلقِ عظیم و عظمتِ نوعِ بشر ہیں آپ
ہے مبتدا کلام تو اس کی خبر ہیں آپ

صادق ، امین ، سرورِ دیں ، فخرِ انبیاء ۱۴ شاہد ، نذیر ، ختم رسل سید الورا
حامد ، بشیر ، احمدِ مختار و مصطفیٰ نورِ مُبیں و سیّد و سرکارِ دوسرا
پائی سند خدا سے وہ حُسنِ قبول کی
بعد ان کے رہ گئی نہ ضرورت رسول کی

ہے آپ ہی کی ذات وسیلہ نجات کا ۱۵ روزِ حساب بندۂ مومن کا آسرا
مدحِ حضورِ پاک میں کوئی کہے گا کیا یٰسین کہہ کے جس کو مخاطب کرے خدا
شاہد ہر ایک ذرّہ ہے اس کائنات کا
آئینہ ہیں حضورِ خدا کی صفات کا

ذکرِ رسولِ پاک سے معمور ہے فضا ۱۶ آتی ہے چار سمت سے آوازِ ہل اتیٰ
ہے جا بجا زمانے میں تفسیرِ اِنّما اور ساتھ ساتھ ذکر ہے نفسِ رسول کا

فتحِ مباہلہ میں جو ہاتھوں میں ہاتھ ہے
ذکرِ علیؑ بھی ذکرِ محمدؐ کے ساتھ ہے

نفسِ رسولِ پاک ہیں شیرِ خدا علیؑ ۱۷ مولا علیؑ امام علیؑ ، مرتضیٰ علیؑ
زوجِ بتول ، نیرِ دینِ ہدیٰ علیؑ مولائے کائنات ، شہِ لافتیٰ علیؑ

اعلان حکمِ رب ہے یہ خُمِّ غدیر کا
مولا لقب ہوا ہے جنابِ امیر کا

مولا علیؑ کا نام علیؑ ، مرتبہ علیؑ ۱۸ نامِ خدا علیؑ ہے تو حرفِ ندا علیؑ
خیبر میں تھے حضور کا جو مدّعا علیؑ ہر فرد فوجِ پاک کا کہتا ہے یا علیؑ

جس نے لیا یہ نام وہی بامراد ہے
نعرہ علیؑ کے نام کا فتحِ جہاد ہے

میدانِ کار زار میں مشکل کشا علیؑ ۱۹ خیبر شکن ، سفینۂ حق ، نا خدا علیؑ
حلّالِ مشکلات و حاجت روا علیؑ توصیف جتنی ہو سکے اس کے سوا علیؑ

حُبِّ علیؑ حدیثِ رسولِ اَنام ہے
اِن کے محب پہ آتشِ دوزخ حرام ہے

مولا علیؑ ، محافظِ دیں ، شاہِ ذوالفقار ۲۰ حق پر شہید جس کے ہیں حسنین باوقار
پرچم بلند کر گئے عباسِؑ نامدار خطبے جہاں میں رہ گئے زینبؑ کے یادگار
عظمت میں ورثہ دار جو بنتِ نبیؐ کی تھی
زینبؑ ہے جس کا نام وہ بیٹی علیؑ کی تھی

کس طرح ذکرِ زینبِؑ خستہ جگر کروں ۲۱ منزل سفر کی سخت ہے سَر کس طرح کروں
پہلے دلِ شکستہ کو میں نوحہ گر کروں پھر فرشِ راہ روشنئ چشمِ تر کروں
ہوں سوگوار میں بھی شہِ مشرقین کا
بی بی قبول کیجئے پُرسا حسینؑ کا

زینبؑ ضیائے نورِ مُبیں فخرِ ہاجرہ ۲۲ زینبؑ شعاعِ نیّرِ دیں رشکِ آسیہ
زینبؑ نسیمِ صبحِ یقیں ، روحِ آمنہ زینبؑ حسینیت کی امیں ، بنتِ فاطمہ
شعلوں کی زد سے نُورِ مبیں کو بچا لیا
زینبؑ کہ جس نے بارِ امامت اُٹھا لیا

زینبؑ علیؑ کے لال کی جو ہمسفر رہی ۲۳ اقدام سے حسینؑ کے جو باخبر رہی
اسلام کے وقار پہ جس کی نظر رہی دینِ مُبیں کے واسطے سینہ سپر رہی
اہلبیت کو رکھ دیا جس نے جھنجھوڑ کے
جو کربلا میں آئی مدینے کو چھوڑ کے

زینبؑ اصولِ دیں کی نگہبان و پاسباں ۲۴ بیٹوں کو راہِ حق میں نچھاور کیا وہ ماں
جس نے اُڑائیں خرقۂ باطل کی دھجیّاں نقشِ قدم پہ جس کے چلا حق کا کارواں

دینِ مُبیں کی زیست کا سامان تھے حسینؑ
زینبؑ تھی داستان ، جو عنوان تھے حسینؑ

زینبؑ کہ جس کے صبر کے شاہد ہیں مہر و ماہ ۲۵ زینبؑ کہ جس کے عزم کی تاریخ ہے گواہ
زینبؑ کہ جس کے نقش قدم ہیں چراغ راہ زینبؑ شریکِ کارِ شہنشاہِ دیں پناہ

وہ ماں کہ جس نے گود کے پالے فدا کئے
اک اک قدم پہ شکر کے سجدے ادا کئے

کرتا ہوں ذکرِ عون محمدؑ کو اب رقم ۲۶ یا رب عطا ہو اور بھی جولانیٔ قلم
دادا ہے جن کا جعفرِ طیّارِ برق دم نانا ہے جن کا حیدرِ کرّار ذی حشم

چہروں پہ جن کے حُسنِ رسالت ماٰب ہے
اک آفتاب ان میں ہے ، اک ماہتاب ہے

گلزار ہاشمی کے ہیں گل رو یہ نونہال ۲۷ صورت میں بے نظیر تو سیرت میں بے مثال
خوش شکل و خوش مزاج و خوش اطوار و خوشخصال باوصف و باتمیز و بااخلاق و باکمال

آئینہ دارِ حُسنِ ریاضِ رسولؐ ہیں
آغوشِ بنتِ فاطمہ زہرا کے پھول ہیں

جب ہو چکے حسینؑ کے اصحاب سب تمام ۲۸ مقتل میں آئے عون و محمدؑ سوئے امام
دونوں نے جھک کے پاسِ ادب سے کیا سلام بولے امام پاک یہ بچوں سے کیا ہے کام
ہر سمت تیر چلتے ہیں میدانِ جنگ میں
کمسن کہیں نکلتے ہیں میدانِ جنگ میں

بولے ادب سے سر کو جھکا وہ نیک خو ۲۹ ہم کو بھی ہے جہاد کی دنیا میں آرزو
مل جائے اذنِ جنگ تو ہم بھی ہوں سرخ رو کام آئے راہ حق میں ہمارا بھی یہ لہو
دیں گے رضا حضور تو لڑنے کو جائیں گے
ہم دشمنوں کے خون کی ندی بہائیں گے

دیکھا جو شہ نے عون و محمدؑ کا ولولہ ۳۰ کہنے لگے حسینؑ کہ احسنت و مرحبا
حیدرؑ کا زور تم میں ہے جعفرؑ کا حوصلہ پر کیا کہیں گی زینبؑ خاتونِ عالیہ
کم سن ہو تم فضائے جہاں پر فساد ہے
بچو ! تمہارے واسطے ساقط جہاد ہے

سُن کر سخن امام کے دونوں نے یہ کہا ۳۱ خود والدہ نے بھیجا ہے ہم کو پئے وغا
زندہ نہ آنا حکم ہے امّاں حضور کا بس اذن جنگ دیجئے یا سبطِ مصطفیٰ
کل شب قسم یہ کھائی ہے خون میں نہائیں گے
زندہ پلٹ کے خیمے میں اب ہم نہ جائیں گے

سن کر یہ بات کہنے لگے شاہِ خوشخصال ۳۲ اچھا مددگار و حامی و ناصر ہے ذوالجلال
پائی رضا تو کھل اٹھے زینبؑ کے دونوں لال سروِ رواں تھے باغِ محمدؐ کے نونہال
بخشا شرف یہ بادشہِ خاص و عام نے
گھوڑوں پہ خود سوار کیا ہے امام نے

مقتل کی سمت جب چلے زینبؑ کے مہر و ماہ ۳۳ بادل کی طرح آگے بڑھی کفر کی سپاہ
دشمن کی صف پہ عون و محمد نے کی نگاہ تھا بس نظر میں اک پسرِ سعد پُر گناہ
کہتے تھے دونوں کاٹیں گے سر نابکار کا
ماریں گے اس کو توڑ کے حلقہ حصار کا

جھپٹے یہ کہہ کی فوجِ عدو پر وہ دونوں شیر ۳۴ روکے نہ رک سکے کسی دشمن سے وہ دلیر
آئے تھے دشمنوں کو کہاں قسمتوں کے پھر میداں میں چار سمت پڑے تھے سروں کے ڈھیر
اک شور تھا کہ جعفرِ طیّار آ گئے
غُل پڑ گیا کہ حیدرؑ کرار آ گئے

دونوں بڑھے جدھر بھی، صفیں ہو گئیں تمام ۳۵ فوجیں عدو کی آ نہ سکیں دشمنوں کے کام
پاؤں کو سر پہ رکھ کے جو بھاگی سپاہِ شام تھا ٹھوکروں میں حاکمِ کوفہ کا انتظام
منہ جس طرف بھی اُٹھ گیا، رَن سے نکل گئے
بھاگے سوار ایسے کہ پیدل کچل گئے

دیکھی وہ جنگ اُڑ گئے عرشِ بریں کے ہوش ۳۶ قائم رہے نہ خوف سے گاؤ زمیں کے ہوش
مرتے ہوؤں کو تھے نہ دمِ واپسیں کے ہوش وہ رن پڑا کہ اُڑ گئے شمر لعیں کے ہوش
سردار پا سکے نہ مفر جب قیام میں
دہشت کے مارے چھپ گئے جا کر خیام میں

خیمے میں اپنے تھا پسرِ سعد بد نہاد ۳۷ شعلہ بنا تھا آگ کا وہ پیکرِ عناد
جھلسائے دیتی تھی تپشِ فتنہ و فساد کہتا تھا کسی میں ہے کیا جذبۂ جہاد
بچوں سے جنگ کرنے کو بڑھتا نہیں کوئی
کیا بزدلوں کی فوج ہے لڑتا نہیں کوئی

نکلا وہ چھپ کے خیمے سے دی شمر کو صدا ۳۸ لڑنا ہے یا کہ چلنا ہے، ہے قصد تیرا کیا
آ کر قریب شمرِ ستمگر نے یہ کہا آساں نہیں ہے کچھ بنی ہاشم کا سامنا
جانیں بچائیں اپنی ، نہ پیشِ اجل چلیں
بہتر یہی ہے آؤ یہاں سے نکل چلیں

بولا یہ ابنِ سعد کہ ہے مشورہ بجا ۳۹ لیکن یہاں سے جانے کے تدبیر ہو گی کیا
اتنے میں اس نے دیکھا کہ اک شور سا اٹھا نکلے تھے بھاگتے ہوئے خیموں سے اشقیا
گھیرے ہوئے تھی موت ہر اک بد نہاد کو
زینبؑ کے لال آج چڑھے تھے جہاد کو

سن کے یہ شور دونوں نے دیکھا ہر ایک سو ۴۰ مارے ہوئے تھی ، موت سے بچنے کی آرزو
خاموش تھے نہ ان میں تھا یارائے گفتگو اک دوسرے کی بات سمجھتے تھے کہ جو
پہونچے خبر جو کوفے میں اس سرگزشت کی
ثابت نہ ذمّہ داری ہو ان پر شکست کی

اتنے میں یہ خبر ملی واپس گئے جری ۴۱ سن کر یہ بات دونوں میں پھر آئی زندگی
فوجیں بلائیں بھیج کے ہر سمت آدمی چاروں طرف سے آگئے بچوں کے پھر شقی
کڑکیں کمانیں تیروں کے بادل سے چھا گئے
زینبؑ کے لال خون میں اپنے نہا گئے

چاروں طرف سے بچوں کو گھیرے تھے اشقیا ۴۲ زد میں تھے ظلم وجور کے زینبؑ کے مہ لقا
انسانیت کو بھول گئے ، بانیٔ جفا مارے تبر کبھی ، کبھی نیزہ چبھو دیا
لختِ دلِ حسینؑ گرے فرش خاک پر
زینبؑ کے نور عین گرے فرش خاک پر

جسدم کہ فرشِ خاک پہ آئے وہ جانثار ۴۳ بہتا تھا خون ، پیاس سے دونوں تھے بے قرار
کرب و بلا کی خاک پہ تھی سرخیٔ بہار مرجھا رہے تھے دھوپ میں زینبؑ کے گلعذار
زخموں سے ریگِ گرم ، شہ دیں نکال لیں
جی چاہتا تھا گود میں امّاں سنبھال لیں

کانٹے پڑے تھے حلق میں بے جاں تھے خستہ تن ۴۴ سنولا گئے تھے دھوپ کی شدّت سے گلبدن
چہروں سے ایسا حُسنِ شجاعت تھا ضو فگن کچھ اور بڑھ گیا تھا شہادت سے بانکپن

ماتھے پہ موتیوں کی لڑی دیکھتی رہی
وہ حُسن تھا کہ موت کھڑی دیکھتی رہی

مٹی ہوئے تھے لختِ دل جانِ بوتراب ۴۵ حدّت سے موتیوں کی اُڑی جا رہی تھی آب
پیلا پڑا تھا دیکھ کے یہ رنگ آفتاب چشمِ فلک کو حضرتِ زینبؑ سے تھا حجاب

دیکھی گئی نہ جور و جفا آسمان سے
رونے کی آ رہی تھی صدا آسمان سے

نظروں میں تھا حسینؑ کے میدانِ کربلا ۴۶ آئے نظر نہ تیروں میں زینبؑ کے مہ لقا
مولا نے دی یہ حضرتِ عباسؑ کو صدا بھیا چلو کہ عون و محمدؑ ہوئے فدا

مقتل سے لاشیں عون و محمدؑ کی لے کے آئیں
زینبؑ کو ان کے گود کے پالوں کو دے کے آئیں

پہنچے فرس اُڑا کے جو عباسِؑ نامدار ۴۷ بھاگے وہاں سے جان بچا کر ستم شعار
دیکھا تو دونوں پھول سے بچے تھے بے قرار چھلنی ہوئے تھے تیروں سے زینبؑ کے گلعذار

اتنا لہو بہا تھا بدن ان کے سرد تھے
تشنہ لبی سے پھول سے رخسار زرد تھے

وہ کرب تھا کہ تھا کسی کروٹ نہ ان کو چین ۴۸ جلتی ہوئی زمیں پہ تھے زینبؑ کے نورِ عین
وہ ضعف تھا کہ اُٹھ نہ سکے آئے جب حسینؑ سرہانے انکے بیٹھ گئے شاہِ مشرقین
پھر دیکھتے ہی دیکھتے کلیاں بکھر گئیں
دونوں کی روحیں ساتھ میں پرواز کر گئیں

لائے جو لاشیں دونوں کی خیمے میں شاہِ دیں ۴۹ دیکھا کہ جا نماز پہ ہیں زینبِؑ حزیں
شکر خدا ہے لب پہ تو سجدے میں ہے جبیں! کہنے لگے حسینؑ کہ زینبؑ ہو آفریں
بھوکے بھی تھے پیاسے بھی تھے خورد سال تھے
لیکن وغا میں بڑھ کے یہی نونہال تھے

سُن کر سخن امام کے زینبؑ کا سر اٹھا ۵۰ پوری ہوئی نماز دعاؤں کا پھل ملا
خاموش تھیں، زبان سے اپنی نہ کچھ کہا اللہ رے صبر آنکھ سے آنسو نہیں بہا
دیکھا جو ضبطِ گریۂ خواہر چلے گئے
مولا حسینؑ خیمے سے باہر چلے گئے

مولا گئے تو کہنے لگی سوگوار ماں !! ۵۱ اے بیبیو بتاؤ میرے لال ہیں کہاں
لاشیں دکھاؤ تا کہ تصدق ہو نیم جاں چھایا ہوا ہے آنکھوں کے آگے مرے دھواں
سورج تو اتنی جلد کبھی ڈوبتا نہیں
کیا رات ہو گئی ہے مجھے سوجھتا نہیں

بتلاؤ بیبیو میرے خورشید ہیں کہاں ۵۲ مجھ کو بٹھا دو دونوں کے لاشوں کے درمیاں

امّاں سے سرخ رو کیا قربان جائے ماں ان پر زمیں بھی روئے گی روئے گا آسماں

میدانِ کار زار میں کیا نام کر کے آئے

میں جیسا چاہتی تھی وہی کام کر کے آئے

فضّہ ہمارے شمس و قمر ہیں کہاں بتاؤ ۵۳ اے اُمِّ لیلیٰ لختِ جگر ہے کہاں بتاؤ

اے شہر بانو ، نورِ نظر ہیں کہاں بتاؤ مجھ غم زدہ کے دیدۂ تر ہیں کہاں بتاؤ

منّت بڑھاؤں بیٹوں کی زلفیں سنوار لوں

دولہا بنے ہیں لاؤ میں صدقہ اُتار لوں

بس اے قلم نڈھال ہوئی سوگوار ماں ۵۴ سر کو جھکائے بیٹھی ہے لاشوں کے درمیان

بچے فسردہ حال ہیں ، روتی ہیں بیبیاں الفاظ جل رہے ہیں نکلنے لگا دھواں

آغا ادب سے دیجئے پُرسہ امام کو

شہرت جہاں میں اور ہو ترے کلام کو

مرثیہ نمبر ۷

مجلس میں ذکرِ عظمتِ نوعِ بشر ہے آج

مجلس میں ذکرِ عظمتِ نوعِ بشر ہے آج ۱ پیشِ نگاہ حُسنِ طلوعِ سحر ہے آج
انساں کی زد میں گردشِ شمس و قمر ہے آج تسخیرِ کائنات پہ سب کی نظر ہے آج
انسان پہونچ گیا ہے جو ماہِ مبیں پر
رکھتا نہیں ہے فخر سے پاؤں زمیں پر

تسخیرِ کائنات جو ہے مطمحِ نظر ۲ چٹکی میں اس کے آج ہے تقدیرِ دشت و در
حلقہ بگوش اس کے ہیں عفریتِ بحر و بر جھنڈے گڑے ہیں، اس کے سرِ کوہسار پر
معنی بدل کے رکھ دیئے امرِ محال کے
لایا سمندروں سے یہ موتی نکال کے

اس کے نگار خانے کی زینت گلوں کے ہار ۳ گلدستہ اس کے ہاتھ میں سرمایۂ بہار
خونِ جگر سے کر دیا صحرا کو لالہ زار !! جکڑے ہوئے ہے پنجۂ آہن میں کوہسار
سنگِ گراں تراش کے ہیرا بنا دیا
اس نے جواہرات کا سُرمہ بنا دیا

ہے دوربین نگاہ جو شیشہ بنا دیا !! ۴ پردہ پڑا تھا آنکھ پہ اس کو اٹھا دیا
لا کر قریب دور کا جلوہ دکھا دیا میلوں کا فرق اس نے گزوں میں گھٹا دیا !!

واقف ہے اس کی آنکھ سپید و سیاہ سے
اوجھل رہا نہ کوئی بھی اس کی نگاہ سے

پتھر کو آب دے کے اسے لال کر دیا ۵ سونے کو آنچ دے کے زر و مال کر دیا
لوہا گلا کے آتشِ سیال کر دیا تقسیم وقت کر کے مہ وسال کر دیا

واقف ہے مہر و مہ کے عروج و زوال کا
رکھتا ہے یہ حساب ستاروں کی چال کا

پانی کو جوش دے کے ہوا میں اڑا دیا ۶ رہوار آہنی کا رگِ جان بنا دیا
ہیبت میں فیلِ مست کا سا طنطنہ دیا دیوِ سیاہ فام کا جادو جگا دیا

سینے میں آگ ، قلب میں طوفان لئے ہوئے
مثل غلام پھرتا ہے ، ساماں لئے ہوئے

مصروف تجربات میں انساں ہے صبح و شام ۷ تھامے ہوئے ہے ابلقِ ایّام کی لگام
لیتا ہے یہ عناصرِ قدرت سے اپنا کام بجلی کنیز اس کی ہے آبِ رواں غلام

دریا شکست کھا گئے مُشتِ غُبار سے
کھینچی ہے اس نے برق کی رو آبشار سے

تاروں کا جال اس نے جہاں میں بچھا دیا ۸ تاریکیوں میں نور کا دریا بہا دیا
سویا ہوا تھا شب کا مقدر ، جگا دیا گھر بیٹھے سب کو طور کا جلوہ دکھا دیا

باندھا شعاعِ برق کو باریک بال سے
شیشے میں اس پری کو اُتارا کمال سے

واقف ہوا جہاں کے نشیب و فراز سے ۹ نغمے سمیٹتا ہے لبِ نَے نواز سے
فردوسِ گوش پا گیا تاروں کے ساز سے مسحور غزنوی ہے زبانِ ایاز سے

نغمے اُبل رہے ہیں چمکتے نشان سے
گھر بیٹھے آ رہی ہے صدا آسمان سے

شاہد ہیں اس کے جہدِ مسلسل کے مہر و ماہ ۱۰ دستِ عمل سے اس کے برابر ہیں کوہ و کاہ
پُر ہے نوادرات سے اس کی تجربہ گاہ ہاتھوں میں ہے کلیدِ درِ جنّتِ نگاہ

جنبش جو دی تو برق سی پردے پہ چھا گئی
بلقیسِ وقت قصرِ سلیماں میں آ گئی

دوشِ ہَوا پر صَوت کی موجوں کو جا لیا ۱۱ چشمِ زدن میں عکس کی لہروں کو پا لیا
دستِ عمل سے تختِ سلیمان بنا لیا اوجِ فضا پہ جا بجا قبضہ جما لیا

حیراں ملک ہیں آدمِ خاکی کی شان پر
اس کے چراغ جلنے لگے آسماں پر

روزِ ازل سے کش مکشِ روزگار تھی ۱۲ جکڑا ہوا تھا پنجۂ فطرت میں آدمی
ہوتی رہی تھی مار ، بڑی چار چوٹ کی سنوری ہے جا کے تب کہیں انسان کی زندگی
قسمت بنی ، نتیجۂ حُسنِ عمل ملا
تسخیرِ ماہ ، جہدِ مسلسل کا پھل ملا

پیدا کیا ہے توڑ کے ذرّے کو آفتاب ۱۳ روزِ ازل سے جس میں حرارت تھی محوِ خواب
ہر لحظہ انکشاف ہے ، ہر لمحہ انقلاب کُھلتا ہے روز ایک نیا زندگی کا باب
دل کا بدلنا رازِ حیات و ممات ہے
مُردے جِلا رہا ہے ، مسیحا صفات ہے

انساں کو لے گیا ہے کہاں ذوقِ جستجو ! ۱۴ مجنوں صفت بنائے ہے لیلئِ آرزو !
نوکِ زباں ہے اور سنورنے کی گفتگو پھرتا ہے دشتِ زیست میں آوارہ چار سو
لیکن حقیقتوں کو ابھی جانتا نہیں
اک اور زندگی ہے اسے مانتا نہیں ؟

وہ زندگی جو اصل میں ہے اصل زندگی ۱۵ قائم ہے جس کے دم سے محبّت کی روشنی
جس کے چراغِ راہ ہیں ایمان و آگہی وہ زندگی کہ جو ہے حقیقی و دائمی
پاکیزگی کی ، زُہد کی ، تقویٰ کی زندگی
خوفِ خدا ، تصوّرِ عقبیٰ کی زندگی

ایثار و انکسار و مروّت کی زندگی ۱۶ احسان و اتفاق و اُخوت کی زندگی
ایمان و اعتقاد و شرافت کی زندگی اخلاق و اعتبار و اعانت کی زندگی
سجدے کو مہر و ماہ بھی پیشِ بشر جھکیں
وہ زندگی کہ جس پہ ملائک کے سر جھکیں

اِسلام اِن صفات کا حامل ہے آج بھی ۱۷ اقدار زندگی میں یہ کامل ہے آج بھی
جو کل تھا حُسنِ زیست وہ شامل ہے آج بھی مخلص گروہ ، دین پہ عامل ہے آج بھی
سر شار ہے جو عشقِ رسالت مآب سے
وابستہ آج تک ہے درِ بُوتراب سے

عشقِ رسولؐ پاک کا ہوتا ہے تذکرہ ۱۸ کچھ اور رنگ لائے گی تحریر جانفزا
دل کھنچ رہا ہے دیکھ کے جامِ مئے وِلا آئی کہیں سے ساقیٔ کوثر کی یہ صدا
تو منتظر ہے تحفۂ حُسنِ قبول کا
لے تجھ کو جام دیتا ہوں عشقِ رسولؐ کا

پایا جو یہ شرف تو بڑھا دل کا ولولہ ۱۹ نوکِ زباں سے مدحتِ ممدوحِ کبریا
شہرہ جہاں میں ہو گیا میرے کلام کا باغِ جناں کا میں بھی خریدار ہو گیا
صدقہ ہے ذکرِ سرورِ عالی مقام کا
سر پر ہے میرے تاج بقائے دوام کا

طاعت ہے کبریا کی اطاعت حضور کی ۲۰ بالائے فکر و فہم ہے عظمت حضور کی

تصدیق انبیا ہے صداقت حضور کی تکمیلِ دینِ حق ہے رسالت حضور کی

افضل ہے ذکرِ خیر رسالت مآب کا

جس نے دیا علیؑ کو لقب بُو تراب کا

بعدِ رسولؐ ، ذکر ہوا بو تراب کا ۲۱ نوکِ قلم سے چشمۂ زمزم اُبل پڑا

ہے ان کی ذرّیت میں امامت کا سلسلا کنبہ ہے ان کا کشتیٔ اُمّت کا ناخدا

اقلیمِ دینِ حق کے یہی تاجدار ہیں

سرکارِ دو جہاں کے یہی ورثہ دار ہیں

پیشِ نگاہ ان کے ہے معبود کی رضا ۲۲ حق ان کا مدعا ہے تو یہ حق کا مدعا

بعدِ رسولؐ ہیں یہ وسیلہ نجات کا نورِ ہدیٰ مُفسّرِ آئینِ مصطفیٰ

لازم تھا کوئی حق کی حفاظت کے واسطے

ان کو چنا خدا نے امامت کے واسطے

اس در کا فیض چشمۂ ایمان و آگہی ۲۳ سنوری یہیں سے حضرتِ بوذرؓ کی زندگی

کتنے بڑھے مدارجِ سلمانؓ فارسی عزّت یہیں سے میثمِ تمّار کو ملی

اہلِ ولا کے قافلہ سالار ہو گئے

کھنچے گئے جو دار پہ سردار ہو گئے

مقداد کے وقار کا ہمسر نہیں کوئی ۲۴ عظمت میں مثلِ مالکِ اشتر نہیں کوئی
عمارِ خوش سیر کے برابر نہیں کوئی حُسنِ عمل میں صورتِ قنبرؔ نہیں کوئی

یہ برکتیں ہیں فیضِ درِ بوتراب کی
ذرّوں میں آ گئی ہے جھلک آفتاب کی

افکار ان کے نورِ ہدایت کا آئینہ ۲۵ گفتار ان کی حق و صداقت کا آئینہ
کردار ان کے حُسنِ شرافت کا آئینہ رفتار ان کے راہِ متانت کا آئینہ

حرص و ہوس نہ جن کے قدم ڈگمگا سکے
ایسے بشر کہ جن کو فرشتے نہ پا سکے

مڑتا ہے پھر قلم طرفِ ذکرِ بُو تراب ۲۶ پیلے پڑے چراغ اُبھرتا ہے آفتاب
پھیلی نسیمِ صبح ، مہکنے لگے گلاب کھُلتا ہے پھر سے مدحتِ نفسِ نبی کا باب

حُسنِ کلام ، نامِ وصیِؐ نبی ہوا
آئی صدا درود کی ذکرِ علیؑ ہوا

مولا علیؑ ، وصیِؐ نبی ، شاہِ ذوالفقار ۲۷ دستِ خدا ، محافظِ حق ، فخرِ روزگار
ایمانِ کُل ، چراغِ ہدایت ، فلک وقار مولائے کائنات ، امامت کے تاجدار

اُمّت کو ناز کیوں نہ ہو ایسے امیر پر
جو زندگی گزار دے نانِ شعیر پر

ہیں جس کے در کی خاک فقیہانِ نامدار ۲۸ علم الکلام زورِ خطابت سے آشکار
ہے ، جن کے اہلبیت سے اسلام کا وقار جن کی وِلا پہ دولتِ ایماں کا انحصار
کیا منزلت ہے فاتحِ بدر و حنین کی
کافی ہے جس کے حق میں شہادت حسینؑ کی

مدّاح جس کی آپ محمدؐ کی ذات ہے ۲۹ گو خود نبی نہیں ، پہ نبوّت صفات ہے
حبلِ متیں وسیلۂ راہِ نجات ہے بنتِ رسولؐ جس کی شریک حیات ہے
روشن دلیل نُورِ نگاہِ بتولؑ ہے
مولا علیؑ کی آل ہی آلِ رسولؐ ہے

یہ مرتبہ کسی کو جہاں میں کہاں ملا ۳۰ فرزند جس کے ہوں ، پسرِ سیّد الورا
ہے ان کی آل سورۂ کوثر کا مدعا حسنینؑ باوقار سے یہ سلسلہ چلا
قائم فروعِ دیں بھی ہیں ، اصلِ اصول بھی
اسلام بھی انہیں سے ہے نامِ رسولؐ بھی

جو بات کہہ رہا ہوں نہیں کچھ مبالغا ۳۱ مقصود ان کی ذات ہے ذبحِ عظیم کا
اس بات پر گواہ ہے میدانِ کربلا اسلام کی بقا کے لئے کس کا گھر جلا
ثابت ہے یہ حدیثِ شہِ مشرقین سے
میرا حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے

بے شک حسینؑ ہی سے ہے پیغامِ مصطفیٰ ۳۲ جو کربلا میں باعثِ فتحِ مُبیں ہوا
روشن ہے جس سے نورِ ہدایت کا سلسلہ حق کر رہا ہے فتنۂ باطل کا سامنا
آوازہ گونجتا ہے پیامِ حسینؑ کا
سکہ رواں ہے آج بھی نام حسینؑ کا

انسانیت کا درس پیامِ حسینؑ ہے ۳۳ کیا لازوال نقشِ دوامِ حسینؑ ہے
محفوظ لوحِ ذکرِ امامِ حسینؑ ہے زینبؑ مگر محافظِ نامِ حسینؑ ہے
فتنہ اُٹھا تھا کُفر کا ، ناکام ہو گیا
زینبؑ سے ذکر شاہ ہدیٰ عام ہو گیا

زینبؑ جو شرحِ مقصدِ اصلِ اصول تھی ۳۴ زینبؑ جو ورثہ دارِ علیؑ و بتول تھی
زینبؑ جو نورِ چشمِ نگاہِ رسولؐ تھی زینبؑ جو گلستانِ محمدؐ کا پھول تھی
صدمے اٹھائے شہ کی رفاقت کے واسطے
لیکن کہا نہ بھائی سے بیعت کے واسطے

ہنگامِ عصر سرخ تھا میدان کربلا ۳۵ گھوڑوں کی زد میں راکبِ دوشِ رسولؐ تھا
انسانیت کی لاش کُچلتے تھے اشقیا زینبؑ نے بڑھ کے پرچمِ دیں کو اٹھا لیا
مثلِ حسینؑ آہنی دیوار بن گئی
بیٹی علیؑ کا قافلہ سالار بن گئی

جلتے ہوئے خیام سے اٹھتا رہا دھواں ۳۶ بچے سہم رہے تھے لرزتی تھیں بیبیاں
بسترِ کہیں تھا اور کہیں سجاد ناتواں آلِ نبی کی اس گھڑی زینبؑ تھی پاسباں
آئی جو آنچ ، کھُل گئے جوہر کمال کے
لے آئی سب کو خیمے سے باہر نکال کے

گو ظالموں نے چادرِ زہراؑ اتار لی ۳۷ زینبؑ نے زلفِ دینِ پیمبرؐ سنوار لی
ڈوبی ہوئی تھی دین کی کشتی ابھار لی ہاتھوں میں اپنے گردشِ لیل و نہار لی
بھائی نے سر کٹا کے جو عزمِ سفر کیا
زینبؑ نے ملک شامِ غریباں کو سر کیا

آئی جو رات ، چاند کے چہرے پہ داغ تھا ۳۸ کشتہ زمیں میں پہ آلِ نبی کا چراغ تھا
ماؤف غم سے عرشِ بریں کا دماغ تھا بکھرا زمیں پہ آلِ محمدؐ کا باغ تھا
حیرت زدہ ہے ، دشتِ بلا کی اجاڑ رات
زینبؑ نے کس طرح سے گزاری پہاڑ رات

باندھے گئے رسَن سے ہر اک خستہ تن کے ہاتھ ۳۹ بادِ خزاں کی زد میں تھے سرو سمن کے ہاتھ
آویزاں گل کے ساتھ گل پرہن کے ہاتھ وابستہ ساتھ ساتھ تھے رنج و محن کے ہاتھ
لیکن پیام حق کو نہ باطل دبا سکا
نور کلام پاک کو باندھا نہ جا سکا

بازار سے جو کوفے کی یہ قافلہ چلا ۴۰ نیزے پہ سر بلند تھے سلطانِ کربلا

آتی تھی آسمان سے قرآن کی صدا روتے تھے اہلِ درد۔ پریشان تھے اشقیا

بیٹی تھی گو رسن میں علیؑ و بتولؑ کی

لیکن نگاہ باں تھی پیامِ رسولؐ کی

پُر تھے تماش بینوں سے کوفے کے بام و در ۴۱ رخسار تھے سبھوں کے مگر آنسوؤں سے تر

سب پوچھتے تھے یہ کہ ہے نیزے پہ کس کا سر زینبؑ نے تب کلام کیا اک مقام پر

نوکِ سناں پہ سر ہے شہِ مشرقین کا

اے اہل کوفہ ساتھ ہے کنبہ حسینؑ کا

کیا مرتبہ ہے زینبِؑ عالی مقام کا ۴۲ اک اک قدم پہ ساتھ دیا ہے امام کا

خطبہ بتا رہا ہے یہ دربارِ شام کا دریا رواں زباں سے تھا علم الکلام کا

مثلِ علیؑ بلند تھا لہجہ خطاب کا

اک درس تھا کھُلا ہوا اُمّ الکتاب کا

دنیا تھی دنگ ہاشمی لہجے کی شان پر ۴۳ مبہوت اہلِ علم تھے زورِ بیان پر

حیرت زدہ تھے جنّ و ملک آسماں پر مُہرِ سکوت ثبت تھی ہر اک زبان پر

کیا گفتگو تھی خواہرِ شاہِ انام کی

تشریح ہو رہی تھی خدا کے کلام کی

حمدِ خدا سے کفر کا سینہ تھا چاک چاک ۴۴ تھا دشمنوں میں تذکرہ اہلبیتِ پاک
باطل پرست ڈالے ہوئے تھے سروں پہ خاک پیش نظر تھی حشر کی تصویرِ ہولناک

ایسا اثر تھا بنتِ علیؑ کے خطاب کا
خدشہ یزیدیوں کو ہوا انقلاب کا

وحشت زدہ تھا ڈر سے یزیدِ ستم شعار ۴۵ تھرّا رہا تھا تخت پہ بیٹھا وہ نابکار
چہرہ ہوا تھا زرد نحوست تھی آشکار ہر سُو قبائے ظلم کا دامن تھا تار تار

اعلانِ حق سے شام کا دربار ہل گیا
سارا غرور خاک میں ظالم کا مل گیا

زینبؑ کھڑی تھیں پیشِ لعین فرشِ خاک پر ۴۶ خِفّت سے سر جھکائے ہوئے تھے سب اہل شر
پکڑے زمیں تھی پاؤں، کسی کو نہ تھا مفر نادم تھے اپنے ظلم پہ ظالم جھکائے سر

حکمِ یزید سے تھا لُٹا گھر حسینؑ کا!
زندہ ثبوت خاک پہ تھا سر حسینؑ کا

کہنے لگا یزید کہ اے بنتِ مرتضیٰ ۴۷ دیکھا تمہارے بھائی سے خالق نے کیا کیا
سُن کر یہ بات زینبِؑ مظلوم نے کہا بھائی کو میرے مل گئی اللہ کی رضا

کچلا سرِ غرور، شہِ مشرقین نے
اسلام کو بچا لیا بھائی حسینؑ نے

اترا نہ اپنے تخت پر اتنا رہے خیال ۴۸ دیتا ہے ڈھیل ظالموں کو ربِ ذوالجلال
ظالم کا ظلم بنتا ہے خود موجبِ زوال ورنہ یہ سرکشی کرے انسان کیا مجال

دنیا ہے چند روزہ بڑی اس کی شان ہے
ہم اہلِ بیتِ پاک کا یہ امتحان ہے

اعلانِ حق تھا ، نبتِ علیؑ کے کلام میں ۴۹ اک کھل بلی سی مچ گئی دربارِ شام میں
ظالم یزید تھا نگہِ خاص و عام میں خود اپنے آپ آ گیا صیّاد دام میں

چہرہ سیاہ پڑ گیا باطل پرست کا
احساس تھا یزید کو اپنی شکست کا

اِس طرح جب ذلیل سرِ عام وہ ہوا ۵۰ پہلو بدل کے اس نے سکینہؑ سے یوں کہا
تجھ سے ترے حسینؑ کو حد درجہ پیار تھا کہنے لگی کہ ہاں مجھے بابا تھا چاہتا

ہوتا تھا دن تو چین سے گودی میں ہوتی تھی
اور شب کو اپنے بابا کے سینے پہ سوتی تھی

سن کر سخن یتیم کے بولا وہ بدشعار ۵۱ مجھ کو نہیں ہے کچھ تری باتوں کا اعتبار
دیکھونگا میں حسینؑ کو کتنا تھا تجھ سے پیار دعویٰ ہے سچ تو بابا کو دربار میں پکار

رکھتا ہے دل میں درد اگر نورِ عین کا
گودی میں آئے سر ترے بابا حسینؑ کا

جب کر چکا کلام سکینہ سے بد گہر ۵۲ ڈالی سرِ حُسینؑ پہ مظلوم نے نظر
بولی کہ امتحان ہے مرا شاہِ بحر و بر دربار میں ہنسیں نہ کہیں مجھ پر اہل شر

لرزی زمیں ، فلک پہ اندھیرا سا چھا گیا
بابا کا سر یتیم کی گودی میں آ گیا

آغوش میں جو بیٹی کے آیا سر حسینؑ ۵۳ دیکھا سبھوں نے معجزۂ شاہ مشرقین
اہلِ حرم نڈھال تھے ، برپا تھا شور شین دل توڑتے تھے زینبؑ خستہ جگر کے بین

دربار ہل گیا در و دیوار رو دیئے
کانپا کلیجہ عابدِ بیمار رو دیئے

بس اے قلم خموش کہ دربار سر ہوا ۵۴ صبر و رضا کا جادۂ دشوار سر ہوا
کوفے کی راہ ، شام کا بازار ، سر ہوا صبح یقین سے قصر شب تار سر ہوا

حق پروری پہ فاتحِ دربارِ شام کی
چادر چڑھائی جاتی ہے زینبؑ کے نام کی

مقبول مرثیہ ہوا ، آغاؔ دعا کرو ۵۵ کس درجہ کا اوج پایا ہے شکرِ خدا کرو
مجلس میں اور ذکرِ شہِ کربلا کرو اس طرح روز و شب یہ عبادت کیا کرو

ہو گا کرم جو بادشہِ کائنات کا
یہ مرثیے بنیں گے وسیلہ نجات کا

مرثیہ نمبر ۸

مجلس میں آج روشنئ صبحِ یقین ہے

مجلس میں آج روشنئ صبحِ یقین ہے ۱ ایماں کی ضیا سلسلۂ حبلِ متیں ہے
آغازِ بیاں تذکرۂ فتحِ مُبیں ہے خورشیدِ سخن آیئنۂ نیّرِ دیں ہے

شہبازِ قلم ، برق قدم ہو کے چلے گا
شہپارۂ فن نور کے سانچے میں ڈھلے گا

عنوانِ سخن ہوں گی جو قرآن کی آیات ۲ اُبھرے گا نئے رنگ سے خورشید خیالات
ہوتی رہیں اس طرح جو خالق کی عنایات اُتریں گے دلوں میں مرے الفاظِ مناجات

مجلس میں جو ذکرِ شہِ ابرار کروں گا
عالم کی فضا مطلعِ انوار کروں گا

آئے گا جو قرطاس پہ مضمون سنور کر ۳ بن جائے گا فن عطرِ خیالات تتھر کر
چمکیں گے جو الفاظ مرے دل میں اتر کر اشکوں کی لڑی آئے گی پلکوں پہ ابھر کر

تحفہ ہے مرا جذبۂ دل اہلِ ولا کو
میں عام کئے دیتا ہوں خالق کی عطا

بخشا ہے مجھے خالقِ یکتا نے وہ جوہر ۴ انگشت بہ دنداں ہیں زمانے کے سخنور
معراج مرے فن کی ہے توصیفِ پیمبرؐ مولا کی عنایات سے چمکا ہے مقدر
منبر جو ملا مدحِ شہنشاہِ نجف سے
پہونچا ہوں کہاں ، مرثیہ گوئی کے شرف سے

تاباں ہیں مضامیں کے گہر شمس و قمر سے ۵ روشن ہے عقیدت کا چمن دیدۂ تر سے
پر نور ہے اندازِ بیاں ذوق نظر سے ضوبار ہے قندیلِ سخن خون جگر سے
حامل جو ہے تحریر میری صدق صفا کی
گلدستۂ افکار میں خوشبو ہے وِلا کی

جتنا بھی کروں شکرِ عنایات وہ کم ہے ۶ سر پر مرے عباسِؑ دلاور کا علَم ہے
آیئنہ جذبات مرا دیدۂ نم ہے ذکرِ شہ ابرار سے یہ زورِ قلم ہے
دربارِ حسینی میں دعاؤں کا اثر ہے
قرطاسِ سخن معدنِ الماس و گہر ہے

ہیں نوک زباں سورۃ اخلاص کے انوار ۷ توحید کی باتوں سے ہے یکتائی گفتار
تثلیث کے انکار سے ہے وحدتِ افکار کافر ہے جو اس بات کا کرتا نہیں اقرار
بے مثل ہے وہ اس کے برابر نہیں کوئی
کونین میں اللہ کا ہمسر نہیں کوئی

اوّل سے بھی اوّل ہے وہ واحد ہے اَحد ہے ۸ آخر سے بھی آخر ہے وہ قائم ہے صَمد ہے
افضل سے بھی افضل ہے وہ بالائے خرد ہے . ناقابلِ تقسیم ہے وہ ایسا عدد ہے

محدود ہے یہ ذہن رسا پا نہیں سکتا
انساں کے تصوّر میں خدا آ نہیں سکتا

لازم ہے مگر معرفتِ ذات حقیقی ۹ بندے کیلئے شرط ہے اقرارِ الٰہی
عالم میں نہیں حاکیت اور کسی کی یہ بات ہمیں مخبر صادق نے بتائی

وہ مخبرِ صادق جو صداقت کا امیں ہے
وہ ختمِ رسل جو کہ رسالت کا نگیں ہے

ہے پیشِ نظر تذکرہ سیّدِ ابرار ۱۰ الفاظ میں دریائے فصاحت ہے نمودار
شیریں سخنی ہے سببِ لذّتِ گفتار ہیں گنجِ گرانمایہ یہ افکارِ گرانبار

خالق کی عنایت ہے یہ بخشش ہے عطا ہے
مداح ہوں میں جس کا وہ ممدوح خدا ہے

عنواں جو کیا ذکرِ شہنشاہِ زمن کو ۱۱ معراج ملی حُسنِ عقیدت کے چمن کو
کس درجہ ملا اوج مرے طرزِ سخن کو الہام سمجھنے لگی دنیا مرے فن کو

اعجاز بیانی صفتِ شیشہ گری ہے
آئینۂ الفاظ میں مضمون پری ہے

مضمونِ سخن نورِ ہدایت کا بیاں ہے ۱۲ اک جلوۂ حق طورِ عبارت سے عیاں ہے
توصیفِ محمدؐ جو مرے وردِ زباں ہے چھایا ہوا اعجاز بیانی کا سماں ہے
خیرہ نظرِ گنبدِ دوّار ہوئی ہے
مجلس کی فضا مطلعِ انوار ہوئی ہے

ہے نوکِ زباں تذکرۂ ذاتِ پیمبرؐ ۱۳ ممدوحِ خدا، ختمِ رسل، نور کا پیکر
آدم کا شرف، فخرِ بشر، ہادی و رہبر پیدا کیا خالق نے جنہیں طاہر و اطہر
ہے وحیِ خدا اصل میں گفتارِ رسالتؐ
اک بولتا قرآن ہیں سرکارِ رسالتؐ

قرآن ہے اک سلسلۂ نورِ ہدایت ۱۴ بندوں کے لئے خالق عادل کی عنایت
پوشیدہ ہیں الفاظ میں اسرارِ ولایت روشن ہے دلائل سے حقائق کی روایت
اک معجزۂ بانیٔ اسلام ہے قرآں
مومن کے لئے زیست کا پیغام ہے قرآں

قرآن ہے احکامِ الٰہی کا خزانہ ۱۵ قرآن ہے پیغامِ الٰہی کا خزانہ
قرآن ہے انعامِ الٰہی کا خزانہ قرآن ہے اکرامِ الٰہی کا خزانہ
قرآن سے وابستہ یہی نُورِ مُبیں ہیں
قرآن امانت ہے تو سرکار امیں ہیں

اخلاق وہ ، مخلوق کہے " خلق مجسم " ۱۶ اخلاص وہ ، تاریخ کہے " مصلحِ اعظم "
کردار وہ ، انسان کہے " عظمتِ آدم " گفتار وہ ، قرآن کہے آیت " محکم "
وہ صلح جو ظاہر میں رسالت کی " نہیں " تھی
شاہد ہے خدا اس کا وہی فتحِ مُبیں تھی

خود ذات الہیٰ جو ہوئی حافظ قرآن ۱۷ مخلوق مٹا دے اسے اس کا نہیں امکاں
ہے نُورِ مبیں اس کے مطالب کا نگہبان محفوظ ہوئی جس کے سبب دولت ایماں
آیت جو پڑھے سامنے منزل نظر آئے
اعمال میں تشریحِ مزمّل نظر آئے

ذاتِ شہِ کونین پہ دیں ہو گیا کامل ۱۸ اسلام کے دستور کے طے ہو گئی منزل
احکام الہیٰ پہ جو حضرت ہوئے عامل بندوں کو نمونہ ملا ، آساں ہوئی مشکل
جب پیش کیا سجدۂ معبود میں سر کو
معراج مصلے پہ ہوئی گھر میں بشر کو

کیا یہ نہیں انکارِ تقاضائے عدالت ۱۹ قرآن تو رہے اور نہ رہے اس کی بصیرت
شیطان تو گمراہ کرے تا بہ قیامت قائم نہ رہے حشر تلک نور ہدایت
پوشیدہ کبھی نیرِّ دیں ہو نہیں سکتا
قرآن سے جدا نُورِ مبین ہو نہیں سکتا

گو ختم ہوئی ذاتِ محمدؐ پہ رسالت ۲۰ باقی رہا عالم میں مگر کارِ ہدایت
تھی ذاتِ علیؑ بعدِ نبیؐ باعثِ رحمت سونپی جسے اللہ نے عالم کی امامت
ہاروں کی طرح آپ کو نسبت ہے نبیؐ سے
پوچھے کوئی قرآن تو پوچھے وہ علیؑ سے

احکام تھے سب آپ کے قرآں کے بموجب ۲۱ خطبات تھے اک قلزمِ معنی و مطالب
دامن میں گہر بھرتے تھے حضرت کے مخاطب خالی نہ گیا آ کے درِ فیض پہ حاجب
جو شخص بھی اس حلقۂ تدریس میں آیا
دوبارہ نہ پھر پنجۂ ابلیس میں آیا

کیا کوئی کرے مدحتِ ممدوحِ پیمبر ۲۲ ہے ناصرِ دیں، مہرِ جبیں، حیدر و صفدر
کعبے میں ملا اوج جسے دوش بنی پر سر جس نے کئے معرکۂ خندق و خیبر
شمشیرِ برہنہ سرِ میداں نظر آئے
منبر پہ علیؑ بولتا قرآں نظر آئے

مولا کی مخالف رہی گو گردشِ ایام ۲۳ تھی پیشِ نظر حق کی حفاظت سحر و شام
محفوظ زمانے میں رہی عظمتِ اسلام سمجھاتے تھے ہر ایک کو اللہ کا پیغام
صفّین کا میدان ہو یا جنگِ جمل ہو
مولا کا یہ مقصد تھا کہ قرآں پہ عمل ہو

دنیا میں رہی آلِ علیؑ محسن اسلام ۲۴ سینے سے لگاتے ہوئے اسلام کا پیغام
ہو معرکہ کرب و بلا یا سفر شام حق بڑھ کے رہا قوتِ باطل ہوئی ناکام

روشن ہے جہاں آج بھی پیغام نبیؐ سے
حق آج بھی روشن ہے حسینؑ ابن علیؑ سے

ہے نامِ حسینؑ ابن علیؑ آج بھی روشن ۲۵ جس نام سے تھراتے ہیں اسلام کے دشمن
حق تھامے ہوئے آج بھی ہے شاہ کا دامن تابندہ و پائندہ ہے اسلام کا گلشن

ہر ذرّہ یہ دیتا ہے صدا کرب و بلا کا
تازہ ہے لہو آج بھی شاہِ شہدا کا

جسدم کہ بدلنے لگیں اسلام کی اقدار ۲۶ ہر سمت سے باطل نے جو کی دین پہ یلغار
اور حق کے پرستاروں کو جینا ہوا دشوار اس وقت حفاظت کو اُٹھے سیدِ ابرار

دشمن کی کڑی ضرب تھی پیغامِ نبیؐ پر
عالم کی نگاہیں تھیں حسینؑ ابن علیؑ پر

تھا حق کا محافظ پسرِ حیدرِ کرّار ۲۷ اک کوہِ گراں قلعۂ دیں آہنی دیوار
قرآں کا امیں نورِ مبیں مطلعِ انوار ایماں کا ستوں ، لشکر اسلام کا سردار

نانا کی طرح فیصلۂ شاہ اُمم تھا
منزل کی طرف ترکِ وطن پہلا قدم تھا

ہر سمت تھی چھائی ہوئی باطل کی سیاست ۲۸ بے دینوں کے ہاتھوں میں تھا آئینِ شریعت
یوں مسخ ہوا جاتا تھا پیغامِ نبوّت اس وقت تھی اسلام کو حضرت کی ضرورت

سامانِ سفر شاہِ زمن باندھ کے نکلے
مرنے کے لئے سر سے کفن باندھ کے نکلے

تاریخ کے اوراق سے ظاہر ہے حقیقت ۲۹ اس بات سے آگاہ تھے سب طالبِ بیعت
شبیرؑ کے ہاتھوں میں تھی اسلام کی عظمت ورنہ کہاں اک فرد کہاں ساری حکومت

ہر ایک قدم تھا روشِ عام سے افضل
شبیرؑ تھے کل عالمِ اسلام سے افضل

اک لشکرِ حق ساتھ ہوا شاہ ہدیٰ کے ۳۰ سائے میں حق آگاہ بڑھے آلِ عبا کے
ہر سمت سے گو تیر چلے جور و جفا کے لیکن نہ ہوئے حوصلے کم اہلِ ولا کے

رخشندہ تھی چہروں پہ ضیاء عزم و یقیں کی
تھی خاک کے ذرّوں میں جھلک نورِ مُبیں کی

اس فوج میں کیا کیا مہ واختر نظر آئے ۳۱ قاسمؑ نظر آئے علیؑ اکبر نظر آئے
بپھرے ہوئے عباسِؑ دلاور نظر آئے اصغر بھی جوانوں کے برابر نظر آئے

اک قافلۂ اہلِ یقین ساتھ چلا تھا
جو فرد تھا اخلاص کے سانچے میں ڈھلا تھا

کام آگئے عاشور کو جب حق کے طلبگار ۳۲ باقی نہ رہا کوئی بھی یاور نہ مددگار
قربان ہوئے اکبرؑ و عباسِ علمدار میداں میں اکیلے تھے فقط سیّدِ ابرار
تھے درپئے آزاد لعیں سبطِ نبیؐ کے
پیاسے تھے عدو خونِ حسینؑ ابنِ علیؑ کے

افواجِ مخالف سے مخاطب ہوئے سرور ۳۳ فرمایا کہ اے فوجِ لعین وائے ہو تم پر
تاراج کیا تم نے گلستانِ پیمبرؐ مقتل میں تہِ تیغ ہوئے قاسمؑ و اکبرؑ
اولادِ پیمبرؐ کو مٹانا نہیں اچھا
کعبہ کے چراغوں کو بجھانا نہیں اچھا

میں وارثِ آئینِ شرافت ہوں جہاں میں ۳۴ میں شارحِ احکامِ نبوّت ہوں جہاں میں
میں مرکزِ اقلیمِ ولایت ہوں جہاں میں میں منبعِ انوارِ ہدایت ہوں جہاں میں
گل شمعِ امامت نہ کرو جور ستم سے
قائم ہے زمانے میں اُجالا میرے دم سے

میں ہوں پسرِ شاہِ عرب ہاشمِ دیندار ۳۵ میں ہوں پسرِ ختمِ رسلؐ احمدِ مختار
میں ہوں پسرِ شیرِ خدا ، حیدرِ کرّار میں ہوں پسرِ بنتِ نبیؐ طاہر و اطہار
میں حجّتِ حق ، وارثِ پیغامِ نبیؐ ہوں
بھائی ہے حسنؑ میرا حسینؑ ابنِ علیؑ ہوں

ہے آلِ محمدؐ کی ولا اَجرِ رسالت ۳۶ مومن کے لیئے فرض ہے مولا کی مؤدت
واجب ہوا ، اُمت پہ جو اقرارِ امامت کام آئے گا یہ حُسنِ عمل روزِ قیامت
تم نے نہ کیا خوف مگر حشر کے دن کا
وہ آلِ محمدؐ تھے گلا کاٹا ہے جن کا

جاری تھی ابھی رن میں شہنشاہ کی تقریر ۳۷ ناگاہ اُٹھا خیمے سے اک نالۂ دلگیر
مقتل سے گئے خیمۂ اطہار میں شبیرؑ دیکھا تو ملا خاک پہ بے ہوش سا بے شیر
تصویر بنی بانوئے ناشاد کھڑی تھی
آنکھوں سے رواں بی بی کے اشکوں کی لڑی تھی

زینب نے کہا شاہ سے اے ماں کی نشانی ۳۸ آ جائے ابھی ہوش میں مل جائے جو پانی
کہنے لگا یہ سن کے یداللہ کا جانی ہو سکتا ہے کچھ رحم کریں ظلم کے بانی
پانی اسے دے دے کوئی مظلوم سمجھ کر
پیاس اس کی بجھا دے کوئی معصوم سمجھ کر

سونپا شہ والا کو جو بانو نے پسر کو ۳۹ خورشید نے دامن میں لیا روحِ سحر کو
ماں دیر تلک تکتی رہی لختِ جگر کو مقتل کو چلا باپ لئے نورِ نظر کو
معصوم کو سینے سے لگائے ہوئے آئے
قرآن کے پارے کو اٹھائے آئے

پھر لشکرِ اعدا سے مخاطب ہوئے سرور ۴۰ گزرے ہیں کئی روز کہ بے شیر ہے اصغر
گرمی کی وہ شدّت ہے کہ ہے جان لبوں پر پانی اسے مل جائے تو ہو جائے یہ جانبر
انصاف سے بتلاؤ جو بچّے کی خطا ہے
پانی جو کیا بند تو کیا اس نے کیا ہے

سن کر یہ سخن فوج پہ سناٹا سا چھایا ۴۱ جو صاحبِ اولاد تھے دل اُن کا بھر آیا
شہ نے رخِ معصوم سے دامن کو جو اٹھایا اک چاند سا مکھڑا سرِ میدان نظر آیا
شرمندہ مظالم پہ جو ہونے لگے دشمن
میدان میں منہ پھیر کے رونے لگے دشمن

معصوم تھا نورِ نگہِ بانوئے دلگیر ۴۲ ہونٹوں پہ زباں اپنی پھرانے لگے بے شیر
ناگاہ فضا میں بنِ کاہل کا چلا تیر ہاتھوں پہ تڑپنے لگا لختِ دلِ شبیرؑ
ہر ظلم کی حد توڑ دی ظالم کے ستم نے
اس پر بھی بڑا صبر کیا شاہِ اُممؑ نے

بے جاں جو ہوا گود میں آغوش کا پالا ۴۳ کہتے ہیں کہ ہونے لگا عالم تہہ و بالا
ہوتا نہیں اندازۂ صبرِ شہِ والا کس طرح سے شبیرؑ نے وہ تیر نکالا
آئی نہ قیامت تو یہ حضرت کا کرم تھا
اصغر کا لہو ناقۂ صالح سے نہ کم تھا

چلّو میں تھا شبّیرؑ کے خونِ علیؑ اصغر ۴۴ دلدوز سماں ایسا تھا روتے تھے ستمگر
خاموش تھا لیکن پسرِ حیدرِ صفدر اک حرف بھی آیا نہ شکایت کا زباں پر
گرنے نہ دیا قطرۂ خون شہ نے زمین پر
اصغر کا لہو مل لیا حضرت نے جبیں پر

عالم میں تذبذب کے تھے اسدم شہِ ابرار ۴۵ آثار تردّد کے تھے چہرے سے نمودار
لے جائیں کہاں لاشِ پسر تھا بڑا دشوار آگے بڑھے، پیچھے ہٹے، سرکار کئی بار
تھا وقت بڑا سخت، جگر بندِ نبیؐ پر
دشمن بھی لگے رونے حسینؑ ابن علیؑ پر

تلوار سے پھر آپ نے اک قبر بنائی ۴۶ لاش اصغرِ معصوم کی مٹی میں چھپائی
چہرے پہ ملے خون اُٹھا حق کا فدائی کچھ دیر نہ شبّیرؑ کو دنیا نظر آئی
پیشانیٔ اقدس پہ بڑے زخم پڑے تھے
مولا مرے سورج کے اندھیرے میں کھڑے تھے

پہونچے درِ خیمہ پہ جو میدان سے شبّیرؑ ۴۷ کچھ دیر نہ پہچان سکی بھائی کو ہمشیر
منہ بھائی کا دیکھا تو کلیجے پہ لگا تیر تھا سرخ لہو، غازۂ روئے شہِ دلگیر
اس یاس سے کچھ دیکھا شہنشاہِ زمن کو
لپٹا لیا بھائی نے کلیجے سے بہن کو

کچھ دیر تلک روتے رہے سیّدِ ابرار ۴۸ اسدرجہ بہے اشک کہ تر ہو گئے رخسار
پھر بولے کہ بیٹھی ہیں کہاں بانوئے ناچار زینبؑ نے کہا غش اُنہیں آئے ہیں کئی بار
اصغر کے بچھڑنے کا قلق ان کا بڑا ہے
شہزادی پہ اک کوہِ الم ٹوٹ پڑا ہے

یہ سن کے گئے شاہ سوئے بانوئے ناشاد ۴۹ دیکھا کہ ہیں خاموش نہ رونا ہے نہ فریاد
دشوار ہے ماں کیلئے صبرِ غمِ اولاد کہنے لگے بانوؑ سے بڑی سخت ہے اُفتاد
معلوم ہے بے حال ہو تم شدّت غم سے
پر کیا کریں مجبور تھے ہم تیرِ ستم سے

سرور کے سخن سن کے یہ بولی وہ دل افگار ۵۰ شرمندہ نہ فرمائیں مجھے سیّدِ ابرار
ہیں آپ تو مولا پسرِ حیدرِ کرّار اصغر سے پسر آپ پہ قربان ہوں سو بار
کیا دخل کسی شخص کو مالک کی رضا میں
ھدیہ مرا مقبول ہوا ، راہِ خدا میں

پوچھا مگر اتنا کہ کہاں لختِ جگر ہے ۵۱ آنکھوں میں اندھیرا ہے کہاں نورِ نظر ہے
آغوش تو خالی ہے کہاں میرا پسر ہے بتلایئے مولا ، مرا معصوم کدھر ہے
اک بار تو میں دیکھ لوں نازوں کے پلے کو
قربان گئی چوم لوں اصغر کے گلے کو

سن کر یہ سخن کانپ گئے حضرتِ شبیرؑ ۵۲ فرمایا کہ کیا تم سے کہیں بانوئے دلگیر
ہم لا نہ سکے خیمے تلک لاشۂ بے شیر مٹی میں چھپا آئے ہیں وہ چاند سی تصویر
خونِ علیؑ اصغر کے نشاں لائے ہیں رن سے
پرسا تمہیں دینے کے لئے آئے ہیں رن سے

خاموش ہوئیں بانوئے دلگیر یہ سن کر ۵۳ تھا دل پہ مگر شاق جو داغِ علیؑ اصغر
سنبھلا نہ گیا بیٹھ گئیں فرشِ زمیں پر روتے ہوئے مقتل کو سدھارے شہِ انور
مصروف ہوئے شاہِ اُمم نصرتِ دیں میں
پھر گھر گیا احمدؐ کا پسر فوج لعیں میں

اے طبعِ رسا تھم کہ نہیں طاقتِ گفتار ۵۴ مجلس میں ہوئے جاتے ہیں بے حال عزادار
آغاؔ بہ طفیلِ پسرِ حیدرِ کرار دامن میں ترے آئے ہیں کیا کیا دُرِ شہوار
کیا مرثیہ گوئی کی تری دھوم مچی ہے
شہرت کا سبب ذکرِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے

مرثیہ نمبر ۹

عالم کی ابتری پہ قلم اشکبار ہے

عالم کی ابتری پہ قلم اشکبار ہے ۱ آیئنہ خیال پہ گرد و غبار ہے
خونِ شفق سے حُسنِ سحر داغدار ہے لاشے تڑپ رہے ہیں فضا سو گوار ہے
امن و اماں کے نام پہ جاری فساد ہے
خنجر بکف جہان میں ابنِ زیاد ہے

آفاق میں فساد کی پھیلی ہے تیرگی ۲ انساں کو ڈس رہی ہے تمنائے برتری
بغض و حسد کی آگ ہے ہر سو لگی ہوئی اپنی لگائی آگ میں جلتا ہے آدمی
صیدِ ہوس فریفتہ تاج و تخت ہے
انسان انا کی آگ میں نمرودِ وقت ہے

ایوانِ خسروی کا ہے دارالامان نام ۳ باندی بنی کھڑی ہے جہاں عظمتِ عوام
جمہوریت کے نام پہ ہے آمری نظام انسان کیا ہے وارثِ قابیلِ بے لگام
بغض و حسد میں سارے زمانے کو وار دے
سینے میں اپنے بھائی کے خنجر اُتار دے

ہر بوالہوس کا اوجِ فضا پر محل ہے آج ۴ دولت کا پھیر فتنۂ اہلِ دول ہے آج
انسان کا مزاج تضادِ عمل ہے آج جھوٹا وقار باعثِ جنگ و جدل ہے آج

رہتا نہیں ہے اپنے وسائل میں آدمی
اُلجھا ہوا ہے کتنے مسائل میں آدمی

ہر سو انانیت کا ہے پرچم گڑا ہوا ۵ دیکھو جسے وہ ضد پہ ہے اپنی اَڑا ہوا
انسان ہے یا کہ رہزنِ ایماں کھڑا ہوا گردن میں طوقِ زر کا ہے پھندا پڑا ہوا

مردہ ضمیر فتنہ گری پر نہال ہے
رزقِ حرام اس کی فقہ میں حلال ہے

تحصیلِ زر کے واسطے پھرتا ہے بے قرار ۶ قارونِ وقت بن کے ہوا ہے زمین کا بار
انسان کی قبائے شرافت ہے تار تار پاگل بنائے ہے ہوسِ تاجِ اقتدار

جو کچھ ملے وہ دوڑ کے جھولی میں ڈال لے
انسان کا بس چلے تو خدائی سنبھال لے

وجہِ فسادِ دہر ہے انسان کی خودسری ۷ ہے محملِ خیال میں لیلائے رہبری
شمرِ لعین کے سر پہ ہے تاجِ سکندری مارے ہوئے ہے لذّتِ صہبائے سروری

پیراہنِ حیات ہے غم سے گلا ہوا !!
ایوانِ زندگی ہے حسد سے جلا ہوا

ہے اسلحے کی دوڑ زمانے میں چار سو ۸ آفاق پر ہے سب کو تسلّط کی آرزو
پھرتے ہیں شہرِ زیست میں قزاق کُو بہ کُو عنقا ہر اک چیز ہے ارزاں فقط لہو

تقسیم جام کرتے ہیں بغض و عناد کے
ہر گلستاں میں بوتے ہیں کانٹے فساد کے

پیشِ نظر نہیں ہے جو انجامِ زندگی ۹ اک پیکرِ فساد ہے دنیا میں آدمی
ٹھکرا رہا ہے نعمتِ ایمان و آگہی قلب و نظر پہ مہر ہے گویا لگی ہوئی

دیوانہ ہو رہا ہے جو یہ رنگ و صوت کا
کمبخت کو خیال نہیں اپنی موت کا

واقف ہے کون موت سے آئے گی کس جگہ؟ ۱۰ آکر چراغِ زیست بجھائے گی کس جگہ؟
نقشِ حیات آ کے مٹائے گی کس جگہ؟ پیغام واپسی کا سنائے گی کس جگہ؟

گُل ہو گا زندگی کا کنول کس مقام پر
مارے گا آ کے پیکِ اجل کس مقام پر

لیتی ہے جب گرفت میں انسان کو اجل ۱۱ انسان کے ڈھیلے پڑتے ہیں زعمِ انا کے بل
گویائی سلب ہوتی ہے اور ہاتھ پاؤں شل ہوتے ہیں خاک پل میں تمناؤں کے محل

مرتے ہوئے کو دھیان کہاں تاج و تخت کا
اک دم سے دم نکلتا ہے فرعونِ وقت کا

بے بس ہیں اس کے سامنے دنیا کے پہلواں ۱۲ رستم سا فیل تن بھی ہے اک مورِ ناتواں
زور آوری سے اس کی لرزتا ہے اک جہاں ہیں اس کی زد میں سارے زمانے کے کارواں

کوئی نہیں جو دستِ اجل سے نکل سکے
انسان کی کیا مجال جو کروٹ بدل سکے

بچوں کو چھین لیتی ہے ماؤں کے گود سے ۱۳ اس کے لئے فضول ہیں نالے یتیم کے
ماتم کدہ ہیں اسکے سبب گھر بھرے پرے پیغامِ تیرگی ہے سہاگن کے واسطے

خورد و کلاں ہیں خوف زدہ اس کے نام سے
ہے تلخ زندگی کا مزہ اس کا نام سے

بھٹی میں جسم جل گیا ظالم یزید کا ۱۴ نمرود کی خدائی کا تختہ اُلٹ دیا
شدّاد کو بہشت میں جانا نہ مل سکا فرعونِ مصر نیل کی موجوں میں کھو گیا

جو کچھ مُغالطہ تھا اُسے دور کر دیا
انسان جس کو موت نے مجبور کر دیا

کس درجہ ہولناک تصوّر ہے موت کا ۱۵ پایا ہر ایک فرد کو اس سے گریز پا
جی چاہتا ہے اس کا نہ ہر گز ہو سامنا لیکن مفر نہ اس سے کسی کو کبھی نہ ملا

جبڑوں میں جابروں کو دبایا ہے موت نے
دنیا میں خود سروں کو مٹا ہے موت نے

لیکن ہوئے ہیں ایسے بھی مردانِ حق نگاہ ۱۶ مانگی ہے جن سے خود ملک الموت نے پناہ
جن کی شہادتوں پہ ہے اللہ خود گواہ جن کا لہو ہے باعثِ حسنِ چراغِ راہ
جو زندگی کا جادہ سمجھتے تھے موت کو
شیریں شہد سے زیادہ سمجھتے موت کو

تھے لشکرِ حسینؑ میں ایسے ہی باصفا ۱۷ جو جانتے تھے حق پہ شہادت کا مرتبہ
مینارہ نور کا ہیں شہیدِ رہِ خدا ہر فرد ان کا زندۂ جاوید ہو گیا
قرآن ہے گواہ وہ کون مکاں میں ہیں
مُردہ نہ کہنا ان کو وہ زندہ جہاں میں ہیں

اس لشکرِ حسینؑ کی ملتی نہیں مثال ۱۸ ہر فرد، فرد تھا وہ مُسن ہو کہ خورد سال
اصغرؑ سا پھول ہو کہ ہو اکبرؑ سا نونہال عباسؑ ہوں کہ عونؑ و محمدؑ سے خوشخصال
قاسمؑ نے اپنے ماتھے پہ سہرا سجا لیا
آئی جو موت بڑھ کے گلے سے لگا لیا

مجلس میں ذکرِ قاسمؑ گل پیرہن ہوا ۱۹ نوشاہِ فکر حُسنِ عروسِ سخن ہوا
جوشِ ولا بڑھا تو چمن نغمہ زن ہوا عنواں بیاں کا جانِ امامِ حسنؑ ہوا
تیرہ برس کا سن ہے محمدؐ کی آل ہے
چہرے کا نور کہتا ہے بدرِ کمال ہے

زلفیں ہیں یا کہ سایۂ شمشیرِ حیدری ۲۰ مثلِ گلِ شگفتہ ہیں رُخسارِ نقری
آنکھیں ہیں یا کہ نور کی کلیاں کھلی ہوئی صبحِ یقین ہے چہرۂ اقدس کی تازگی
باغِ حسنؑ کے حُسن کا آئینہ دار ہے
سر سے قدم تلک یہ سراپا بہار ہے

حسنِ بہار صبحِ ازل پیکرِ جمال ۲۱ قدسی صفات گلشنِ زہراؑ کا نونہال
وجہِ نشاطِ روح ، گلِ طائرِ خیال انمول موتیوں میں ہے مولا حسنؑ کا لال
چہرے پہ بانکپن سے غضب کا نکھار ہے
صدقے عروسِ مرگ ہو وہ گلعذار ہے

صورت میں مثلِ شافعِ محشر حسنؑ کا لال ۲۲ قوّت میں مثلِ فاتحِ خیبر حسنؑ کا لال
سیرت میں مثلِ حضرتِ شبرؑ حسنؑ کا لال مثلِ حسینؑ صبر کا پیکر ، حسنؑ کا لال
بے خوف ہے ، جری ہے تحمّل مزاج ہے
اوصافِ زندگی کا حسیں امتزاج ہے

لختِ دلِ نبیؐ ہے امامِ حسنؑ کا لال ۲۳ سروِ روانِ ہے باغِ محمد کا نونہال
ذکرِ جمیل اس کا ہے تقریر پر جمال دامن کو جس کے چھو نہ سکے رفعتِ خیال
کردار سے عیاں نبیؐ ہاشم کی شان ہے
میدان کربلا میں حسنؑ کا نشان ہے

آیا ہے رزمگاہ میں شبرؑ کا لاڈلا ۲۴ دل میں ہے جوشِ نصرتِ سلطانِ کربلا
ماتھے پہ ہے یقین کا سہرا سجا ہوا ہے منتظر وغا کا اور حکمِ امام کا

دولہا بنا ہے دین کی عظمت کے واسطے

بے چین ہے عروسِ شہادت کے واسطے

دن ڈھل گیا مگر نہ ملا دل کا مدّعا ۲۵ اذنِ وغا نہ قاسمؑ ذیشان کو ملا
پیشِ امام آپ گئے رن میں بارہا !! لیکن نہ مل سکی انہیں میدان کی رضا

کیا جانے کیا خیال تھا شاہِ انام کو

مانع تھا کوئی امر جنابِ امام کو

مایوس ہو کے خیمے میں آیا وہ مہ لقا ۲۶ گوشے میں سر جھکا کے یہ کرنے لگا دعا
ربِ عُلا مجھے بھی یہ توفیق ہو عطا ہو جاؤں میں نثارِ شہنشاہِ کربلا

قربان ہوں نصیب حیات دوام ہو

مقتل میں سر کٹاؤں شہیدوں میں نام ہو

ناگاہ اُمِ فروہ کی اس پر پڑی نظر ۲۷ پاس آئی شاہزادے کے وہ سوختہ جگر
دیکھا تو غم زدہ اسے پایا بہ چشمِ تر کہنے لگیں کہ کیا ہوا اے میرے سیم بر

کیا بات ہو گئی ہے میرے دل کے چین کو

کیوں رَن میں چھوڑ آئے اکیلا حسینؑ کو

مجھ کو یقین تھا کہ نہ آؤ گے جیتے جی ۲۸ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی اسبات کو کبھی

مرنے سے عار ہے تمھیں پیاری ہے زندگی الفت نہیں ہے کیا تمھیں زہراؑ کے لال کی

میں بیبیوں میں جانے کے قابل نہیں رہی

زینبؑ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی

تم نے نہ کچھ خیال کیا اپنی بات کا ۲۹ ماں کی مصیبتوں کا دیا تم نے یہ صلا

وعدہ کیا تھا نصرتِ حق کا وہ کیا ہوا میرا وقار خاک میں تم نے ملا دیا

مرنے سے اپنی جان بچائے حسنؑ کا لال

اس طرح رزمگاہ سے آئے حسنؑ کا لال

قاسم نے جبکہ ماں کے سُنے اس طرح سخن ۳۰ دل پر لگی وہ چوٹ کہ تھرا گیا بدن

بولا یہ ہاتھ جوڑ کے لختِ دلِ حسنؑ میں ہوں ہزار بار نثارِ شہِ زمن

زندہ ہوں اب تلک تو میری یہ خطا نہیں

اذنِ وغا امام سے مجھ کو ملا نہیں

یہ بات سُن کے مادرِ قاسم ہوئیں نڈھال ۳۱ ڈوبا جو دل تو خاک پہ بیٹھی وہ خستہ حال

پیشِ نظر تھا اذنِ وغا کا فقط خیال حکمِ حسنؑ کا آ گیا اکبارگی خیال

چہرہ خوشی سے بی بی کا پُر نور ہو گیا

آیا تھا وہ خیال کہ غم دور ہو گیا

خوش ہو کے اُمِّ فروہ نے قاسمؑ سے یہ کہا ۳۲ بیٹا تمہارے بازو پہ تعویذ ہے بندھا
اس میں ہے اک نوشتۂ آقائے مجتبیٰ مشکل کے وقت دیکھنا حکمِ امام تھا

دیکھا تو خط لکھا تھا شہ مشرقین کو
بیٹے کے حق میں کی تھی وصیت حسینؑ کو

پڑھ کر یہ خط امام کا دونوں ہوئے نہال ۳۳ گل کی طرح سے کھل اُٹھا مولا حسنؑ کا لال
آنکھوں کا نور آ گیا چہرہ ہوا بحال پایا درِ مراد بڑھا اور بھی جمال

مرنے کا راہِ حق میں جو امکاں ہو گیا
تعویذ ان کی زیست کا ساماں ہو گیا

ماں نے دیا یہ حکم کہ مولا کے پاس جاؤ ۳۴ تحریر انکے بھائی کی جا کر انہیں دکھاؤ
نصرت میں شاہِ والا کی مقتل میں سر کٹاؤ میری خوشی یہی ہے کہ اب خون میں نہاؤ

کرتی ہوں میں دعا تمہیں اذنِ وغا ملے
حق پر شہید ہو تمہیں رَن کی رضا ملے

قاسم نے خط سنبھال کے مقتل کی راہ لی ۳۵ بڑھنے لگے امام کی جانب خوشی خوشی
تعویذ تھا کہ راہِ ہدایت کی روشنی پہونچے حضورِ شاہ تو تحریر پیش کی

رونے لگے یہ حالِ امامِ زمن ہوا
تعویذ کا نوشتہ حدیثِ حسنؑ ہوا

قاسمؑ سے بولے پھر یہ شہنشاہِ نیک خو ۳۶ اے میری جان اے بنی ہاشم کی آرزو
جاؤ سدھارو جانبِ مقتل بہے لہو پوری خدا نے کی ہے شہادت کی آبرو

حسرت سے کی نگاہ گلِ نو بہار پر
قاسمؑ کو جب سوار کیا راہوار پر

مقتل کی سمت قاسمِ گلگوں قبا بڑھے ۳۷ ایسا لگا جہاد کو مشکل کشا بڑھے
دل میں لیئے وہ جذبۂ شوقِ وغا بڑھے دولہا کی طرح سوئے عروسِ قضا بڑھے

تیور وہی تھے اور وہی آن بان تھی
حیدرؑ کا دبدبہ تھا ، محمدؐ کی شان تھی

پہونچے جو رزمگاہ میں قاسم پئے وغا ۳۸ پیکر بنے تھے آپ جلال و جمال کا
چہرے کا نور دیکھ کے حیراں تھے اشقیا میدانِ کربلا میں اُجالا سا ہو گیا

پیلا پڑا تھا رنگ ہر اک رُو سیاہ کا
ابتر ہوا تھا حال عدو کی سپاہ کا

پیاسے نے رن میں خون کے دریا بہا دیے ۳۹ ہنگامِ جنگ کُشتوں کے پُشتے لگا دیئے
شمشیرِ آبدار کے جوہر دکھا دیئے ہر سو چراغِ دولتِ باطل بجھا دیئے

نورِ نظر تھے ارزقِ شامی کے خاک پر
چاروں پسر تھے ارزقِ شامی کے خاک پر

بپھرا ہوا تھا شیر، پریشان تھے اہلِ شر ۴۰ ڈوبے ہوئے تھے بحرِ خجالت میں نامور
مغفر سمیت کٹ کے گرے خود سروں کے سر لاشہ پڑا تھا ارزقِ شامی کے خاک پر
مقتل میں شامیوں کے تھے لاشے پڑے ہوئے
جانیں بچائے دور تھے کوفی کھڑے ہوئے

تھرّا رہا تھا خوف سے ہر ایک کینہ جُو ۴۱ مٹّی میں مل چکی تھی جوانوں کی آبرو
بت بن کر رہ گئے تھے شجاعانِ تیز خُو ہر فرد کو تھی جان بچانے کی آرزو
مرتے ہوؤں نے لاشوں کے اندر پناہ لی
زندوں نے خوفِ مرگ سے جنگل کی راہ لی

قاسمؑ نے رزمگاہ کا نقشا بدل دیا ۴۲ دریا رواں تھے خون کے مقتل میں جا بجا
آگے بڑھا جو جنگ کو واپس نہ جا سکا مغرور کے قدم کٹے خود سر کا سر کٹا
پیدل تھے بدحواس کہ جائے مفر نہ تھی
رہوار کو سوار کی اپنے خبر نہ تھی

ناقابلِ بیان تھا شمرِ لعین کا حال ۴۳ کہتا تھا اپنی فوج سے جھنجھلا کے بدخصال
باقی رہا نہ جنگِ فرادہ کا اب سوال تیروں کو سر کریں قدر انداز بے مثال
یہ سنتے ہی فضا میں چلے تیر ہر طرف
قاسمؑ کو مارنے کو تھی تدبیر ہر طرف

تیروں نے شاہزادے کا چھلنی بدن کیا ۴۴ قاسمؑ سے راہوار پہ سنبھلا نہیں گیا
گھوڑے پہ ڈگمگانے لگا جانِ مجتبیٰؑ آواز دی حسینؑ کو اب آیئے چچا

یہ کہہ کے فرشِ خاک پہ جانِ حسنؑ گرا
تیورا کے راہوار سے وہ خستہ تن گرا

سُن کر یہ دوڑے شاہِ زمن سوئے قتل گاہ ۴۵ تھے ساتھ اُن کے اکبرؑ و عباسؑ عرش جاہ
دیکھا جو اُن کو بھاگ پڑی شمر کی سپاہ فوجوں کے ساتھ تھا پسرِ سعدِ رو سیاہ

بھگدڑ مچی وہ لاشہ قاسمؑ کچل گیا
انسانیت کا رن میں جنازہ نکل گیا

بکھرے ہوئے زمیں پہ تھے گل پیرہن کے پھول ۴۶ ہر سمت سرخ سرخ تھے لختِ حسنؑ کے پھول
رنگِ حنا میں لال تھے نازک بدن سے پھول مرجھا رہے تھے خاک پہ اس سیم تن کے پھول

مٹّی میں مل چکا تھا بدن گلعذار کا
خون بہہ رہا تھا، باغِ حسنؑ کی بہار کا

پہونچے قریب جبکہ شہنشاہِ کربلا ۴۷ دیکھا وہ لالہ زار کہ رُخ زرد ہو گیا
صدمہ ہوا کچھ ایسا بدن کانپنے لگا جلتی زمیں پہ بیٹھ گئے شاہِ دوسَرا

اُٹھ بیٹھے پھر تصوّرِ لختِ جگر لئے
وہ پھول چُن کے آپ نے دامن میں بھر لئے

روتے ہوئے وہاں سے چلے شاہِ کربلا ۴۸ سر کو جھکائے ساتھ تھے عباسؑ باوفا
فضہ نے آ کے حضرتِ زینبؑ کو دی صدا بی بی ! نہ جانے حضرتِ قاسمؑ کو کیا ہوا

ہے حال غیر ، باد شہِ مشرقین کا
پرخوں عبا ہے زرد ہے چہرہ حسینؑ کا

خیمے میں آئے جبکہ شہنشاہِ حق پناہ ۴۹ درد و الم سے مادرِ قاسمؑ پہ کی نگاہ
زینبؑ کو دیکھا اور بھری ایک سرد آہ فرش زمین پہ بیٹھ گئے شاہِ عرش جاہ

پھر راہِ حق کے تحفۂ مقبول رکھ دیئے
سیدانیوں کے سامنے وہ پھول رکھ دیئے

دیکھے جو پھول خیمے میں کہرام مچ گیا ۵۰ سیدانیوں میں شور تھا قاسمؑ کو کیا ہوا
وہ غم تھا ، اُمِّ افردہ کا آنسو نہیں تھا اُٹھے امام اور یہ کمر تھام کر کہا

قاسمؑ کے پاس فوجوں میں جلدی نہ جا سکے
شرمندہ ہیں کہ لاش سلامت نہ لا سکے

سن کر سخن امام کے بولی وہ خستہ حال ۵۱ لاؤں زباں پہ حرف کوئی میری کیا مجال
میری دعا قبول ہوئی شاہِ خوشخصال شکرِ خدا جہاد میں کام آیا میرا لال

یہ کہہ کے پھر تصوّرِ قاسمؑ میں کھو گئیں
شاید کہ ضبطِ گریہ سے بے ہوش ہو گئیں

حق کے صدا بہار ہیں گلگوں قبا کے پھول ۵۲ قاسمؑ کے پھول لختِ دلِ مجتبیٰ کے پھول

آنا اٹھاؤ پلکوں سے صبر و رضا کے پھول اہلِ عزا کو پیش کرو تم دعا کے پھول

مولا کی رہبری میں وہ راہِ عمل ملے

دنیا میں آبرو رہے عقبیٰ میں پھل ملے

○

جہادِ بادشہِ مشرقین آج بھی ہے

فلاحِ نوعِ بشر، فرضِ عین، آج بھی ہے

وقارِ حق کے لیے اور بقائے دیں کے لیے

جہاں میں سُرخیٔ، خونِ حسینؑ آج بھی ہے

○

آئینِ شرافت ہے، وفاداری ہے

ایمان ہے یہی اور یہی دینداری ہے

اے اہلِ خرد سطوتِ باطل کے خلاف

اک نعرۂ حق رسمِ عزا داری ہے

مرثیہ نمبر ۱۰

فرشِ عزا پہ مجمعِ اہلِ نظر ہے آج

فرشِ عزا پہ مجمعِ اہلِ نظر ہے آج ۱ پیشِ نگاہ کاوشِ نوعِ بشر ہے آج
عنواں سخن کا، کش مکشِ خیر وشر ہے آج زورِ دلیل باعثِ فتح و ظفر ہے آج
اقدارِ زندگی کا نگہبان ہے کہاں
جو نائبِ خدا تھا وہ انسان ہے کہاں

وہ منزلِ نجات کا رہبر کہاں ہے آج ۲ آیئنہ حیات کا جوہر کہاں ہے آج
اس ساری کائنات کا افسر کہاں ہے آج اللہ کی صفات کا مظہر کہاں ہے آج
دریائے زندگی کا شناور کہاں گیا
انسان! حُسنِ زیست کا پیکر کہاں گیا

ابلیس خندہ زن ہے کہ عالم ہوا تباہ! ۳ انسان اب کہاں رہا انساں کا خیر خواہ
خود اپنے شر میں جل چکی اس کی پناہ گاہ شدّاد ہے کوئی، کوئی نمرودِ رُو سیاہ
ہاتھوں میں خون، رُخ پہ سیاہی ملے ہوئے
انسان کے روپ میں ہیں درندے ڈھلے ہوئے

گلزارِ زندگی پہ مسلّط ہوئی خزاں ۴ عالم میں چلی رہی ہیں تذبذب کی آندھیاں
طوفانِ شر بپا ہے کڑکتی ہیں بجلیاں آتش فشاں پھٹتے ہیں تڑختا ہے آسماں
پگھلا رہے ہیں زیست کو لو کے بڑھے ہوئے
چاروں طرف ہیں، آگ کے طوفان چڑھے ہوئے

لُو چل رہی ہے صحنِ چمن میں فساد کی ۵ بھٹی سلگ رہی ہے، جہاں میں عناد کی
اُبھری ہے چار سمت فضا قومِ عاد کی انسان پیروی میں ہے ابنِ زیاد کی
محسن کشی پہ فخر جو دستور بن گیا
انسان کائنات کا ناسور بن گیا

دیکھو جدھر بھی شر کے شراروں کی آگ ہے ۶ ہر سمت اہرمن کے دُلاروں کی آگ ہے
صحنِ چمن میں خون کے دھاروں کی آگ ہے سر پر دھواں نہیں ہے بہاروں کی آگ ہے
جھلسا ہوا ہے رنگِ رخِ حُور زندگی
دوزخ سے کم نہیں شجرِ طورِ زندگی

ہے عقل گم کہ کیا ہوا قدسی صفات کو ۷ انسان کیسے بھول گیا حُسنِ ذات کو
کر بیٹھا غرق آپ وقارِ حیات کو منزل سے دور کھو چکا راہِ نجات کو
بے مقصدِ حیات سفر کر رہا ہے آج
جینے کی آرزو میں بشر مر رہا ہے آج

زندہ چتا میں جل گئی لیلیٰ زندگی ۸ حدت جو پائی گل گئی لیلیٰ زندگی
ماتھے پہ راکھ مل گئی لیلیٰ زندگی آتشکدے میں ڈھل گئی لیلیٰ زندگی

چھنی کلائیوں سے نشانی سہاگ کی
ٹھنڈی ہوئی ہیں چوڑیاں حدت میں آگ کی

باقی کہاں سے غازۂ رخسارِ زندگی ۹ ہے سرد سرد گرمئ بازارِ زندگی
اپنی جگہ سے ہل چکے آثارِ زندگی دم بھر میں بیٹھ جائے گی دیوارِ زندگی

جھوٹے وقار ، جھوٹی قیادت کی آگ میں
انسان جل رہا ہے سیاست کی آگ میں

پھیلا ہوا جہاں میں سیاست کا جال ہے ۱۰ پھندے پڑے ہیں ایسے نکلنا محال ہے
وہ تلخ زندگی ہے کہ جینا وبال ہے مکر و فریب باعثِ جنگ و جدال ہے

پتھر پڑے جو عقل پہ ، راہوں میں کھو گیا
انسان ، نسل و رنگ میں تقسیم ہو گیا

تفریقِ نسل و رنگ ہے اک فتنۂ حسیں ۱۱ اس فتنۂ حسیں کا ہے بانی عدوِ دیں
ابلیس یعنی دشمنِ حق ، مارِ آستیں !! بہکا رہا ہے ان کو جو بہکے ہوئے نہیں

جو معترض تھا ، حکمِ خدائے علیم پر
بیٹھا ہے تاک میں وہ رہِ مستقیم پر

مسدود رہگزار ہیں ، راہِ مفر نہیں ۱۲ نظروں کے سامنے کوئی اہلِ نظر نہیں
دکھلائے راہ کون ، کوئی راہبر نہیں منزل کی سمت کیا ہے کسی کو خبر نہیں

ابلیس دل پہ مہر لگاتا ہے رات دن
بغض و حسد کی آگ جلاتا ہے رات دن

کجلا رہا ہے نورِ سحر کو یہ آئے دن ۱۳ دُھند لا رہا ہے اہلِ نظر کو یہ آئے دن
کم کر رہا ہے دیں کے اثر کو یہ آئے دن بہکا رہا ہے نوعِ بشر کو یہ آئے دن

شر سے بچا نہ کوئی ، بجز مُخلصین کے
سینے سے جو لگائے ہیں ارکان دین کے

محفوظ اس کے شر سے فقط مخلصین ہیں ۱۴ اہلِ ولا ہیں ، پیرِ وِ دینِ مُبین ہیں
طاعت گزار و متقی و مومنین ہیں اقدارِ زندگی کے جہاں میں امین ہیں

جن کی نظر میں جلوۂ اُمّ الکتاب ہے
جن کے دلوں میں عشقِ رسالتماب ہے

عشقِ رسولؐ نوعِ بشر کا وقار ہے ۱۵ عشقِ رسولؐ قلب و نظر کی بہار ہے
عشقِ رسولؐ باعثِ صد افتخار ہے عشقِ رسولؐ دولتِ دیں کا حصار ہے

عشقِ رسولؐ غیب پہ ایمان کا نام ہے
عشقِ رسولؐ تاجِ بقائے دوام ہے

عشقِ رسولؐ حق کی لگن، حُسنِ کوہ طور ۱۶ عشقِ رسولؐ، جامِ ولا، دائمی سرور
عشقِ رسولؐ، صبحِ یقیں زندگی کا نور عشقِ رسولؐ، فکر کی ضو، عظمتِ شعور

ترویجِ دینِ حق ابوطالب کا کام ہے
عشقِ رسولؐ میں سرِ فہرست نام ہے

عشقِ رسولؐ دولتِ ایمان و آگہی ۱۷ عشقِ رسولؐ، راہِ ہدایت کی روشنی
عشقِ رسولؐ زُہد کی تقویٰ کی زندگی عشقِ رسولؐ بوذرؓ و سلمانِؓ فارسی

جذبِ دروں سے مظہرِ انوار بن گئے
نوعِ بشر کی فکر کا مینار بن گئے

عشقِ رسولِؐ پاک ہے پروانۂ نجات ۱۸ عشقِ رسولِؐ پاک ہے سرمایۂ حیات
عشقِ رسولؐ پاک ہے تنویرِ کائنات عشقِ رسولؐ پاک ہے حُسنِ صفات و ذات

مولائے کائنات ہوا، اور ولی ہوا
انسان اِن کے عشق میں مولا علیؑ ہوا

بعدِ رسولِؐ پاک ہے مولا علیؑ کا نام ۱۹ دستِ خدا، محافظِ حق اوّلِ امام
جس کی وِلا ہے، حکمِ رسولِؐ فلک مقام جس کے مُحب پہ آتشِ دوزخ ہوئی حرام

ایمانِ کل ہے، نقطۂ اصل اصول ہے
عیدِ مباہلہ میں جو نفسِ رسولؐ ہے

ہاں جانشینِ احمدؐ مختار ہیں علیؑ ۲۰ مشکل کشا ہیں حق کے مددگار ہیں علیؑ
خیبر شکن ہیں ، حیدرِ کرار ہیں علیؑ سیسہ پلائی دین کی دیوار ہیں علیؑ

اسمِ خدا ہے اصل میں حق کے ولی کا نام
نعرہ لگے علیؑ کا جو آئے علیؑ کا نام

مولائیوں کا حرفِ ندا ہے علیؑ علیؑ ۲۱ اہلِ ولا کے لب پہ دعا ہے علیؑ علیؑ
مومن کا ورد صبح و مسا ہے علیؑ علیؑ خیبر میں مصطفیؐ کی صدا ہے علیؑ علیؑ

پیروں کے پیر ، شیرِ خدا ، یا علیؑ مدد
مشکل پڑی تو سب نے کہا یا علیؑ مدد

منبر کی شان ، رفعتِ مجلس علیؑ کا نام ۲۲ حُسنِ کلام عظمتِ مجلس علیؑ کا نام
نطقِ بلیغ شوکتِ مجلس علیؑ کا نام قولِ رسولؐ زینتِ مجلس علیؑ کا نام

شرحِ فروغِ دین ہے ، اصلِ اُصول ہے
مولا کا ذکر ، ذکرِ خدا اور رسولؐ ہے

مولا علیؑ ، رفیقِ رسالت ، ابو تراب ۲۳ مولا علیؑ مدینۂ علمِ نبی کے باب
مولا علیؑ خلیفۂ برحق ، فلک رکاب مولا علیؑ حیات میں ہر جگہ کامیاب

وارث ہیں جانشینِ رسالت مآب ہیں
ہر نقطۂ نظر سے علیؑ کامیاب ہیں

حق کے فدائیوں کے نگہبان ہیں علیؑ ۲۴ اہلِ ولا کی زیست کا سامان ہیں علیؑ
اسلام کی کتاب کا عنوان ہیں علیؑ نورِ مُبیں ہیں بولتا قرآن ہیں علیؑ
مصداقِ ہل اتیٰ ہیں امامِ مُبیں ہیں آپ
بعد رسولؐ دین ہدیٰ کے امیں ہیں آپ

سردار ہیں بہشت کے مولا علیؑ کے لال ۲۵ " اپنا انا " کی شرح ، محمد کے نونہال
دیں کا وقار سلسلۂ خیر کا کمال عالم میں جن کے نقشِ قدم ، نقشِ لازوال
صلحِ حسنؑ ہے امن کا پیغام آج تک
باقی ہے جس سے عظمتِ اسلام آج تک

صلحِ حسنؑ ، نوشتۂ حق ، اُسوۂ رسولؐ ۲۶ صلحِ حُدیبیہ کی طرح قابلِ قبول
پنہاں تھا جس میں مرضئ اللہ کا اصول بے کُشت و خوں کے جس سے بچے دین کے اصول
انکا یہ فعل ناسخِ جہل و فساد تھا
لیکن حسینؑ کے لئے لازم جہاد تھا

جس وقت دینِ پاک پہ آنے لگا زوال ۲۷ اقدار زندگی ہوئیں عالم میں پائمال
اسلام کے وقار کا ہونے لگا سوال کام آیا ایسے وقت میں مشکل کُشا کا لال
پیمانہ انتہا پہ تھا جابر کے جبر کا
لیکن پتہ نہ چل سکا صابر کے صبر کا

پیشِ نظر تھا دینِ محمدؐ کا جو وقار ۲۸ نکلا وطن سے دولتِ ایمان کا تاجدار
تھے ہم رکاب، اکبرؑ و عباسِؑ نامدار اور ساتھ ساتھ تھے ابو طالب کے گلعذار
لشکر تھا حق پرستوں کا ہاتھوں میں ہاتھ تھے
مسلم بنِ عقیل بھی مولا کے ساتھ تھے

باطل شکن امیر ہیں مسلم بنِ عقیل ۲۹ جرأت میں بے نظیر ہیں مسلم بن عقیلؑ
فاتح ہیں قلعہ گیر ہیں مسلم بنِ عقیلؑ شبیرؑ کے سفیر ہیں مسلم بنِ عقیلؑ
پیغام یہ حسینؑ کی جانب سے لائے ہیں
ترویجِ حق کے واسطے کوفے میں آئے ہیں

سر پر ہے تاجِ احمدِ مختار کا وقار ۳۰ ماتھے پہ حُسنِ عظمتِ انساں کا ہے نکھار
نظروں میں ہیچ انکے ہے دنیا کا اقتدار ایمان و اتقا میں ہیں یکتائے روزگار
کیا منزلت ہے مسلمِ عالی مقام کی
حصّے میں ان کے آئی نیابت امام کی

چہرے سے ہیں عیاں بنی ہاشم کی جھلکیاں ۳۱ بازو سے زورِ جعفرِ طیّار ہے عیاں
سینے میں ہے ولائے شہنشاہِ دو جہاں حمزہؑ کی طرح ہیں قد و قامت کے آسماں
پاؤں سے اپنے یہ سرِ باطل کو توڑ دیں
چاہیں تو بہتے وقت کے دھارے کو موڑ دیں

رفتار وہ کہ جس پہ متانت کو ناز ہے ۳۲ گفتار وہ کہ جس پہ صداقت کو ناز ہے
افکار وہ کہ جس پہ ذہانت کو ناز ہے کردار وہ کہ جس پہ شرافت کو ناز ہے
ہمسر نہیں کوئی ابوطالب کے لال کا
آئینہ ہیں جناب جلال و جمال کا

لکھا جو اہلِ کوفہ نے بیعت کے واسطے ۳۳ لاکھوں دیے تھے جس میں رسالت کے واسطے
حضرت سے ملتجی تھے امامت کے واسطے مسلم کو بھیجا ان کی ہدایت کے واسطے
شبیر جانتے تھے حقیقت پیام کی
بھیجا جو ان کو شاہ نے حجت تمام کی

آیا دیارِ کوفہ میں جب نائب امام ۳۴ تھا مفسدوں کے ہاتھ میں اسلام کا پیام
ہر سمت ابتری تھی، پریشان تھے خاص و عام بس تھا برائے نام حکومت کا انتظام
جاں کا نہ آبرو کا کسی کو خیال تھا
بازارِ موت گرم تھا جینا وبال تھا

بے چین تھے جو لوگ ہدایت کے واسطے ۳۵ مسلم کے پاس آئے وہ بیعت کے واسطے
کوشاں تھے جو عنانِ حکومت کے واسطے وہ لوگ آئے اپنی ضرورت کے واسطے
مسلم بنِ عقیل کے غم خوار بن گئے
دیکھی جو مصلحت تو طرفدار بن گئے

بھیجا اُدھر یزید نے ابنِ زیاد کو ۳۶ ظالم کو، فتنہ گر کو، شقی کو، فساد کو
سفاک کو، شریر کو، وجہِ عناد کو بدخو کو، بد سرشت کو، اور بدنہاد کو

غیظ و غضب سے جس نے بھرے گھر جلا دیئے
کوفے میں جس نے خون کے دریا بہا دیئے

کوفہ لرز اُٹھا وہ قیامت ہوئی بپا ۳۷ اہلِ ولا پہ تنگ تھا عرصہ حیات کا
گھر لوٹتے تھے آگ لگاتے تھے اشقیا مسلم کے ساتھ کوئی بھی باقی نہ رہ گیا

ساتھی بنِ عقیل کے ناپید ہو گئے
یا قتل کر دیئے گئے یا قید ہو گئے

ظالم کے ظلم و جور سے کوفہ ہوا تباہ ۳۸ گلیاں بنی تھیں شہر کی ہر سمت قتل گاہ
کر ڈالے ظالموں نے تہِ تیغ بے گناہ مسلم بن عقیل کو طوعہ نے دی پناہ

یہ مومنہ علیؑ کی بڑی خیر خواہ تھی
طوعہؒ دیارِ کوفہ میں حق کی پناہ تھی

مسلم کی جستجو میں پریشان تھے اہلِ شرر ۳۹ مصروف تھے تلاش میں ظالم ادھر ادھر
طوعہؒ کے گھر کی ان کو ملی ناگہاں خبر آ پہنچے قید کرنے کو ہر سو سے فتنہ گر

باندھی اِدھر وغا کو کمر اس دلیر نے
انگڑائی لی نکل کے نیستاں کے شیر نے

مسلم نے تیغ تیز کے جوہر دکھائیے ۴۰ بدبخت اشقیا کے پرخچے اُڑا دیئے
جتنے ہوئے لعین زمیں پر گرا دیئے لاشیں گرائیں، کُشتوں کے پُشتے لگا دیئے

مسلم بن عقیل کے حملے شدید تھے
آئے جو سامنے وہ جہنّم رسید تھے

دیکھی وہ جنگ، پست ہوئے سب کے حوصلے ۴۱ کوئی بھی فرد بڑھ کے نہ آتا تھا سامنے
مسلم کو اشقیا نہ گرفتار کر سکے کہتے تھے دور سے یہ جفا جو کھڑے ہوئے

مشکل ہے ہم گرفت میں لیں اس دلیر کو
قابو میں اپنے کیجیئے دھوکے سے شیر کو

دھوکے سے اشقیا نے انہیں قید کر لیا ۴۲ حاکم کے سامنے انہیں لائے وہ بے حیا
غصّے سے رنگ سرخ تھا ابنِ زیاد کا کہنے لگا غرور سے وہ بانیٔ جفا

آئے تھے تم یہاں پہ امامت کے واسطے
اُکسا رہے تھے سب کو بغاوت کے واسطے

ہم مانتے نہیں بنی ہاشم کی برتری ۴۳ اک کھیل جانتے ہیں پیامِ محمدی
یہ بیعتِ حسینؑ ہے حاکم سے دشمنی تم کو سزا ملے گی تمہارے قصور کی

بھولیں گے ہم بھلا کہیں بدر و حنین کو
ماریں گے تم کو قتل کریں گے حسینؑ کو

زعمِ انا میں آپے سے باہر تھا بد زباں ۴۴ ظالم اُڑا رہا تھا شرافت کی دھجّیاں
بدخو کی گفتگو کا اثر کیا کروں بیاں مسلم بنِ عقیل کے آنسو ہوئے رواں

طوفانِ غم میں کشتیِ اُمّید گھر گئی
آنکھوں میں اہلبیت کی تصویر پھر گئی

آیا خیال ، زینبؑ مغموم کا کبھی !! ۴۵ اکبرؑ کا اور اصغرِ معصوم کا کبھی
قاسمؑ کا اُمِّ فروہ و کلثومؑ کا کبھی سیدانیوں کا سیّدِ مظلوم کا کبھی

اولاد تھی سفر میں علیؑ و بتولؑ کی
دل رو رہا تھا فکر میں آل رسول کی

یہ سوچتے تھے آپ کہ نامہ بھی لکھ چکا ۴۶ آئیں گے اب ضرور ادھر شاہ دوسرا
پیشِ نظر تھا ظُلم بھی ابنِ زیاد کا صدمہ تھا اس کا آل محمدؐ کا ہو گا کیا

معصوم شاہزادوں کا یہ خوں بہائے گا
ابنِ زیاد آگ ہے ، خیمے جلائے گا

آنکھوں میں اشک دیکھ کر بولا وہ پر جفا ۴۷ آئی جو موت شیشۂ دل چور ہو گیا
کہنے لگے یہ آپ کو مرنے کا خوف کیا غم ہے کہ میں امام کو آنے کو لکھ چکا

ظالم ہے تو ترس نہ کبھی اُن پہ کھائے گا
سارے جہاں کے ظلم و ستم اُن پہ ڈھائے گا

سن کر یہ بات طیش میں آیا وہ بدزباں ۴۸ کہنے لگا کہ قتل کروں گا میں اُن کو ہاں
پھر تمکنت سے بولا کہ جلاّد ہیں کہاں لے جائیں بالا خانے پہ اس کو کشاں کشاں

دشمن ہے یہ یزید کا دشمن کو مار دو
مسلم بنِ عقیلؑ کی گردن اتار دو

مرنے سے پہلے آپ نے پانی طلب کیا ۴۹ لیکن لہو جبین کا پیالے میں گر پڑا
بیکس کے ساتھ واقعہ ہر بار یہ ہوا پانی بھی مرتے وقت نہ پیاسے کو نہ مل سکا

مسلم نے سینچا خون سے ایمان کے باغ کو
جلاّد نے بجھا دیا حق کے چراغ کو

لاشے کو پھر طواف کرایا گیا غضب ۵۰ بے سر کو رہگذر پہ پھرایا گیا غضب
میّت کو خاک میں نہ چھپایا گیا غضب کوفہ کے در پہ سر کو سجایا گیا غضب

حق کا سفیر رہروِ راہِ سعید تھا
کوفے میں کربلا کا یہ پہلا شہید تھا

آغاؔ قلم کو روک کہ ماتم کا ہے مقام ۵۱ سینہ زنی کا وقت ہے روتے ہیں خاص و عام
مسلم بنِ عقیل پہ غربت ہوئی تمام راہِ سفر میں ختم ہوا قاصدِ امام

کوفے کی سرزمین پہ موتی بکھر گئے
دو لال ساتھ آئے تھے جانے کدھر گئے

مرثیہ نمبر ۱۱

آج پھر مائلِ پرواز ہے شہبازِ قلم

آج پھر مائلِ پرواز ہے شہبازِ قلم ۱ ساتھ ہے فکرِ رسا ، ہمدم و ہمرازِ قلم
بزمِ پاکیزہ میں ہے نغمہ سرا سازِ قلم لحنِ داؤد ہے رعنائیِ آوازِ قلم
آج بالیدگیٔ روح کا ساماں ہو گا
دل کی کاوش ، عملِ نقشِ سلیماں ہو گا

جو بھی کہتا ہوں بہ توفیقِ خداوندِ قدیر ۲ اس کو نقاد سمجھ لیتے ہیں پتھّر کی لکیر
ذکرِ پاکیزہ سے روشن ہوئی میری تقدیر نامِ مولا سے امر ہو گئی میری تحریر
عظمتِ فکر ، جمالِ ابدی پاتی ہے
یہ پری وقت کے شیشے میں اُتر جاتی ہے

ہے جو محرابِ عبارت میں عبادت کا سوال ۳ باوضو ہو کے بڑھا حُسنِ عقیدت سے خیال
ہے تمنا کہ ہو اظہارِ مودّت میں جمال چن لئے میں بزرگانِ سلف کے اقوال
فیضِ مولا سے چلی فکر جو انوار لئے
دل کی دھڑکن بڑھی گلدستۂ افکار لئے

قصرِ الفاظ میں روشن ہے لہو کی قندیل ۴ رشکِ فردوسی و خیام ہیں افکارِ جمیل
ذکر پاکیزہ ہے آئینہ عرفانِ خلیلؑ ہے مرا طرزِ سخن خود مرے دعوے کی دلیل
گفتگو وقف جو ہے سیّدِ خوشخو کے لئے
شمعِ تدریس ہے یہ فکرِ ارسطو کے لئے

میرے سینے میں فروزاں ہے عقیدت کا چراغ ۵ صورتِ مہر منوّرِ سے صداقت کا چراغ
جلوہ افروز ہے فانوسِ امامت کا چراغ ماحصل زیست کا ہے عشقِ نبوّت کا چراغ
ذکر محمود جو ہے قوتِ ایماں کے لئے
اشک پلکوں پہ اُبھر آئے چراغاں کے لئے

ان چراغوں کے سبب میرا مقدّر چمکا ۶ شعر گوئی کا مرے تاج میں گوہر چمکا
مدح خوانی کا ستارہ سرِ منبر چمکا ذرّہَ خاک مثالِ مہِ انور چمکا
مرثیہ سن کے مرا جوشؔ نے فرمایا ہے
بختِ اسکندرِ اعظم سے سِوا پایا ہے

نقدِ بے جا سے ہوا ، مرثیہ گوئی پہ جمود ۷ مدعا کوئی نہیں جس کا ، بجزنام و نمود
تیرہ و تار جو ہے روشنیٔ چشمِ حسود کیا نظر آئے اسے جلوہَ حُسنِ محمود
داد سُن سُن کے وہ بیزار نظر آتا ہے
گل عقیدت کا اسے خار نظر آتا ہے

مدحتِ شاہِ اُمم جراَتِ رندانہ ہے ۸ شعر گوئی نہیں ادنیٰ سا یہ نذرانہ ہے
دل کی آواز ہے ، چھلکا ہوا پیمانہ ہے مومنو کے لئے فردوس کا پروانہ ہے

فن نہ دیکھو نہ مضامین کی نُدرت دیکھو !
میں ہوں مولائی ، میرا حُسنِ عقیدت دیکھو !

مومنو ! کُھلتا ہے مجلس میں عقیدت کا چمن ۹ دیدۂ نم سے ہے پر نُور حقیقت کا چمن
نورِ ایمان سے روشن ہے مؤدت کا چمن حق کی خوشبو سے معطّر ہے امامت کا چمن

ہے زباں وقف جو اظہارِ حقیقت کے لئے
مرثیہ پڑھتا ہوں مجلس میں عبادت کے لئے

حرفِ آغاز ہے تعریفِ خداوندِ غفور ۱۰ چھایا اللہ کا ہے ارض و سماوات میں نُور
جس کی ہستی کے تصوّر سے ہے ، انسان مجبور ہے رگ جاں کے قریں، قوّتِ احساس سے دور

عقلِ انساں جسے پا جائے وہ اللہ نہیں
جو تصوّر میں سمٹ آئے وہ اللہ نہیں

خالق و مالک و رزّاق و صمد ہے اللہ ۱۱ جس کا ہمسر نہیں ، واحد ہے ، اَحد ہے اللہ
اعلیٰ و ارفع و بالائے خرد ہے اللہ جس کی تقسیم نہ ہو ایسا عدد ہے اللہ

ماحصل بحث کا میری کتبِ خاص میں ہے
ذکرِ توحیدِ خدا ، سورۂ اخلاص میں ہے

اس عقیدے سے اگر کوئی بشر عاری ہے ۱۲ اس پہ ابلیسِ جہالت کا فسوں طاری ہے
وہ ہے مجہول اسے شرک کی بیماری ہے وقعتِ عظمتِ انسان سے وہ عاری ہے

ادنیٰ مخلوق کو مسجود بنا بیٹھا ہے
غیرِ اللہ کو معبود بنا بیٹھا ہے

جس کی فطرت ہے خطا عقل ہے جس کی محدود ۱۳ کیا سمجھ پائے گا وہ رشتۂ عبد و معبود
ہو گا نمرود کہیں یا کہیں عبدِ نمرود خود نمائی اُسے کر دے گی یزیدِ مردود

منکر اللہ کا جب حد سے گزر جاتا ہے
موجۂ نیل میں فرعون نظر آتا ہے

شر سے شیطان کے گمراہ ہے انسان کی ذات ۱۴ جادۂ حق سے ہٹا دیتا ہے اکثر اوقات
اس کی تخلیق جو ہے سلسلۂ لات و منات ان سے منسوب کئے خالقِ احسن کے صفات

ہو گیا حق کے عقیدے سے جو عاری انساں
بن گیا دہر میں پتھر کا پجاری انساں

اس کو بہکاتا ہر سمت سے ابلیسِ قیاس ۱۵ زیبِ تن دن میں جو ہوتا ہے، تقدّس کا لباس
شب کی تاریکی میں بن جاتا ہے وہ دیوِ ہراس چھین لیتا ہے یہ منکر سے یونہی ہوش و حواس

خوف کھاتا ہے، حقائق سے مُکر جاتا ہے
ہو کے انسان، ہیولوں سے یہ ڈر جاتا ہے

ہو جو توحید پہ انساں کو یقینِ کامل ۱۶ ہو نہیں سکتا کبھی بھی شرِ ابلیس مُخل
راہ میں اس کے رکاوٹ ہے نہ کوئی مشکل جذب کر لیتا ہے خود اس کو وجودِ منزل

زندہ رہتا ہے ، حیاتِ ابدی پاتا ہے !!
سر بلندی کے لئے دار پر چڑھ جاتا ہے

ایسے انسان کے ہادی ہیں رسولوں کے رسولؐ ۱۷ جن کے اعمال ہیں پاکیزہ دعائیں مقبول
جن کے اقوال مدلّل ہیں ، دلیلیں معقول اصلِ توحید پہ ہیں جن کی قیادت کے اصول

دعوتِ فکر جو دی فکر کا رخ موڑ دیا
درسِ توحید سے مشرک کا صنم توڑ دیا

کوئی اللہ سے پوچھے مرے آقا کی صفات ۱۸ نورِ قرآن و احادیثِ نبیؐ جن کی ذات
خلق میں احسنِ تقویم ہے سرکار کی ذات جن کے قدموں سے منوّر ہوئی معراج کی رات

حاضر و ناظر و صدیق و امیں ہیں سرکار
حقِ قرآن کی قسم نورِ مُبیں ہیں سرکار

گر نہیں حاضر و ناظر تو شہادت کیا ہے ۱۹ صاحبِ رُشد و ہدایت کی ضرورت کیا ہے
دیں کی تکمیل ہے کیا ختمِ نبوّت کیا ہے بخشوانے کے لئے حشر میں رحمت کیا ہے

موشگافی کا عقیدے میں عمل کیا معنیٰ ؟
معجزے کے لئے اسباب و علل کیا معنیٰ ؟

اوّلِ نور ہے سرکار کی ذاتِ مسعود ۲۰ رُو بُرو جن کے بنے عالمِ امکاں کے حدود
آب و گل میں تھا ابھی حضرتِ آدم کا وجود اور فائز تھے نبوّت پہ محمود

پیکرِ نور پہ ظلمت کا اثر کیوں سمجھیں
اپنا جیسا انہیں دنیا میں بشر کیوں سمجھیں

ذاتِ سرکار کو سمجھو تو ابو طالب سے ۲۱ اُن کی گفتار کو سمجھو ابو طالب سے
اُن کی رفتار کو سمجھو تو ابوطالب سے اُن کے کردار کو سمجھو تو ابوطالب سے

جو مصیبت میں تھا حضرت کو بچانے والا
جانتا خوب ہے پروان چڑھانے والا

ذاتِ سرکار کو پوچھو تو علیؑ سے پوچھو ۲۲ اُن کی گفتار کو پوچھو علیؑ سے پوچھو
ان کی رفتار کو پوچھو تو علیؑ سے پوچھو اُن کے کردار کو پوچھو تو علیؑ سے پوچھو

دوشِ اقدس پہ جو حضرت کی بصد شان چڑھا
وہ بتائے گا جو آغوش میں پروان چڑھا

قریے والوں سے نہ پوچھو کہ انہیں کیا معلوم ۲۳ بصرے والوں سے نہ پوچھو کہ انہیں کیا معلوم
کوفے والوں سے نہ پوچھو کہ انہیں کیا معلوم مکّے والوں سے نہ پوچھو کہ انہیں کیا معلوم

بنی ہاشم کے گھرانے سے حقیقت پوچھو
آلِ اطہار سے سرکار کی سیرت پوچھو

یہ گھرانا ہے جہاں آئے شہنشاہِ زماں ۲۴ خانۂ اہلِ ولا ، مسکنِ آلِ عمراں
مرکزِ اہلِ یقیں ، محورِ علم و عرفاں کعبۂ جنّ و ملک ، منزلِ ختمِ قرآن
کیسی سیرت تھی محمدؐ کی وہ کیا کرتے تھے
وہی بتلائیں گے جو ساتھ رہا کرتے تھے

وہی بتلائیں گے ، سرکار کا پیغام ہے کیا ۲۵ دینِ اسلام ہے کیا مقصدِ اسلام ہے کیا
فرض کیا چیز ہے ، پابندیٔ احکام ہے کیا زیست کہتے ہیں کسے زیست کا انجام ہے کیا
کیسے اعمال سے طاعت کی کلی کھلتی ہے
کس طرح خالقِ اکبر کی رضا ملتی ہے

کُلِّ ایمان ہیں پروردۂ آغوشِ نبیؐ ۲۶ بعدِ سرکار ہیں عالم میں یہی حق کے ولی
یہی اسلام کے رہبر ہیں یہی ہیں ہادی مومنو کے لئے واجب ہے ، اِطاعتِ ان کی
حق کے احکام پہ راضی بہ رضا رہتے ہیں
انہیں افراد کو ہم آلِ عبا کہتے ہیں

میرے معبود بڑھا اور مرے دل کی لگن ۲۷ ضوفگن سر پہ رہے آلِ عبا کا دامن !!
شاد و آباد رہے انکی مؤدت کا چمن لب پہ ہو تذکرۂ آلِ شہنشاہِ زمن
تا ابد گلشنِ ایماں مرا شاداب رہے
میرے ہاتھوں میں یہی گوہرِ نایاب رہے

مدح میں انکی مرا کلکِ گہُر بار چلے ۲۸ جس طرح سوئے نجف شہ کا پرستار چلے

جامِ کوثر جو ملے اس سے نہ انکار چلے دورَ پر دورَ چلے اور بہ اصرار چلے

کوئی مولائے جہاں کُل کا مددگار کہے !!

ہو کے سرشار کوئی حیدرِ کرار کہے

یا علیؑ حیدر کرّار کا نعرہ آئے !! ۲۹ میرے مرشد مرے سرکار کا نعرہ آئے

شیرِ حق ، قاتلِ کفّار کا نعرہ آئے مومنو ! کُل کے مددگار کا نعرہ آئے

حق کے والی کا مُحب ، حق کا پرستار ہوں میں

اس لئے حیدری نعرے کا طلبگار ہوں میں

حیدری نعرہ ہے اسلام کی قوّت کی پکار ۳۰ حیدری نعرہ ہے پیغامِ نبی کا اقرار

حیدری نعرہ ہے میدان میں حق کی للکار حیدری نعرہ ہے شمشیرِ خدا کی جھنکار

جب بھی خواہش کوئی سرگرمِ عمل ہوتی ہے

یا علیؑ کہتا ہوں ، مشکل مری حل ہوتی ہے

حکمِ اللہ سے اعلانِ مودّت ہے یہی ۳۱ حق کی دولت ہے یہی اجرِ رسالت ہے یہی

اہلِ ایمان کے لئے بزم کی زینت ہے یہی میرے جیسوں کے لئے قلب کی قوّت ہے یہی

وقتِ مشکل یہی نصرت مری فرمائیں گے

ہے یقیں ، قبر کی منزل میں علیؑ آئیں گے

یہ تو یہ ان کے غلاموں کا پرستار ہوں میں ۳۲ حامی و معترفِ بوذرؓ دیندار ہوں میں
قنبرؓ و میثمؓ و سلمانؓ کا طرفدار ہوں میں ایسے کردار کا گرویدہٗ کردار ہوں میں

عمر بھر ان پہ رہا آلِ عبا کا دامن
مر گئے ، ہاتھ سے چھوڑا نہ وفا کا دامن

ایسے کردار کے مالک تھے پرستار حسینؑ ۳۳ جن کی صورت میں جِلا دے گئے افکارِ حسینؑ
ناصرِ دینِ مُبیں بن گئے انصارِ حسینؑ !! حُسنِ تاریخِ شہادت ہیں طرفدار حسینؑ

ماں ہو یا بیٹا شہادت کا طلبگار ہوا !
جو بھی تھا ساتھ وہ سرمایۂ افکار ہوا

حُسنِ تاریخ بنا اُمِّ وہب کا کردار ۳۴ جس کے کردار میں تھے نُورِ مُبیں کے انوار
نصرت حق میں کیا، گود کے پالے کو نثار ماںتا ہو گئی قربان بصد عزّ و وقار

لاکھوں ارمان سے آغوش کا پالا تھا وہب
لختِ دل نورِ نظر، گھر کا اُجالا تھا وہب

روزِ عاشور ہوئی جبکہ فضا خون سے لال ۳۵ حق پرستوں میں اُٹھا، نصرتِ مولا کا سوال
تھا سعادت، پسرِ فاطمہؑ زہرا کا خیال دل میں کہتی تھی یہی اُمِّ وہب خوش اعمال

آج میں نورِ نظر فدیۂ اکبرؑ کر دوں
میری دولت ہے وہب اس کو نچھاور کر دوں

پاس بیٹے کے گئی اور کہا لختِ جگر ۳۶ آج کس حال میں ہے فاطمہ بی بی کا پسر
ہے تُلا قتلِ شہِ دیں پہ یزیدی لشکر کتنی مغموم ہے خیمے میں علیؑ کی دختر
دولتِ دیں جو ملے حق کی اعانت سے مجھے
ہو نہ شرمندگی خاتونِ قیامت سے مجھے

کتنے ارمانوں سے پروان چڑھایا ہے تمہیں ۳۷ خود نہیں سوئی ہوں ، راتوں کو سلایا ہے تمہیں
میں ہوں ماں سہرے کے پھولوں میں سجایا ہے تمہیں ابھی کچھ روز ہوئے دولہا بنایا ہے تمہیں
وقت آ پہونچا ہے ، عقبیٰ کا بھی سامان کروں
کیوں نہ اے لال تجھے شاہ پہ قربان کروں

سُن کے بیٹے نے کہا ماں سے کہ فرمان بجا ۳۸ میں ہوں سو جان سے قربانِ شہنشاہِ ھدیٰ
زندگی بن گئی موقع جو شہادت کا ملا ہو اجازت تو میں زوجہ سے بھی مل آؤں ذرا
قبل اس کے کہ ہم آغوشِ شہادت ہو لوں
فرض کہتا ہے کہ زوجہ سے بھی رخصت ہو لوں

اپنے بیٹے کا سخن اُمِّ وہب نے جو سنا ۳۹ بولی میں کرتی نہیں منع کہ رخصت کو نہ جا
ناقص العقل ہے عورت ہے زمانہ کہتا اس کی باتوں میں نہ آجانا نہیں ہو گا بُرا
تو نہ بہکے کبھی قائم ترا ایمان رہے
میرے بیٹے میری باتوں کا تجھے دھیان رہے

پاس زوجہ کے وہب خیمے کے اندر آئے ۴۰ بات کہتے ہوئے رخصت کی مگر شرمائے
کچھ ستارے سے شرافت کے جبیں پر چھائے مدعا دل کا بہ مشکل یہ زباں پر لائے
بولے زوجہ سے کہ رخصت کے لئے آیا ہوں
بی بی میں اپنی شہادت کی خبر لایا ہوں

بولی زوجہ کہ ملے ایسی سعادت تم کو ۴۱ آج اللہ نے دی شہ کی رفاقت تم کو
کر گئی زندۂ جاوید عبادت تم کو نصرتِ حق میں مبارک ہو شہادت تم کو
رکھو غربت میں نہ تنہا مرے سر تاج مجھے
چھوڑ کے جاتے ہو کن لوگوں پہ تم آج مجھے

کہہ نہیں سکتی کہ ارماں تھے دل میں کیا کیا ۴۲ میری نظروں میں تھا کس طرح کا گھر کا نقشا
ہوتا آباد زمانے میں گھرانا میرا اپنے سر تاج کے کاندھوں پہ جنازہ اٹھتا
تم کو جانا ہے جہاں ، ساتھ مجھے لے جانا
میرے سر تاج نہ جنّت میں اکیلے جانا

منتظر اُمِ وہب خیمے کے باہر تھی کھڑی ۴۳ گفتگو ہونے میں ان دونوں کو کچھ دیر لگی
وہ پکاری کہ وہبؔ ابو ، بہت دیر ہوئی اب چلے آؤ کہ میں دودھ نہ بخشوں گی کبھی
گفتگو ختم کرو ، وقت نہ برباد کرو
آؤ مرنے کو مرے لال مجھے شاد کرو

سن کے یہ بات وہب خیمے کے باہر آئے ۴۴ ماں کو افسردہ جو دیکھا تو بہت شرمائے
اپنی کوتاہی پہ مغموم ہوئے گھبرائے دیر اتنی جو لگی آنکھوں میں آنسو آئے
ماں سے کہتے ہی یہ ، آواز گلوگیر ہوئی
درگزر کیجئے اماں بڑی تقصیر ہوئی

ماں تھی ، اس طرح جو بیٹے کو پریشاں دیکھا ۴۵ اپنے سینے سے لگا کر اسے یہ حکم دیا !
جاؤ میدان میں لڑنے کو بڑا وقت ہوا ہاں مگر لے کے بڑھو اذنِ امامِ دوسرا
قبل اس کے کہ بڑھو اپنی شہادت کے لئے
جاؤ سرکار کی خدمت میں اجازت کے لئے

واں سے جب آئے وہب پیشِ شہنشاہِ انام ۴۶ حُر کی میت پہ کھڑے اشک بہاتے تھے امام
وہب نے جُھک کے بصد عجز کیا شہ سے کلام منتظر اذنِ شہادت کا ہے نا چیز غلام
موج زن دل میں ہے ارمانِ شہادت مولا
دیجیئے مرنے کی مجھ کو بھی اجازت مولا

شہ نے فرمایا وہب سے کہ ابھی تم ہو جواں ۴۷ اور نوشاہ ہو تم ، عمر ہے مرنے کی کہاں
ہوں گے زوجہ کے ابھی دل میں ہزاروں ارماں ماں سے بھی پوچھا ہے ، ہو زیست کی جس کی ساماں
نکلو مقتل سے نہ شرماؤ ، اجازت ہے مری
تم مسافر ہو چلے جاؤ ، اجازت ہے مری

جوڑ کے ہاتھ وہب بولے کہ اے شاہ انام ۴۸ متمنی ہے شہادت کا یہ ناچیز غلام
سر کٹے نصرت حق میں تو بڑھے میرا مقام میرا بھی حُرِّ دلاور کی طرح ہو انجام
سرخ رو ہو کے زمانے سے گزرنے کے لئے
ماں نے خود بھیجا ہے، مولا، مجھے مرنے کے لئے

سُن کے یہ دی شہ والا نے اجازت اس کو ۴۹ بخشی سرکار نے کونین کی دولت اس کو
مل گئی نصرتِ مولا کی سعادت اس کو لے چلا سوئے قضا، شوقِ شہادت اس کو
لے کے تلوار بڑھا، حق کی اعانت کے لئے
وہب پروانہ بنے شمعِ امامت کے لئے

جو بھی لڑنے کے لئے لشکرِ اعدا سے بڑھا ۵۰ وہبِ کلبی کی شجاعت نے اسے زیر کیا
ضربتِ تیغ نبی اس کے لئے دستِ قضا مرغِ بسمل نظر آتا تھا تڑپتا لاشا
زعم تھا جس کو شجاعت کا وہ سر کاٹ دیا
جوہرِ تیغ سے میدانِ وغا پاٹ دیا

اس طرح اُمِّ وہب نے جو شجاعت دیکھی ۵۱ سرِ میدانِ وغا آ گئی بڑھتی بڑھتی
دل میں کہتی تھی خدا نے مری عزت رکھی فاطمہؑ بی بی سے شرمندہ نہ ہونے پائی
مجھ کو کچھ فکر نہیں، گود کا پالا نہ رہے
دین روشن ہو، مرے گھر کا اُجالا نہ رہے

اِس طرف لشکرِ اعدا نے وہب کو گھیرا ۵۲ تیر مارا کسی ظالم نے کسی نے تیشہ
یک بیک خاک اُڑی رن میں اندھیرا چھایا اپنے بیٹے کا لہو اُمِّ وہب نے دیکھا

لشکرِ ظلم نے انسان کا شرف پھینک دیا
کاٹ کے بیٹے کا سر ماں کی طرف پھینک دیا

ماستا بھڑ کی لیا گود میں سر بیٹے کا ۵۳ دل جو بھر آیا تو جی بھر کے اُسے پیار کیا
پھر سوئے فوجِ لعیں کہہ کے اُسے پھینک دیا میں نہیں لیتی یہ سر جس کا کیا ہے صدقا

جس سے روشن ہے زمانہ وہ اُجالا بچ جائے
فاطمہؑ بی بی کی آغوش کا پالا بچ جائے

ہاں مگر بچ نہ سکا فاطمہ بی بی کا پسر ۵۴ عصر کے وقت تہِ تیغ ہوا شاہ کا سر
بے رِدا ہو گئی زہراؑ و علیؑ کی دُختر خیمۂ پاک میں در آیا یزیدی لشکر

آلِ یسین کا گھر شمرِ لعیں نے لُوٹا
تھا جو سرمایۂ دیں لشکرِ کیں نے لُوٹا

ظلم سے سرخ و سیہ ہو گئی عاشورہ کی شام ۵۵ آگ لگنے سے بھڑکنے لگے مولا کے خیام
سہمے بچوں کے لئے رہ نہ گیا کوئی مقام بی بی زینبؑ کی تھا آغوش میں بیمار امام

آگ سے بیبیاں بچوں کو لئے آتی تھیں
ایک سے دوسرے خیمے میں چلی جاتی تھیں !!

صبر کو آہنی دیوار بنی تھیں زینبؑ ۵۶ قوتِ حق کی علمدار بنی تھیں زینبؑ
دین کی قافلہ سالار بنی تھیں زینبؑ بعدِ شہ حیدرِ کرار بنی تھیں زینبؑ

نہ ہوئی غم سے پریشان علیؑ کی بیٹی
بن گئی حق کی نگہبان علیؑ کی بیٹی

اے قلم تھم کہ ہوئی مجلسِ مولا مقبول ۵۷ بانیٔ بزمِ عزا پر ہوا رحمت کا نزول
اشکِ غم شہ کے عزاداروں کے چنتی ہیں بتول میری دولت ہے یہی تذکرۂ آلِ رسول

حشر کے خوف سے آغا نہ میں گھبراؤں گا
مرثیے پڑھتا میں محشر میں چلا جاؤں گا

○

قدرت کا یہ انعام رہے گا باقی
اسلام کا پیغام رہے گا باقی
ہے اس کا یقیں، ذکرِ محمدؐ کے طفیل
تا حشر مرا نام رہے گا باقی

مرثیہ نمبر ۱۲

ہے گرفتارِ انا روزِ ازل سے انسان

ہے گرفتارِ انا روزِ ازل سے انسان ۱ خوار و گمراہ ہے باطل کے خلل سے انسان
شمر و شدّاد ہے خود اپنے عمل سے انسان منسلک آج بھی ہے لات و ہُبل سے انسان

خود نمائی کے صنم سر پہ اُٹھا رکھے ہیں
کتنے بت ذہن کے پردوں میں چھپا رکھتے ہیں

ہر طرف پھیلے ہیں اصنامِ یزیدِ بے پیر ۲ ابنِ ملجم ہے کوئی اور کوئی شمرِ شریر
ہے ابوجہل کوئی کوئی حصین ابن نمیر کوئی سفّاک درندہ ہے کوئی مُردہ ضمیر

دَور دورہ ہے ہر اک سمت پریشانی کا
لاشہ عریاں ہے پڑا عظمتِ انسانی کا

ہوس زر سے ہے ہاتھوں میں طلائی زنجیر ۳ ہے بیانات کی آغوش میں حُورِ تشہیر
شہرِ افکار کا سلطان ہے دیوِ تحقیر خون انسان کا پیتی ہے انا کی شمشیر

یوسفِ فکر کا سودا ہے جہانداروں میں
ابنِ آدم کا شرف بکتا ہے بازاروں میں

بہرِ تسکین اَنا ہے جو نظریات کی جنگ ۴ چار اطراف میں چھائی ہے خیالات کی جنگ
امن کے نام پہ ہے رسم و روایات کی جنگ خود نمائی کا نتیجہ ہے ہر اک بات کی جنگ

ایک کہتا ہے کہ میدان مرے ہاتھ رہے
دوسرا کہتا ہے دنیا میں مری بات رہے

قتل و غارت سے ہے رنگین بساطِ عالم ۵ بحرِ احمر کا ہے طوفان ، فسادِ پیہم
وارثِ جذبۂ قابیل ہے نسلِ آدم تنگِ انسان ہے انسان پہ انساں کا ستم

مثلِ ابلیس گرفتار اَنا ہے انساں
دہر میں اژدرِ خونخوار بنا ہے انسان

سرخ ہے خون کے چھینٹوں سے فضا کا دامن ۶ آتشِ بُغض نے پھونکا ہے جہاں کا خرمن
فتنہ و شر نے اجاڑا ہے محبت کا چمن چپّے چپّے پہ درندوں کے بنے ہیں مسکن

خود نمائی کا جنوں سر پہ چڑھا رہتا ہے
نوعِ انسان کے ہاتھوں سے لہو بہتا ہے

جوہرِ عجز ہے زندانِ اَنا میں محدود ۷ ابتری پھیلی ہے ہر سمت سکوں ہے مفقود
آگ ہی آگ ہے ہر فرد بنا ہے نمرُود جائے انسان کہاں راہِ مفر ہے مسدود

جبر ہے جور ہے ، تخریب ہے ، خوانخواری ہے
گوشے گوشے میں تباہی کا عمل جاری ہے

پارہ پارہ ہوئی انساں کی شرافت کی قبا ۸ وقف ابلیس ہوئی حُورِ محبّت کی حیا
لے اُڑا قیسِ حسد لیلیٰ عصمت کی روا کھا گئی عظمتِ انسان کو انساں کی اَنا

نہ صداقت نہ اُخوّت کی فضا باقی ہے
اُجڑے عالم میں فقط جور و جفا باقی ہے

مقصدِ زیست بنا حجرۂ باطل کا طواف ۹ شمر کے بُت پہ چڑھایا ہے تقدّس کا غلاف
ظلم سے ڈال دیئے سینہ گیتی میں شگاف کیا قیامت ہے کہ انسان ہے، انساں کے خلاف

گلشنِ زیست کو پامال کئے جاتا ہے
اپنی تخریب سے تسکینِ اَنا پاتا ہے

خود سری نے اسے فرعون بنا رکھا ہے ۱۰ تاج تخریب کا ماتھے پہ سجا رکھا ہے
ایک طوفانِ بلا سر پہ اُٹھا رکھا ہے ہر طرف حشر کا ہنگام مچا رکھا ہے

گرگِ خونخوار، درندوں کی طرح جیتا ہے
بھائی کا بھائی زمانے میں لہو پیتا ہے

اُف تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہے انسان ۱۱ آگ ہی آگ ہے شعلوں کے چڑھے ہیں طوفان
خرمنِ زیست پہ ہے سلسلۂ برقِ تپاں ایسے ماحول میں مامن ہے تو نورِ ایمان

شر کے بھڑکے ہوئے شعلوں کو بجھا سکتا ہے
دینِ اسلام ہی انسان کو بچا سکتا ہے

دینِ اسلام ہے آئینِ حیاتِ انسان ۱۲ اس کی تعلیم ہے تہذیبِ صفاتِ انسان
اس کی تبلیغ کا محور ہے نجاتِ انسان مظہرِ احسنِ تقویم ہے ذاتِ انسان
حُسنِ کردار سے خورشید فلک بن جائے
ایسے اعمال ہوں مسجودِ فلک بن جائے

دین اسلام سکھاتا ہے شرافت کا سبق ۱۳ خلق و اخلاص و محبت کا صداقت کا سبق
عدل و انصاف و مساوات و امانت کا سبق زہد و تقویٰ کا سبق، حق کی عبادت کا سبق
جو سمجھ دار ہے اسلام کا گرویدہ ہے
ہے یہی دین جو خالق کا پسندیدہ ہے

دینِ اسلام کے داعی ہیں رسول مقبول ۱۴ جو ہیں نبیوں کے نبی اور رسولوں کے رسول
جن کی ہستی پہ ہوا رحمتِ خالق کا نزول جن کے دامن میں کھلے گلشنِ ایمان کے پھول
بندۂ و خواجہ کی تفریق مٹا دی جس نے
دوست تو دوست ہیں دشمن کو دعا دی جس نے

جن کے افکار سے دنیا نے بصیرت پائی ۱۵ جن کی گفتار سے دنیا نے صداقت پائی
جن کی رفتار سے دنیا نے ہدایت پائی جن کے کردار سے دنیا نے شرافت پائی
خود نمائی کے چمکتے ہوئے بت توڑ دیئے
جن کے اخلاق نے ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیئے

ہے تمنائے دلی عرش سے تارے لاؤں ۱۶ نامِ سرکارِ دو عالم سے فضا چمکاؤں
اپنے آقا کی محبت کے ترانے گاؤں زندگی بھر یہی دنیا میں سعادت پاؤں

دینِ اسلام کے بانی کا پرستار رہوں
بادۂ عشقِ محمدؐ سے میں سرشار رہوں

ذکرِ سرکار سے پر نُور زباں ہو جائے ۱۷ قابلِ رشک یہ اندازِ بیاں ہو جائے
ہر طرف چشمہ انوار رواں ہو جائے نقطے نقطے پر ستاروں کا گماں ہو جائے

بن کے اشکوں کی لڑی دل جو فلک پر چمکے
کہکشاں بن کے مرا بخت فلک پر چمکے

میرے مولا تری مدحت میں قلم وقف رہے ۱۸ کاوشِ فن مری ، اغیار کے طعنے نہ سہے
موجِ کوثر کی طرح چشمۂ تخیلؔ بہے جو سُنے جب بھی سُنے ترا پرستار کہے

نورِ محمود کی ضَو قلبِ نہاں سے نکلے
یا محمدؐ کی صدا میری زباں سے نکلے

یا محمدؐ کی صدا سلسلۂ ذکرِ جمیل ۱۹ یا محمدؐ کی صدا قوتِ ایمان کی دلیل
یا محمدؐ کی صدا رحمتِ حق کی تنزیل یا محمدؐ کی صدا دین کی روشن قندیل

حق پرستوں کا زمانے میں طریقہ ہے یہی
مردِ مومن کے لئے اس کا وظیفہ ہے یہی

نام سرکار کے صدقے میں بڑھا میرا کلام ۲۰ میرے اشعار میں ہے حق و صداقت کا پیام
نظمِ اُردو میں پروئے ہیں اصولِ اسلام منفرد مرثیہ گوئی میں ملا مجھ کو مقام

داد مجلس میں جو پاتا ہوں تو دلجوئی نہیں !
ربِّ اکبر کے خزانے میں کمی کوئی نہیں

میری قسمت میں جو تھی مدحِ شہنشاہِ اُمم ۲۱ سر پہ سائے کو بڑھا مذہبِ حقّہ کا علم
ماہِ تاباں کی قسم مہرِ منوّر کی قسم صرف توفیق الٰہی سے بڑھا زورِ قلم

ذکرِ پاکیزہ سے پر نور جو تقریر ہوئی
مرثیہ گوئی سے روشن میری تقدیر ہوئی

کتنے نایاب مضامین ہیں عنوانِ سخن ۲۲ بھر گیا گوہرِ معنیٰ سے ادب کا دامن
کیسا گلہائے عقیدت سے سجایا ہے چمن میری امداد کو آتے ہیں شہنشاہِ زمن

" یہ سخن موجِ مئے ناب تو ہے درد نہیں "
مدعی دیکھ لے آمد ہے یہ آورد نہیں

توڑ دیتی ہے محبت کی لگن فن کے حدود ۲۳ شاہ راہوں میں بدل جاتی ہے راہِ مسدود
مدحتِ ذاتِ محمدؐ جو ہے میرا مقصود کلکِ ضَو بار بڑھا پڑھ کے محمدؐ پہ درود

چشمِ عارف سے سوا دیدہ نم پاتا ہوں !!
سامنے روشنیٔ باغِ اِرم پاتا ہوں

رہبرِ راہِ نبی روشنیٔ باغِ ارم ۲۴ خود بخود اٹھنے لگے اشہبِ خامہ کے قدم

اپنا مقصود جو ہے ذکرِ شہنشاہِ اُمم عکسِ تحریر ہوا آئینۂ لوح و قلم

نکہتِ باغِ ارم حلقۂ احساس میں ہے

سارے عالم کی جھلک دامنِ قرطاس میں ہے

ہے مقدّر میں جو پاکیزہ خیالی کا شرف ۲۵ ذکر بڑھتا ہے نبوّت سے امامت کی طرف

حکمِ سرکار ہے توصیفِ شہنشاہِ نجف رونقِ دینِ مُبین ہے ابوطالب کا خلف

حق پرستوں میں چلیں حق کے ولی کی باتیں !!

باعثِ زینتِ مجلس ہیں علیؑ کی باتیں

یا علیؑ کہہ کے قلم جوشِ مودّت میں بڑھا ۲۶ جیسے عابد کوئی محرابِ عبادت میں بڑھا

سرنگوں ہو کے جو توصیفِ امامت میں بڑھا مرتبہ اور بھی دربارِ رسالت میں بڑھا

زورِ تحریر سے مجلس کو جو گرمایا ہے

مدحِ ممدوحِ محمدؐ کا صِلا پایا ہے

مدحِ ممدوحِ محمدؐ جو زباں پر آئی ۲۷ اک مودّت کی فضا چار طرف لہرائی

نامِ مولا جو سنا ، جُھوم اُٹھے مولائی نورِ ایمان بڑھا ، قلب نے لذّت پائی

ساغرِ جم سے سِوا ، حق کے ولی کا نعرہ

مومنو کے لئے تحفہ ہے علیؑ کا نعرہ

یہ وہ نعرہ ہے کہ ہل جاتا قصرِ باطل ۲۸ یہ وہ نعرہ ہے کہ ہل جاتے ہیں کفّار کے دل
یہ وہ نعرہ ہے کہ حل ہوتی ہے ہر اک مشکل یہ وہ نعرہ ہے کہ پا جاتا ہے ، راہی منزل

آگ گلزار بنی چشمۂ دوراں ٹھہرا !!
اسی نعرہ کے سبب نوحؑ کا طوفان ٹھہرا

موج زن آج بھی ہے چشمۂ فیضانِ علیؑ ۲۹ علم کے شہر کا دروازہ ہے عرفانِ علیؑ
کلِّ ایمان کا مصداق ہے ایمانِ علیؑ کسقدر ملّتِ بیضا پہ ہے احسانِ علیؑ

دینِ اسلام کی عظمت کا یہ سامان کیا !
خود بھی قربان ہوئے آل کو قربان کیا

دینِ قیّم کی محافظ ہے علی کی اولاد ۳۰ نام سے جن کے لرز جاتا عفریتِ فساد
ہے بجا اُنکو کہیں وارثِ شمشیرِ جہاد گلشنِ دینِ مُبین ان کے سبب ہے آباد

جانِ اسلام ، شہنشاہِ شہادت ہیں حسینؑ !!
حق پرستوں کے لئے حق کی علامت ہیں حسینؑ

جبکہ باطل کی ہوئی لشکرِ حق پر یلغار ۳۱ مسخ ہونے لگیں اسلام کی اعلیٰ اقدار
ہو گیا ظلم سے انسان کا جینا دشوار تب بنی دیں کہ سپر ابنِ علیؑ کی تلوار

دہر میں دین کا پیغام نہ باقی رہتا
یہ نہ سر دیتے تو اسلام نہ باقی رہتا

جب اُٹھے حق کی حفاظت کو شہِ جنّ و بشر ۳۲ ساتھ میں آپ کے اصحاب بھی تھے سینہ سپر
روزِ عاشور جو تھی مقصدِ اعلیٰ پر نظر ہو گیا زندۂ جاوید حسینیؑ لشکر

سرخ رو ہو گئے معراجِ عبادت پائی
سیدھے جنّت کو گئے ایسی شہادت پائی

فخرِ اسلام ہے عالم میں حسینیؑ لشکر ۳۳ جن کے کردار پہ نازاں تھے شہِ جنّ و بشر
نصرتِ حق کے لئے باندھی تھی ہر اک نے کمر اس کا شاہد ہے حبیب ابن مظاہر کا سفر

نہ تو دولت کے لئے اور نہ حکومت کے لئے
یہ فقط آئے تھے شبیرؑ کی نصرت کے لئے

جاں ہتھیلی پر لئے مرنے کو گھر سے نکلے ۳۴ باندھ کے سر سے کفن کوفے کے در سے نکلے
حق کے شیدائی تھے باطل کے اثر سے نکلے نصرتِ حق کے لئے مرکزِ شر سے نکلے

شہر کوفہ سے نکل کر یہ کہاں تک پہونچے
کربلا آئے شہنشاہِ زماں تک پہنچے

اس مجاہد کے پہونچنے کا عجب تھا منظر ۳۵ فرطِ جذبات سے بے خود تھا حسینی لشکر
جب سنی زینبِؑ دلگیر نے آنے کی خبر آپ نے حضرتِ فضّہ سے کہا بُلوا کر

منزلِ حق کے طلبگار ، مسافر کو سلام
کہہ دو زینبؑ کا حبیب ابنِ مظاہر کو سلام

اللہ اللہ حبیب ابنِ مظاہر کا مقام ۳۶ جن کی تقدیر میں تھا زینبؑ عالی کا سلام
سُن کے بے حال ہوا آلِ محمدؐ کا غلام اپنا سر پیٹ لیا اور کیا رو کے کلام
زندگی میں مری کیا سخت مقام آیا ہے
بنتِ خاتونِ قیامت کا سلام آیا ہے

ہائے کیا آلِ محمدؐ یہ اُفتاد پڑی ۳۷ کیسی مغموم ہے خاتونِ جناں کی بیٹی
یہ مرا بخت ہے، کام آئے جو میری ہستی کم عبادت سے نہیں نصرتِ اولادِ علیؑ
سرخرو پیشِ نبی میں سرِ محشر ہو جاؤں
جان دوں، آلِ محمدؐ پہ نچھاور ہو جاؤں

سُن کے یہ بات مرا ذہن کہیں اور گیا ۳۸ آ گیا یاد مجھے سلسلۂ جور و جفا
عصر کا وقت تھا جب باغ محمدؐ کا لُٹا چھن گئی وارث زہرا سے ردائے زہراؑ
ہفت افلاک ہلے، لوح و قلم کانپ گئے
آگ خیموں میں لگی اہلِ حرم کانپ گئے

کیا مصیبت کی گھڑی اہلِ حرم پر آئی ۳۹ غم کی تصویر بنی شامِ غریباں چھائی
اشکِ خوں روتی تھی خاتونِ جناں کی جائی سر کٹائے ہوئے مقتل میں پڑا تھا بھائی
ایک برچھی سی کلیجے میں چبھی جاتی تھی
فاطمہؑ بی بی کے رونے کی صدا آتی تھی

غم سے بے حال تھے سب بعدِ امامِ مظلوم ۴۰ آلِ اطہار پہ تھا سخت مصائب کا ہجوم
سو گئے خاک پہ سہمے ہوئے بچے معصوم تھی نگہبان فقط زینبؑ و اُمِ کلثومؑ

بیبیاں رات گزرنے کی دعا کرتی تھیں
فرضِ عباسِؑ علمدار ادا کرتی تھیں

یک بیک ٹوٹ گیا شب کی سیاہی کا اثر ۴۱ ایک گھوڑے پر پڑی حضرتِ زینبؑ کی نظر
رُخ اسی سمت تھا تھرّا گیا بی بی کا جگر بولی اسوار سے گھبرا کے علیؑ کی دختر

آج کی رات خموشی سے بسر ہونے دو
لُوٹنا اور ہے ہم کو، تو سحر ہونے دو

تھا وہ اسوار کہ بڑھتا چلا آتا تھا مگر ۴۲ جیسے بے ہوش ہو کوئی کہ نہیں کچھ بھی خبر
سُن کے زینبؑ کی صدا کچھ ہوا مطلق نہ اثر غیظ میں بڑھ کے پکاری یہ علیؑ کی دختر

روک لے باگ تجھے داورِ محشر کی قسم
ورنہ سر ہو گا قلم حیدر و صفدر کی قسم

دل کو اسوار کے برما گیا زینبؑ کا خطاب ۴۳ اشک بہنے لگے آنکھوں سے دیا کچھ نہ جواب
دل پہ قابو نہ رہا، ہو گیا ایسا بے تاب نام بیٹی کا لیا پھینک دی چہرے سے نقاب

ہونٹ تھرّائے جگر کانپا، بدن تھرّایا
دشتِ غربت میں جو زینبؑ نے علیؑ کو پایا

یا علیؑ کہہ کے گری خاک پہ بنتِ زہراؑ ۴۴ پھر پکاری کہ کہاں آپ تھے اب تک بابا
لُٹ گیا عصر کے ہنگام ، مرا ماں جایا سر برہنہ ہوئے ہم، چھن گئی اماں کی ردا
ظالموں نے مری غربت کا تماشا دیکھا !
میں نے بھائی کا تڑپتا ہوا لاشا دیکھا

بابا کیا عرض کریں اشکوں سے منہ دھوئے ہیں ۴۵ بابا ہم اپنے بھرے گھر کو یہاں روئے ہیں
بابا جو جان سے پیارے تھے یہاں کھوئے ہیں بابا ہے ہوئے معصوم ابھی سوئے ہیں
ایسی غربت ہے کوئی پاس نہیں ہے بابا !!
ہم ہیں بے آس کہ عباس نہیں بابا

سُن کے بیٹی کے سخن صبر کا یارا نہ رہا ۴۶ ہُوک سینے میں اُٹھی کانپ گئے شاہِ ہدیٰ
ضبط اشکوں کو کیا اور یہ بیٹی سے کہا پہرہ میں دیتا ہوں اے زینبِ خستہ سو جا
تیری قسمت میں ابھی قید رسن ہے بیٹی
دور ہے شام بہت راہ کٹھن ہے بیٹی

اے قلم صبر کہ آفاق میں ہے شور و فغاں ۴۷ ہاتھ تھراتے ہیں لکھنے کی نہیں تاب و تواں
جلتے آنسو جو بُجھے چھا گیا عالم میں دھواں دل شکستہ جو ہوا ، ٹوٹ گیا زورِ بیاں
مرثیہ اور بھی آغاؔ کو عطا ہو ، مولا
درگزر کیجئے گر کوئی خطا ہو ، مولا

مرثیہ نمبر ۱۳
انساں کو آج امن و سکون کی تلاش ہے

انساں کو آج امن و سکون کی تلاش ہے ۱ افلاسِ زیست موجبِ فکرِ معاش ہے
ظلم و ستم سے قلبِ بشر پاش پاش ہے شیطان کی ٹھوکروں میں شرافت کی لاش ہے
دنیا میں ظالموں سے کوئی بولتا نہیں
انسانیت کے حق میں زباں کھولتا نہیں

مسند نشین ہوا ہے جو ابلیسِ کینہ جُو ۲ ہے مفسدوں کے ہاتھ شریفوں کی آبرو
ارزاں ہوا ہے دہر میں انسان کا لہو خنجر بکف جہاں میں ہیں قزاق کُو بہ کُو
ظالم کو بزمِ ظلم میں کیا کیا روا نہیں !!
پانی مرا ہے آنکھوں کا ، شرم و حیا نہیں

بگڑا ہوا جو نوعِ بشر کا مزاج ہے ۳ سفاک اہر من کا زمانے میں راج ہے
ِکبر و غرور و فخر کا ماتھے پہ تاج ہے بدمست اقتدار کا قابیل آج ہے
غیرت بشر کی شرم سے بے موت مر گئی
غلطاں لہو میں حُورِ شرافت کو کر گئی

پایا ہے رہزنوں نے جو عالم میں اقتدار ۴ خنجر کی نوک پر ہے۔ حکومت کا انحصار
لُٹتا ہے شاہ راہوں پہ انسان کا وقار مظلوم کا کوئی نہیں ہمدرد و غمگسار

پشتِ ستم زدہ پہ جو دُرّوں کا زور ہے
یہ زندگی عُبور بہ دریائے شور ہے

انسان لے رہا ہے جو انساں سے انتقام ۵ غیظ و غضب کی آگ برستی ہے صبح و شام
چکّی میں پس رہے ہیں مظالم کی خاص و عام انسان میں اب کہاں رہا انسانیت کا نام

شمرِ لعیں ہے، پیکرِ بُغض و عناد ہے
ہر فرد اپنے وقت کا ابنِ زیاد ہے

فرعون ہو چکا ہے رعونت کے زعم میں ۶ قارون ہو گیا ہے یہ دولت کے زعم میں
شدّاد کی طرح ہے امارت کے زعم میں نمرودِ وقت ہے یہ حکومت کے زعم میں

ہے آرزو کہ زیر اَنا کُل جہاں رہے
ہاتھوں میں اقتدار کا گُرزِ گراں رہے

آپے میں اپنے وقت کا شمرِ لعیں نہیں ۷ آنکھیں ہیں شعلہ بار چڑھائے ہے آستیں
قبضے میں اقتدار کا ہے نیزۂ حصیں ہے جس کی زد پر شہرِ شرافت کا ہر مکیں

جس نے بھی اس کے حکم سے انکار کر دیا
گھر بار اس کا لوٹ کے مسمار کر دیا

حق بات جس نے کی اسے جینے نہیں دیا ۸ جلاّد بن کے اس کو تہہ تیغ کر دیا
سر پر جنوں سوار جو ہے اقتدار کا خود کو خدا سمجھتا ہے، کم ظرف بے حیا
سمجھا ہے پائیدار یہ، نا پائیدار کو
انجام کی خبر نہیں مُشتِ غبار کو

فرعوں ایسے گزرے ہیں عالم میں بے شمار ۹ جن کا وجود اُن کے لئے خود بنا تھا بار
تاریخ جن کے فتنوں سے ابتک ہے شرمسار باقی رہا نہ چار پہر جن کا اقتدار
حرفِ غلط کی طرح سے معدوم ہو گئے
دم بھر میں تاج و تخت سے محروم ہو گئے

پھر کیوں ہو اقتدارِ جہاں پر غرور و ناز ۱۰ یہ تو ہے ایک فتنۂ ابلیسِ حیلہ ساز
ہے عجز و انکسار میں انسانیت کا راز خوفِ خدا سے ہوتا ہے انسان سر فراز
ابلیسِ خواہشات کا بندہ ہے آدمی
خوف خدا نہ ہو تو درندہ ہے آدمی

خوفِ خدا ہے باعثِ توقیرِ آدمی ۱۱ دونوں جہاں میں جس سے سنورتی ہے زندگی
تاریکیوں میں ہے یہی مینارِ روشنی اس کی ضیا میں کوئی بھی بھٹکا نہیں کبھی
کون و مکاں میں لائقِ تعظیم ہے بشر
خوفِ خدا سے احسنِ تقویم ہے بشر

خوفِ خدا پہ امن و سکوں کا ہے انحصار ۱۲ نظروں میں ہیچ ہوتا ہے دنیا کا اقتدار
اخلاق و انکسار ہے انسان کا وقار حُسنِ عمل ہے اسوۂ سرکارِ نامدار
دستورِ زندگی ہے خدا کا نظام ہے
امن و سکوں پیامِ رسولِ انام ہے

نعماتِ دو جہاں سے ہے پُر دامنِ رسولؐ ۱۳ جس میں ملیں گے دہر کو امن و سکوں کے پھول
انسان چاہتا ہے اگر خیر کا نزول اپنائے زندگی کے لئے دین کے اصول
اونچا کیا ہے جس نے بشر کے وقار کو
وہ دین جو پسند ہے پرودگار کو

اسلام ہی خدا کا پسندیدہ دین ہے ۱۴ روشن چراغِ راہ ہے حبلِ متین ہے
خیرِ عمل کا دونوں جہاں میں امین ہے راہِ نجات جلوۂ نورِ مُبین ہے
دستورِ دین ، رحمت ربِّ غفور ہے
تاریکیوں سے راہِ ہدایت کا نُور ہے

آیا جو ذکرِ نُور تو روشن ہوا بیاں ۱۵ پاکیزگی میں موجۂ کوثر ہوئی زباں
مقصود ہے جو تذکرۂ شاہِ دو جہاں قرطاس کی زمین ہے ، صد رشکِ آسماں
پایا صلہ خدا سے یہ مولا کے ذکر کا
کچھ اور نُور بڑھ گیا قندیلِ فکر کا

کم ہے جو صبح و شام بھی شکرِ خدا کروں ۱۶ مجھ پر ہے فضل ، مدحِ شہ دوسرا کروں
توصیف مصطفیٰؐ سے معطّر فضا کروں نوکِ قلم سے حقِ عبادت ادا کروں

معمور گفتگو ہے فصاحت کے باب سے
شیریں سخن ہوں ذکرِ رسالت مآب سے

فکرِ رسا کی دوش پہ ہے ، قلزمِ نجوم ! ۱۷ پانی ہے جس کے سامنے حُسنِ بلادِ روم
ہر نقطہ ذکرِ خیر کا ہے مصدرِ علوم کون و مکان میں پڑ گئی صلِّ علیٰ کی دھوم

نغمات کا نزول ہے ربِّ ودود کی
برسا رہی ہیں نُور ، صدائیں درود کی

ذاتِ حضور نورِ ازل ، نورِ اوّلیں ۱۸ وجہ بنائے کون و مکاں ختمِ مُرسلیں
آدم کا فخر ، حق کا شرف ، صادق و امیں میزانِ عدل ، شافعُ محشر ، اصولِ دیں

توصیفِ ذاتِ سرورِ عالم محال ہے
خاکی بیانِ نور کرے کیا مجال ہے

ہاں پھر بھی انکا نام ہی حُسنِ کلام ہے ۱۹ پڑھیے درودِ پاک ، ادب کا مقام ہے
ان کا پیام وجہ بقائے دوام ہے اسلام ان کے اسْوہَ حسنہ کا نام ہے

روشن جہاں میں نورؔ کی قندیل ہو گئی
یہ وہ ہیں جن پہ دین کی تکمیل ہو گئی

تکمیلِ دینِ حق ہوئی جشنِ غدیر میں ۲۰ آیات آئیں ، شانِ جنابِ امیر میں
پیغام تھا نبی کا یہ جمِ غفیر میں مولا علیؑ ہیں سب کے صغیر و کبیر میں
اعلان تھا جہاں کی ہدایت کے واسطے
نعرہ لگا علیؑ کی ولایت کے واسطے

دل کا سرور گرمیٔ مجلس اسی سے ہے ۲۱ سر شار جام فکر ولایت علیؑ سے ہے
دینِ مُبین کا بات وصیؑ نبی سے ہے روشن چراغِ فکر اسی روشنی سے ہے
تشریحِ دینِ حق جو ہوئی بات بات سے
اسلام کو فروغ ہوا ، ان کی ذات سے

اسلام کیا ہے ، دینِ مبیں راہِ مستقیم ۲۲ انسانیت کا قصرِ شرف ، رحمتِ رحیم
امن و سکوں کے واسطے اک قلعۂ عظیم دستورِ حق کلیدِ درِ جنتِ نعیم
پاکیزگیٔ فکر و عمل ، نورِ زندگی
دونوں جہاں کے واسطے دستورِ زندگی

اپنائے جس کسی نے بھی اسلام کے اصول ۲۳ ہاتھوں میں اس نے تھام لیا دامنِ رسولؐ
پائی نجات ، رحمتِ حق کا ہوا نزول اعمال اس کے کر لئے اللہ نے قبول
جادہ جو اختیار کیا ، اس نے دین کا
بے شک وہ ایک فرد بنا مُخلصین کا

ایسے مخلصین تھے پروانۂ حسینؑ ۲۴ جب کربلا کی سمت چلے شاہِ مشرقین
اسلام کا حصار تھا ، زہراؑ کا نور عین دیں کا ستون تھا پسرِ فاتحِ حنین
مولا کے ہمسفر تھے حمایت میں دین کی
کردار میں جھلک تھی امامِ مبیں کی

جلوہ فگن تھا دل میں جو پیغامِ مصطفیٰ ۲۵ مرنے کی آرزو میں شہادت کا شوق تھا
پیشِ نظر تھی عظمتِ اسلام کی بقا ہاتھوں میں تھام کے بڑھے دامن حسینؑ کا
اسلام کی اَساس و صداقت پہ ناز تھا
تھے حق پرست ، حق کی رفاقت پہ ناز تھا

تھا وہ اثر رفاقتِ ابنِ رسولؐ کا ۲۶ ہر فرد تھا یقین کا پیکر بنا ہوا تھا
بے مثل تھے امام کے اصحابِ با وفا جو بھی کہا حسینؑ نے، اس پر عمل کیا
جاں سے عزیز رکھتے تھے حق کے پیام کو
امرِ خدا سمجھتے تھے ، حکمِ امام کو

جونؑ و زہیرِ قینؑ و حبیبِ وفا شعار ۲۷ مسلمؑ ابو ثمامہ سعیدِ فلک وقار
قیسؑ و بریرؑ و مسلمِ جانباز جانثار مولا کے ساتھ آئے تھے یکتائے روزگار
قدموں سے اپنے جانبِ مقتل یہ آئے تھے
دیں کے اصول اپنے گلے سے لگائے تھے

ہنگامِ عصر گرم تھا میدان کارزار ۲۸ مشغول تھے جہاد میں مولا کے جانثار
پیشِ نظر تھا ، دولت اسلام کا وقار مرنے کی آرزو میں تھے دیندار بے قرار
تھا جوش یہ کہ سر کٹے پائے حسینؑ پر
مر جائیں ہم پہ آنچ نہ آئے حسینؑ پر

اسدم ابو ثمامہ نے مولا سے عرض کی ۲۹ وابستہ ہے حضور سے ہم سب کی زندگی
ہاں ایک آرزو ہے غلاموں کی اس گھڑی پڑھ لیں نمازِ ظہر امامت میں آپ کی
ہم سب کے حق میں سیّدِ والا دعا کریں
حضرت کے ساتھ سجدۂ آخر ادا کریں

سُن کر یہ بات بولے امام فلک وقار ۳۰ باندھو صفیں نماز گزاروں میں ہو شُمار
برپا ہو ذکرِ حق ، سرِ میدانِ کارزار خیرِ عمل ہے تم پہ رہے فضلِ کردگار
برحق ہے موت ، دل میں نہ خوفِ اجل رہے
آئینۂ زندگی کا ہمارا عمل رہے

پایا جو اِذنِ شاہ تو قائم ہوئی نماز ۳۱ مصروفِ ذکرِ حق ہوئے اصحابِ پاکباز
برسا رہے تھے تیر جو مولا پہ فتنہ ساز دو جانثار آ گئے پیشِ شہِ حجاز
دیوارِ آہنی تھے شریروں کے سامنے
سینہ سپر کیے تھے یہ تیروں کے سامنے

آیا جو تیر سینے پہ بڑھ کر اسے لیا ۳۲ کتنا خیال تھا انہیں شہ کی نماز کا
اُف تک نہ کی زبان سے اگر خون بہہ گیا پڑھتے رہے نماز ، شہنشاہِ دوسرا

آتا خلل نماز میں ، امرِ محال تھا
حلقے میں جانثاروں کے زہراؑ کا لال تھا

تیروں نے جانثاروں کے چھلنی بدن کیے ۳۳ لیکن لڑائے جان رہے ، حق کے واسطے
جس دم نمازِ ظہر ادا شاہ کر چکے زخمی بدن سعیدِ وفادار گر پڑے

خوں بہہ چکا تھا جسم کا تاب و تواں نہ تھا
روحِ سعیدؒ باقی تھی پیکر میں جان نہ تھی

لیکن بوقت عصر پڑھی شہ نے جب نماز ۳۴ مصروفِ ظلم و جور تھے مولا پہ فتنہ ساز
لرزی زمین نجف کی ، ہلا گنبدِ حجاز سجدے میں اس طرح سے جھکایا سرِ نیاز

بیکس کی ، کائنات جبیں چومنے لگی
مولا کو کربلا کی زمیں چومنے لگی

نوکِ سناں پہ سجدۂ آخر ہوا تمام ۳۵ باطل شکست کھا گیا ، حق کا رہا قیام
نورِ مبیں بنا ہوا ، اُبھرا سرِ امام تاریکیوں میں ڈوب گئے مُفسدانِ شام

صابر کا صبر ، عزم کی تاریخ رہ گئی
حق ہے حسینؑ ، وقت کی آواز کہہ گئی

بعدِ حسینؑ ظلم کا بازار گرم تھا ۳۶ خیموں میں شہ کے آگ لگاتے تھے اشقیا
آغوش میں پھوپھی کے تھا بیمارِ کربلا بچوں سے مائیں ، ماؤں سے بچے ہوئے جدا

ظلم و ستم سے آلِ محمد دہل گئے
جنگل کی سمت خوف سے بچے نکل گئے

جب لوٹ کر چلے گئے خیموں کو اہلِ شر ۳۷ زینبؑ نے ماہ پاروں کو ڈھونڈا اِدھر اُدھر
کلثومؑ سے یہ کہنے لگیں سوختہ جگر آتی نہیں یہاں پہ سکینہ کہیں نظر

معصوم کی تلاش میں مقتل میں جائیں ہم
آتی ہے رات آؤ اسے ڈھونڈ لائیں ہم

معصوم کی تلاش میں سیدانیاں چلیں ۳۸ مقتل میں بار بار اِدھر سے اُدھر گئیں
اس طرح دور دور تلک ڈھونڈتی رہیں لیکن نہ دیر تک ملا اس کا پتہ کہیں

تھک کے چور ہو گئیں بے آس ہو گئیں
بچی نہ مل سکی تو تصور میں کھو گئیں

اتنے میں آئی کان میں آواز دکھ بھری ۳۹ بابا ہماری مسندِ خیمہ بھی جل چکی
بابا پھوپھی کے سر سے بھی چادر اتر چکی بابا تمہارے پاس ہی سوئے گی لاڈلی

عادی نہیں ہوں میں کسی سینے پہ سو رہوں
بابا کہو تو میں اسی سینے پہ سو رہوں

میں تھک گئی ہوں گود میں اپنی لٹائیے ۴۰ سینے سے لپنے بیٹی کو اپنی لگائیے

جاؤں کہاں میں ، شام ہے مجھ کو بتائیے روئی بہت ہوں اور نہ مجھ ائیے

شمرِ لعین نے منھ پہ طمانچے لگائے ہیں

روتے ہوئے وہاں سے یہاں تک ہم آئے ہیں

سُن کر یہ بَین ، بیبیاں بے تاب ہو گئیں ۴۱ آواز جس طرف تھی اُسی سمت کو چلیں

پہونچیں تو رو رہی تھی سکینہ دل حزیں کہنے لگیں کہ بی بی ابھی تک کہاں رہیں

مقتل کے گوشے گوشے میں ہم گھومتے رہے

جنگل میں چار سمت تمہیں ڈھونڈھتے رہے

سن کر یہ بات ، بی بی سکینہ نے یہ کہا ۴۲ جس دم ہمارے خیموں میں در آئے اشقیا

بُندے ہمارے چھین لئے گھر جلا دیا کانوں سے میرے خون بڑی دیر تک بہا

بے چین اس طرح سے ہوئی میں نہ کَل پڑی

بابا جدھر گئے تھے اُسی سمت چل پڑی

رو کر پکارتی تھی کہ بابا کہاں ہو تم ۴۳ مجھ کو بھی لپنے پاس بلا لو جہاں ہو تم

بابا پکارو مجھ کو ، امامِ زماں ہو تم وہ کون سی جگہ ہے جہاں پر نہاں ہو تم

آواز آئی آؤ سکینہ یہاں ہیں ہم

تم کو بلائے لیتے ہیں بیٹی جہاں ہیں ہم

آواز مجھ کو پیار سے بابا نے دی پھوپھی ۴۴ آواز وہ پھوپھی اسی لاشے سے آئی تھی

پہونچی قریب میں تو یہ میت تڑپ اٹھی سر پر پھرایا ہاتھ تو لپٹا لیا کبھی

بابا کا میرے یہ جسدِ پاش پاش ہے

میری پھوپھی یہی مرے بابا کی لاش ہے

سُن کر یہ بات زینبؑ و کلثومؑ رو پڑیں ۴۵ بھائی کی لاش دیکھ کے بہنیں تڑپ اٹھیں

بھر آئے دل کچھ ایسے کہ کچھ بھی نہ کر سکیں لاشے سے لپٹی روتی بڑی دیر تک رہیں

تھا سخت وقت زینبؑ و کلثومؑ کے لئے

کچھ کر سکیں نہ سیّدِ مظلوم کیلئے

آواز آئی لاش سے اے بیبیو ! اُٹھو ۴۶ غربت کی رات آتی ہے اے غمزدو ! اُٹھو

جاؤ سدھار خیموں کو اے بیکسو ، اُٹھو بیمار منتظر ہے تمہارا اُٹھو ! اُٹھو !

بیٹی سکینہ ، زینبؑ و کلثومؑ السّلام

اے سوگوار ، غمزدو ، مظلوم السّلام

آغا بیان ختم کرو اس دعا کے ساتھ ۴۷ صدقے میں ان کے جو تھے شہِ کربلا کے ساتھ

اپنا شمار بھی رہے ، اہلِ ولا کے ساتھ وابستہ تا ابد رہیں شہ کی عزا کے ساتھ

ماتم کریں حسینؑ کا جب تک کہ غم رہے

عباسِؑ نامدار کا سر پر علم رہے

مرثیہ نمبر۱۴

ایماں کی ضیا مطلعِ انوارِ سخن ہے

ایماں کی ضیا مطلعِ انوارِ سخن ہے ۱ مولا کی وِلا ، رونقِ دربارِ سخن ہے
افکار کی ضَو ، گرمیٔ بازارِ سخن ہے پھر آج قلم قافلہ سالارِ سخن ہے
ہیں حُسنِ بیاں خالقِ افلاک کی باتیں
ہوتی ہیں یہاں پنجتنِؑ پاک کی باتیں

مجلس کی فضا کرتی ہے اس بات کا اثبات ۲ پاکیزگیٔ فکر سے روشن ہیں خیالات
قائم ہیں ابھی مرثیہ گوئی کی روایات ہوتی نہیں کم خالقِ اکبر کی عنایات
تاثیرِ سخن ، زورِ قلم ، دُرِّ نجف دے
چاہے وہ جسے مرثیہ گوئی کا شرف دے

ناچیز نے پایا یہ شرف اس کے کرم سے ۳ گلدستۂ افکار ملا ، باغِ ارم سے
نایاب مضامین بندھے نوکِ قلم سے چمکے ہیں عقیدت کے گہر دیدۂ نم سے
گلزارِ سخن ذکرِ محمدؐ سے کھلا ہے
ایمان مرا ، آلِ محمدؐ کی وِلا ہے

خالق کی ثناء نقطۂ آغازِ بیاں ہے ۴ ہے عقل پریشان کہ وہ ذات کہاں ہے
موجود تو ہر جا ہے یہ آنکھوں سے نہاں ہے سنتے ہیں بس اتنا کہ قریبِ رگِ جاں ہے

مجبور ہیں ہم ، اس پہ نظر کر نہیں سکتے
احساس ہے ، محسوس مگر نہیں کر سکتے

پابندِ عناصر ہے ہر اک وصفِ جبلّی ۵ محدود ہے پرواز بہت عقلِ رسا کی
مجبور ہے اک حد سے پرے جا نہیں سکتی انکھوں میں کہاں قوتِ دیدارِ الہیٰ

سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے کبھی ربِّ عُلا کو
کہتے ہیں جو دیکھیں گے قیامت میں خدا کو

موسیٰ کا تقاضا تھا کہ دیکھیں گے سرِ طور ۶ فرمان تھا اللہ کا انسان ہے مجبور
خاطی تھا کہاں لے گئی کج فہمئ منصُور پہونچا جو سرِ دار ، اَنا ہو گئی کافور

معلوم کسی کو نہیں اللہ کدھر ہے
مشرک ہے اشارے سے جو بتلائے ادھر ہے

ہے غیب پہ ایماں کا وسیلہ شہِ ابرار ۷ قرآن و احادیث ہیں کیا ؟ آپ کی گفتار
سرکار کی باتوں میں کہاں دین سے انکار اقرار ہی اقرار ہے اقرار ہی اقرار

ابلیس یہاں فتنۂ شر ہو نہیں سکتا !
سرکار کے کردار پہ شک ہو نہیں سکتا

اللہ پہ بھی ایمان ، عدالت پہ بھی ایمان ۸ قرآن پہ ایمان ، نبوّت پہ بھی ایمان
پیغام پہ ایمان ، امامت پہ بھی ایمان شارح پہ بھی ایمان ، قیامت پہ بھی ایمان

منجانبِ اللہ ہے جو بات کہی ہے
ایماں کی قسم ، اپنا تو ایمان یہی ہے

پھر مدحتِ ممدوحِ خدا حُسنِ قلم ہے ۹ ہونٹوں پہ مرے ذکرِ شہنشاہِ اُمم ہے
مجلس کی فضا رشکِ گلستانِ اِرم ہے جو کچھ کہوں توصیفِ محمدؐ میں وہ کم ہے

قرآن میں ہیں احمدِ مختار کی باتیں
یٰسین کی تفسیر ہیں سرکار کی باتیں

سرشار ہے دل ذکرِ شہنشاہِ زمن میں ۱۰ روشن ہوا ایماں کا کنول بزمِ سخن میں
ہر سمت کھلے پھول عقیدت کے چمن میں کاوش کا لہو ڈھل گیا شہ پارۂ فن میں

الفاظ کے پیکر میں مفکّر کا عمل ہے
جو بند ہے تخلیق کا وہ تاج محل ہے

ذکرِ شہِ کونین ہے ایماں کی حرارت ۱۱ ذکرِ شہِ کونین ہے تقریر کی لذّت
ذکرِ شہِ کونین ہے خالق کی مشیّت ذکرِ شہِ کونین ہے بنیادِ عبادت

اللہ کی تخلیق کا یہ پہلا ورق ہے
یہ خالقِ احسن کی محبّت کا سبق ہے

ذکرِ شہِ کونین ہے اقرارِ رسالت ۱۲ ذکرِ شہِ کونین ہے مومن کی علامت
ذکرِ شہِ کونین ہے اللہ کی رحمت ذکرِ شہ کونین ہے کونین کی دولت
سرمایۂ دیں روشنیٔ قلب و نظر ہے
اس ذکر سے انساں کی دُعاؤں میں اثر ہے

ہے حق کے اصولوں کی بقا ذکرِ محمدؐ ۱۳ آفاق کی قندیلِ ضیا ذکرِ محمدؐ
آئینۂ ایماں کی جِلا ذکرِ محمدؐ ایمان کی قسم ذکرِ خُدا ذکرِ محمدؐ
نبیوں کے نبی بندۂ معبود محمدؐ
مسجودِ ملک ، حامد و محمود محمدؐ

اک سلسلۂ نورِ یقیں ذکرِ محمدؐ ۱۴ ایمان و صداقت کا امیں ذکرِ محمدؐ
اخلاق کی تسبیحِ حسین ذکرِ محمدؐ ہے تذکرۂ عظمتِ دیں ذکرِ محمدؐ
انوار کی بارش کا سبب حُسنِ بیاں ہے
ذکرِ شہِ لولاک سے معمور جہاں ہے

ہیں سلسلۂ خیر کے سردار محمدؐ ۱۵ ہیں حُسنِ ازل ، احمدِ مختار محمدؐ
ہیں نورِ مُبیں ، مطلعِ انوار محمدؐ اللہ کی تخلیق کا شہ کار محمدؐ
یٰسین یہی ، احسنِ تقویم یہی ہیں
ہے جس کے لئے سجدۂ تعظیم یہی ہیں

جو کچھ انہیں منظور، خدا کو وہی منظور ۱۶ جو کچھ یہ کہیں بات، وہی دین کا دستور
جو ان کا فدائی ہے، وہی غالب و منصور جو گود میں پروان چڑھا، نور علیؑ نور

اقلیمِ ولایت کے شہنشاہ و ولی ہیں
سرکار کی آغوش کے پروان علیؑ ہیں

ہے ذکرِ علیؑ حکمِ شہنشاہِ رسالتؐ ۱۷ دو اپنی مجالس کو اسی ذکر سے زینت
اقرارِ امامت سے ہے، اظہارِ مودت مقصودِ امامت ہے شریعت کی حفاظت

شارح ہیں، شریعت کے نگہبان یہی ہیں
شاہد ہے خدا، بولتا قرآن یہی ہیں

اس نام سے وابستہ ہیں اسلام کی اقدار ۱۸ ہے نامِ علیؑ نعرۂ حق، دین کی تلوار
خیبر کا ہو میدان کہ ہجرت کی شبِ تار اس نام سے سر ہو گئی ہر منزلِ دشوار

باطل کے پرخچے اُڑے، صمصامِ علیؑ سے
پھر پھر گئے طوفانوں کے منہ نامِ علیؑ سے

یہ نام ہے تاریخ میں اسلام کی شوکت ۱۹ یہ نام ہے وابستۂ اعلانِ نبوّت
یہ نام ہے غزوات میں ایمان کی قوّت یہ نام ہے سرنامۂ پیغامِ مودّت

بعد اپنے امامت کا جو اعلان کیا تھا!
سرکار دو عالم نے یہی نام لیا تھا

اس نام سے معمور ہے اسلام کا گلشن ۲۰ اس نام سے بھرپور ہے ایمان کا دامن
اس نام سے پرنور ہوئی وادیٔ یمن !! اس نام سے قندیلِ سیادت ہوئی روشن

اسلام کی ترویج ہوئی حق کے ولی سے
مجلس کی فضا گونج اُٹھے نامِ علیؑ سے

یا کُل کے مدد گار ، علیؑ حیدرِ کرّار ۲۱ یا قاتلِ کفّار علیؑ حیدرِ کرّار
یا دین کی تلوار علیؑ حیدر کرّار یا سیّد و سردار علیؑ حیدرِ کرّار

کفّار کے منہ بند ہیں کچھ کہہ نہیں سکتے
مولائی تو بے نامِ علیؑ رہ نہیں سکتے

میداں میں علیؑ لشکرِ ایمان کے سالار ۲۲ کافر کے لئے گُرزِ گراں برقِ شرر بار
دشمن کیلئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار مومن کے لئے شمعِ حرم ، نُور کا مینار

بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی حق کے ولی کو
ہم قبر کی منزل میں پکاریں گے علیؑ کو

ہو رشک فرشتوں کو وہ انسان علیؑ ہیں ۲۳ اقلیمِ ولایت کے نگہبان علیؑ ہیں
سرکارِ محمدؐ کے دل و جان علیؑ ہیں شمشیرِ خدا ، قوّتِ ایمان علیؑ ہیں

وہ جس کے لئے ڈوبتا سورج پلٹ آئے
وہ نقطہ کہ جس نقطے میں قرآں سمٹ آئے

محرابِ عبادت میں علیؑ نور عبادت ۲۴ میدانِ شجاعت میں علیؑ دین کی طاقت !!
ایوانِ خلافت میں علیؑ حق کی عدالت اقلیمِ نبوّت میں علیؑ بابِ نبوّت

آگے جو بڑھوں حد سے تو یہ حدِّ ادب ہے
خوشنودیِ سرکار ہی خوشنودیٔ رب ہے

ہے ان کا محب مرتضیٰؑ مولا کا طلبگار ۲۵ انسان غنی ، متّقی و عابد و دیندار
مقدادؓ و ابوذرؓ ہوں کہ ہوں میثمؓ تمارؓ سلمانؓ ہوں قنبرؓ ہوں کہ ہوں حضرتِ عمارؓ

دامن کو بھرا فیضِ شہنشاہِ نجف سے
پہونچے ہیں کہاں ان کی غلامی کے شرف سے

تھے دور بہت دور وہ دنیا کے طلب سے ۲۶ اسلام کی اقدار ہیں سب ان کے سبب سے
ایمان سے وابستہ تھے بیگانہ تھے سب سے بس اپنی اقامت کے طلبگار تھے رب سے

ملتی تھی انہیں دولتِ دیں گھر سے علیؑ کے
تازیست یہ وابستہ رہے در سے علیؑ کے

شاہوں کے زر و مال کو دولت نہیں سمجھے ۲۷ دو روزہ حکومت کو حکومت نہیں سمجھے
بے دینوں کی باتوں کو حقیقت نہیں سمجھے دنیا کی مصیبت کو مصیبت نہیں سمجھے

تھے اہل ولا ، دب نہ سکے جاہ و حشم سے
ایمان کی جلا اور ہوئی جور و ستم سے

مینارۂ انوار میں اصحاب علیؑ کے ۲۸ اسلام کی قسمت کے چمکتے ہوئے تارے
ان سب کی حقیقت کوئی تاریخ سے پوچھے یہ بک نہ سکے درہم و دینار کے بدلے

دراصل مجاہد یہی ، دیندار یہی ہیں
اسلام کی تاریخ کے حقدار یہی ہیں

طوفانوں سے ٹکرائے مگر دین نہ چھوڑا ۲۹ مر مر گئے اسلام کا آئین نہ چھوڑا
قائم رہے عشقِ شہ صفین نہ چھوڑا سب چھوڑ دیا ، دامنِ یٰسین نہ چھوڑا

انگلی نہ اُٹھے دشمن اسلام کی ہم پر
گر آج مسلمان چلیں اُن کے قدم پر

انسان کی انا ہے اثرِ آتشِ سیال ۳۰ مقراضِ ہوس خوب کترتی ہے پر و بال
قارون بنا دیتا ہے انساں کو زر و مال کردار سے بڑھتا ہے مگر قوم کا اقبال

افسانۂ اخلاق کی تمہید یہی ہیں
ہر دور میں بس لائقِ تقلید یہی ہیں

تھی ان کی زبان روح عبادات کا پیغام ۳۱ اسلام کی اقدار و روایات کا پیغام
انصاف کا پیغام ، مساوات کا پیغام سرکارِ محمدؐ کی ہدایات کا پیغام

اسلام رہے ، عظمتِ قرآن نہ جائے
گو جان چلی جائے پہ ایمان نہ جائے

مولا کی غلامی سے ہوئے صاحبِ کردار ۳۲ وہ صاحبِ کردار کہ خائف تھے جہاندار
سینے سے لگائے ہوئے اسلام کی اقدار حق گوئی میں یکتائے جہاں حق کے طرفدار

گلدستۂ اسلام کے پھولوں کو نہ چھوڑا
سولی پہ چڑھے حق کے اصولوں کو نہ چھوڑا

تھے لوگ یہی دینِ محمدؐ کے بہی خواہ ۳۳ تبلیغ میں اسلام کی اقدار سے آگاہ
عظمت کا ستوں بن گئے جو بھی رہے ہمراہ الفت کے سبب ان کے غلاموں کو ملی راہ

عاشور کو جو حق کے لئے سینہ سپر تھے
ان لوگوں میں اک جونؔ، غلامِ ابوذرؓ تھے

تاریخ کا مینار ہے کردارِ ابوذرؓ ۳۴ کج رو کے لئے خار ہے رفتارِ ابوذرؓ
چلتی ہوئی تلوار ہے گفتارِ ابوذرؓ سرمایۂ افکار ہے افکارِ ابوذرؓ

دولت کے پرستاروں کو بازار میں ٹوکا
بوذرؓ نے شہنشاہوں کو دربار میں ٹوکا

قائم شرفِ عظمتِ انساں ہے اِنہیں سے ۳۵ اسلام کی تاریخ درخشاں ہے اِنہیں سے
آفاق میں ضو بارئ ایماں ہے اِنہیں سے آباد مؤدت کا گلستان ہے اِنہیں سے

اسلام کے ترویج میں سرگرم عمل تھے
دولت سے غنی، دین کے حامی ابوذرؓ تھے

ہیں مثلِ بلالِ حبشی جونِ وفادار ۳۶ بوذرؓ کی طرح آلِ محمدؐ کے پرستار
حق گوئی و بے باکی سے نکھرا ہوا کردار چہرے سے عیاں کعبۂ ایمان کے انوار
پروانۂ حق ، حلقہ بگوشِ شہِ دیں ہیں !!
سینے میں لئے روشنئ نورِ مُبیں ہیں

عاشورہ کا دن ، روزِ قیامت سے نہ کم تھا ۳۷ دیںداروں کے ہاتھوں میں شہادت کا علَم تھا
جینے کی نہ خواہش تھی نہ مرجانے کا غم تھا جو فرد تھا پروانۂ سردارِ اُمم تھا
تھا عزم یہی شمعِ امامت کو بچا لے
جس طرح ہو ایمان کی دولت کو بچا لے

تلوار چلی ، گرم ہوا موت کا بازار ۳۸ شبیرؑ پر جان دینے لگے حق کے پرستار
اس وقت گئے جونؔ بھی پیشِ شہِ ابرار کہنے لگے مولا سے کہ یا سیّد و سردار
میدانِ شہادت کی رضا دیجئے آقا
مرنے کا شرف مجھ کو عطا کیجئے آقا

سُن کر یہ سخن جون کے بولے شہِ ابرار ۳۹ ہوتی ہے بہت سخت غلامی کی شبِ تار
طے صبر سے کی تم نے جو یہ منزلِ دشوار میں نے کیا آزاد تمہیں جونِ وفادار
کچھ دن کے لئے سانس لو آزاد فضا میں
کیوں جان کو قربان کرو کرب و بلا میں

یہ فوج مخالف ہے مرے خون کی پیاسی ۴۰ پرواہ نہیں کچھ بھی انہیں اور کسی کی
اچھا ہے کہ بچ جائے اگر جان تمہاری جھیلے ہیں بہت آج تک آزارِ غلامی
مقتل سے نکلنے کے لئے مال و گہر لو
جو کچھ بھی تمہیں چاہیئے وہ زادِ سفر لو

سُن کر یہ سُخن جون کے بہنے لگے آنسو ۴۱ دل ٹوٹ گیا رکھ نہ سکا ذہن پہ قابو !!
کی عرض کہ اے شاہِ زمن سیّدِ خوشخو شاید کہ پسینے سے مرے آتی ہے بدبو
خوشبو ہے بہت آلِ محمدؐ کے لہو میں !
مل جائے لہو میرا نہ اکبرؑ کے لہو میں

مرنے کی تمنّا ہے ، رضا دیجئے مولا ۴۲ تقدیر میری آج بنا دیجیئے مولا
کوثر کا مجھے جام پلا دیجئے مولا خدمت کا مری مجھ کو صِلا دیجیئے مولا
صدقے مجھے گردانئے بوذرؓ کی طرف سے
محروم نہ رہ جاؤں شہادت کے شرَف سے

رخصت ہو عطا ، احمدِ مختار کا صدقہ ۴۳ رخصت ہو عطا ، حیدرِ کرّار کا صدقہ
رخصت ہو عطا ، عابدِ بیمار کا صدقہ رخصت ہو عطا ، اپنے علمدار کا صدقہ
جو کچھ بھی سزا دینا ہو اب دیجئے مولا
میں پاؤں پکڑتا ہوں کرم کیجئے مولا

تھی شوق شہادت سے بھری جونؑ کی تقریر ۴۴ سینے سے لگا کر اسے کہنے لگے شبیرؑ
دیتا ہوں رضا جنگ کی کیوں ہوتے ہو دلگیر روشن ہے شہادت سے تمہارا خطِ تقدیر
جاں دینا عبادت جو ہے خوشنودیٔ رب میں
مرنا بھی تو جینا ہے شہادت کی طلب میں

مولا سے جو اس طرح ملی رن کی اجازت ۴۵ تقدیر پکاری کہ بنی جونؑ کی قسمت
کردار ہی دراصل ہے انسان کی عظمت مقتل کی طرف لے کے بڑھا شوقِ شہادت
مرنے کے لئے شوق سے سینہ سپر آیا
تلوار لئے فوج مخالف میں در آیا

سر اپنا ہتھیلی پہ لئے پھرتا تھا دیندار ۴۶ حملہ جو کیا گرم ہوا موت کا بازار
کافر کے لئے برق بنی جونؑ کی تلوار تنہا تھا مگر خوب لڑا جونِ وفادار
پھر رن میں شہادت کا شرف جونؑ نے پایا
تقدیر بنی ذرِ نجف جونؑ نے پایا

جب جونؑ کو گرتے ہوئے شبیرؑ نے دیکھا ۴۷ خود آپ گئے لاش پہ اس کی شہ والا
فرمایا کہ اللہ نے رتبہ تجھے بخشا پھر چلتی ہوئی ریت سے لاشے کو اٹھایا
پھولوں کی طرح لاش اُٹھی جونِ جری کی
کیا ذرہ نوازی تھی حسینؑ ابنِ علیؑ کی

افسوس مگر اٹھ نہ سکا لاشہ شبیرؑ ۴۸ کچھ سرخ لکیریں بنیں و العصر کی تفسیر
تھی خاک میں ڈوبی ہوئی اسلام کی تصویر روتی تھی کہیں دور کھڑی بھائی کی ہمشیر

سر چوب کے خیمے سے جو ٹکراتی تھی زینبؑ
بھائی کی محبت میں مری جاتی تھی زینبؑ

لاشہ نہ اُٹھا اس کا جو انسانِ غنی تھا ۴۹ لاشہ نہ اُٹھا اس کا جو ایمان جلی تھا
لاشہ نہ اُٹھا اس کا جو فرزندِ علیؑ تھا لاشہ نہ اُٹھا اس کا دلبندِ نبیؐ تھا

مقتل میں کہیں لاش نہ ہمشیر نے دیکھی
گھوڑوں کی چمک زینبؑ دلگیر نے دیکھی

مٹی میں ملا ، لختِ دلِ فاطمہ زہرا ۵۰ مقتل میں کہیں پا نہ سکی بھائی کا لاشہ
ہے کون جو دے زینبِ دلگیر کو پُرسا کوئی نہیں بے ہوش ہے بیمار بھتیجا

پھٹتا ہے جگر آ کے کلیجے سے لگا لے
اس وقت کوئی زینبِ بیکس کو سنبھالے

ہے لُوٹ مچی ، بے سر و سامان ہیں زینبؑ ۵۱ گھر لُٹتا ہے بھائی کا پریشان ہیں زینبؑ
سہمے ہوئے بچوں کی نگہبان ہیں زینبؑ خیموں کے اُجڑ جانے سے حیران ہیں زینبؑ

کیا وقت ہے کس جا پہ اماں بیبیاں پائیں
ہے آگ لگی خیموں میں بچے کہاں جائیں

اے فکر رسا تھم، کہ نہیں ضبط کا یارا !! ۵۲ بگڑی ہوئی تقدیر کو اشکوں نے سنوارا
چمکا سرِ مجلس مری قسمت کا ستارا آغا کو فقط جوشِ مودت نے اُبھارا

عقبیٰ پہ نچھاور کیا دنیا کی طلب کو
مجلس ہوئی مقبول دعا دیتا ہوں سب کو

○

غمِ حسینؑ ہے سرمایۂ حیات مرا
امام وقت ہے مولائے کائنات مرا
عروج فن کا ہے دنیا میں شاعری میری
سرا کلام ہے پروانۂ نجات مرا

مرثیہ نمبر ۱۵

بزمِ جہاں میں آج عجب خلفشار ہے

بزمِ جہاں میں آج عجب خلفشار ہے ۱ ہر فرد پر جنونِ قیادت سوار ہے
بادِ خزاں سے دامنِ گل تار تار ہے پابندیٔ اصول مگر ناگوار ہے
عالم میں خود نمائی ہر اک سر کا تاج ہے
بوجہل حکمران ہے ، جہالت کا راج ہے

زیرِ انا ہے آج بھی انسان کا شعور ۲ قابض ہے قصرِ فکر پہ ابلیسِ پُر فتور
بادِ فساد چلتی ہے عالم میں دُور دُور انسان سجدہ ریز ہے انسان کے حضور
ہے زیب تن لباس ترقی پذیر کا
حالات نے بدل دیا لہجہ فقیر کا

شہرت کی آرزو ، کبھی دولت جستجو ۳ کاسہ گدائی کا لیے پھرتا ہے کُو بکُو
ہر اک سے کر رہے ہیں لجاجت سے گفتگو سیلابِ آرزو میں ہوئی غرقِ آبرو
بنیادِ قصرِ زیست جو غیروں کا مال ہے
پھیلا ہر اک کے سامنے دستِ سوال ہے

دولت کے ہیر پھیر سے خیرہ ہوئی نگاہ ۴ زعمِ اَنا نے کر دیا انسان کو تباہ
پھیلی ہے دشت و بحر میں ابلیس کی سپاہ انصاف کا کوئی نہیں دنیا میں خیر خواہ

لاشیں پڑی ہیں خنجرِ قاتل کے سامنے
انسان سر جھکائے ہے باطل کے سامنے

غارتگروں کے ہاتھ میں ہے عالمی ضمیر ۵ ایک دوسرے کو کرتا ہے انسان خود حقیر
خنجر بکف ہے کوئی، کوئی ظلم کا اسیر دل کو ہلائے دیتی ہے آوازِ دارو گیر

دامن ہے تار تار جہاں کے نظام کا
زندان میں بے کفن ہے جنازہ عوام کا

آفاق پر محیط رعونت کا ہے غبار ۶ کِذب و رِیا کی زد پہ ہے یعقوبِ انکسار
زندانِ خود نمائی میں ہے یوسفِ بہار بیمار لے چلے ہیں مسیحا کو سوئے دار

ہے حورِ زیست بال پریشاں کئے ہوئے
ماں پھر رہی ہے گود میں لاشہ لئے ہوئے

اس کشمکش کی آگ میں جلتی ہے زندگی ۷ کھوئی ہوئی فضا میں اُبلتی زندگی
دل پھٹ چکا ہے خون اُگلتی ہے زندگی دیکھیں کہاں پہ جا کے سنبھلتی ہے زندگی

انسان کا شکار جو انسان ہو گیا
عالم میں نظم و ضبط کا فقدان ہو گیا

نوعِ بشر کی آنکھ میں شرم و حیا نہیں ۸ عیش و طرب کی بزم میں، کیا کیا روا نہیں
اس کی یزیدیت کی کوئی انتہا نہیں بندوں کا خوف دل میں ہے خوف خدا نہیں

بیگانہ ہو چکا ہے یہ یومِ حساب سے
لیتا نہیں ہے درس خدا کی کتاب سے

یہ خلفشارِ دہر، بغاوت خدا سے ہے ۹ یہ طور یہ طریق، جہالت خدا سے ہے
ابلیسیت شعارِ رعونت خدا سے ہے انسان کا محاذِ عداوت خدا سے ہے

تاریکیوں میں راہ ہدایت سے دور ہے
انسان بولہب ہے، بڑا پُر غرور ہے

اُلجھا ہوا ہے اپنے مسائل میں صبح و شام ۱۰ اس کے لئے فضول ہے، اللہ کا پیام
باطل پرست ہے، ہوس و حرص کا غلام سمجھا نہیں ہے عظمتِ معبود کا مقام

انسان کارِ خیر پہ مائل نہیں رہا
ہے انتہا، خدا کا بھی قائل نہیں رہا

سر پر سجا ہوا جو رعونت کا تاج ہے ۱۱ بدخُو ہے، بدسرشت ہے، اور بدمزاج ہے
پیشِ نگاہ نوعِ بشر سے خراج ہے اس ابتری کا دین ہی واحد علاج ہے

نُور مبیں کے ساتھ میں قرآن چاہیئے
تاریکیوں میں قوّتِ ایمان چاہیئے

ایمان کیا ہے ، قوّتِ باطل سے انحراف ۱۲ حق سے لگاؤ ، سلسلۂ خیر کا طواف
سرکارِ دو جہاں کی نبوّت کا اعتراف ابلیس کے قیاس کے فتنے سے اختلاف

انسان نورِ حق سے منوّر جبیں کرے
جو کہہ دیا حضور نے اُس پر یقیں کرے

حُسنِ صریرِ خامہ ہوا ذکرِ مصطفیٰ ۱۳ صلی علیٰ کا چار طرف غلغلہ اُٹھا
مجلس میں نور پھیلا معطر ہوئی فضا رضواں نے بڑھ کر کھول دیا در بہشت کا

نورِ مُبیں کے صدقے میں زور قلم بڑھا
کھا کر ہوا بہشت کی پھر تازہ دم بڑھا

خوشنودیِ خدا جو ہے ذکرِ شہہ اَنام ۱۴ لوحِ جہاں میں اور قلم کا بڑھا مقام
توصیفِ مصطفیٰ سے ملی شہرتِ دوام زندہ رہے گا تابہ ابد اس کا نیک نام

گلدستۂ خراجِ محبت لئے ہوئے
آتی ہے کائنات عقیدت لئے ہوئے

صبحِ ازل کے نور سے روشن ہوا کلام ۱۵ بڑھ کر شفق نے پیش کیا سُرخ سُرخ جام
خورشید نے پلٹ کے ادب سے کیا سلام دو ٹکڑے ہو کے قدموں پہ آیا مہِ تمام

باتوں میں ذکرِ خیر کی خوشبو جو پا گئی
دلہن بنی ہوئی شبِ معراج آ گئی

تارا فلک سے آیا کہ میں بھی گواہ ہوں ۱۶ اک ذرۂ حقیر کفِ پائے شاہ ہوں
ناچیز اک گدائے شہ عرش جاہ ہوں پروردۂ جنابِ رسالت پناہ ہوں
مجلس میں میرا ذکر بھی ہونا ضرور ہے
ذرّہ بھی جزوِ روشنیِ کوہِ طور ہے

یثرب کے سنگ ریزے بھی کہنے لگے تمام ۱۷ چُومے ہیں ہم نے دستِ رسولِؐ فلک مقام
اکثر ہوئے ہیں شاہ ہدیٰ ہم سے ہم کلام اُن کا جو ذکر ہے تو ہمارا بھی آئے نام
صدقے میں اُن کے رونقِ بزمِ حیات ہیں
ہم بھی شریکِ مدحِ شہِ کائنات ہیں

نظروں میں ہے ہمارے بھی سرکار کا جمال ۱۸ بولے ملائکہ کہ ہمارا رہے خیال
ان کے قدم کی خاک ہے جبریل کا کمال معلوم ہے ہوا شب اسریٰ جو انکا حال
حکمِ خدا تھا نورِ مجسّم کے واسطے
ہم بھی جھکے تھے سجدۂ آدم کے واسطے

کیسا وقار مدحتِ شاہِ اُمم میں ہے ۱۹ ان سب کی بات، حُسنِ صریرِ قلم میں ہے
صلے علیٰ کی دھوم جو باغِ ارم میں ہے مشغول کائنات طوافِ حرم میں ہے
پھیلی جہاں میں روشنیٔ کوہِ طُور ہے
دیکھو جدھر بھی عرش سے تا فرش نُور ہے

منجانبِ خدا جو نہ توفیق ہو عطا ۲۰ کس کی مجال ہے نہ کرے ذکر مصطفیٰ
پڑھتا ہے نام لینے سے خود اپنا مرتبہ بن جاتا ہے یہ ایک وسیلہ نجات کا
اس ذکر پاک کو کوئی کیا بیش و کم کرے
توصیف جس کی خالقِ لوح و قلم کرے

لیکن بشر پہ فرض ہے ذکرِ شہِ انام ۲۱ نعمات جن پہ ختم ہوئیں ، دیں ہوا تمام
وجہِ فلاحِ دہر ہے سرکار کا پیام نوعِ بشر کو چاہیئے اللہ کا نظام
یکساں نگاہ عدل میں پست و بلند ہے
اسلام دینِ حق ہے ، خدا کو پسند ہے

جاری ہوا جو تذکرۂ ختمِ مُرسلینؐ ۲۲ نوکِ قلم سے پھوٹ پڑا زمزمِ یقیں
صد رشکِ کہکشاں ہوئی تخیُّل کی جبیں گلزارِ فکر بن گئی اشعار کی زمیں
مخفی تھے قلب میں جو خزانے نکل پڑے
نقطوں میں حُسنِ ذکر کے موتی اُبل پڑے

ہے رونقِ بہارِ سخن ، ذکرِ مصطفیٰ ۲۳ پھیلی ہے بوئے عشقِ محمدؐ جگہ جگہ
حد سے سوا ہے رتبۂ محبوبِ کبریا اِن کا پسینہ موجبِ تخلیق انبیاء
وابستہ ہو گیا جو محمدؐ کی ذات سے
وہ متصف ہوا ہے خدا کی صفات سے

اوّل ہے ایسے ناموں میں مولا علیؑ کا نام ۲۴ بچپن سے ساتھ جو رہے آقا کے صبح و شام
میدانِ کار زار ہو یا صلح کا مقام آخر نبیؐ کے ساتھ رہا اوّلِ امام

سورج کے بعد چاند ہے ، بعد نبی علیؑ
پڑھ کر درودِ پاک ، پکارو علیؑ علیؑ

قرآں علیؑ ، مفسّرِ قرآن بھی علیؑ ۲۵ حق ہے ، دیارِ حق کا نگہبان بھی علیؑ
تفسیر بھی کتاب کی ، عنوان بھی علیؑ بالیدگیٔ روح کا سامان بھی علیؑ

مومن کی مشکلات کا حل یا علیؑ مدد
کہتا ہوں میں یہ بانگ دہل یا علیؑ مدد

مولا علیؑ کے نام سے دل کی کلی کھلی ۲۶ حلاّلِ مشکلات ہے ، اللہ کا ولی
مولائیوں کی روح جو الفاظ میں ڈھلی گونجیں صدائیں چاروں طرف یا علیؑ علیؑ

نفسِ رسولؐ سیّد و سردار المدد
یا بو تراب ، حیدرِ کرّار المدد

وجہِ سکون قلب ہے مولا علیؑ کا نام ۲۷ بعد رسولؐ پاک ہیں جو خلق کے امام
ترویجِ حق میں رہتے تھے مشغول صبح و شام جاں سے سوا عزیز تھا ، اللہ کا پیام

پُر نور اپنے خون سے حق کا چمن کیا
بعد اپنے دینِ حق کو سپردِ حسنؑ کیا

صلح حسنؑ سے اور بڑھا دین کا وقار ۲۸ حق سے علیحدہ ہوا ، باطل کا اقتدار
بنیادِ امن پر ہوا اسلام اُستوار بادِ خزاں سے بچ گئی ایمان کی بہار
صلح حدیبیہ کی طرح اس میں راز تھا
یا اسوۂ رسولؐ ، خطِ امتیاز تھا

بعدِ حسنؑ حسینؑ تھے اسلام کے امیں ۲۹ قربانیوں سے جن کے بچے ہیں اصولِ دیں
حق کے لہو سے سرخ ہوا چہرۂ یقیں اُن کی مثال گنبدِ تاریخ میں نہیں
جس نے چراغ گل کیا باطل پرست کا
مفہوم ہی بدل دیا فتح و شکست کا

کوئی بنے حسینؑ یہ امرِ محال ہے ۳۰ قربان گھر کا گھر کرے خواب و خیال ہے
لاشیں اُٹھانا ، صبر دکھانا کمال ہے زہراؑ کا لال آپ ہی اپنی مثال ہے
حیدرؑ کی روح ، جانِ رسالت پناہ ہے
حق ہے حسینؑ ، عصر کا سورج گواہ ہے

لیکن اک اور بیاں سے لرزنے لگا قلم ۳۱ کس طرح ذکرِ سیّدِ سجاد ہو رقم
بارِ الم سے جس کی کمر ہو گئی تھی خم لیکن نہ سرنگوں کیا اسلام کا علم
سیدانیوں کی آس تھا حق کا امام تھا
بعد حسینؑ وہ شہ عالی مقام تھا

زینت ہیں دیں کی عابدِ بیمارِ کربلا ۳۲ سر کر گیا جو منزلِ دشوارِ کربلا
جس کے بدن پہ پھول تھے آزارِ کربلا سیدانیوں کا قافلہ سالارِ کربلا

گو دیکھنے میں مردِ ضعیف و نحیف تھا
لیکن اُٹھائے پرچم دینِ حنیف تھا

سر پر چراغ حق کو جلائے ہوئے چلا ۳۳ گردن میں بارِ طوق اٹھائے ہوئے چلا
سینے پہ سرخ داغ سجائے ہوئے چلا اپنا وجود صبر بنائے ہوئے چلا

ہاتھوں میں استقامتِ حق کے اصول تھے
پاؤں میں رز مگاہِ شجاعت کے پھول تھے

سیدانیوں کے ساتھ رہا سیّد العرب ۳۴ معصوم منسلک تھے امامت سے سب کے سب
دل میں تھا حق کا پاس، لبوں پر تھا شکرِ رب چلتا رہا وہ راہِ عبادت میں روز و شب

دشتِ بلا سے اور کبھی خارزار سے
لی دادِ صبر گردشِ لیل و نہار سے

اصلِ اصولِ دین محمدؐ پہ تھی نظر ۳۵ بیمار نے پلٹ کے نہ دیکھا اِدھر اُدھر
پھرتا رہا اعانتِ حق میں وہ در بدر کوفے سے شام، شام سے کوفے کیا سفر

دشوار رہ گذر پہ سنبھلنا کمال تھا
اہل حرم کے ساتھ میں چلنا کمال تھا

دربار میں یزید کے عبرت کا تھا مقام ۳۶ آلِ عبا کے حال پہ ششدر تھے خاص و عام
آتا تھا جو بھی منھ میں وہ کہتا تھا بدکلام خاموش سر جھکائے کھڑے تھے مگر امام

شعلہ فشاں تھا مخبرِ صادق کے واسطے
بکتا تھا جھوٹ مصحفِ ناطق کے واسطے

ناگاہ ایک شور سا دربار میں اُٹھا ۳۷ اٹھیں صدائیں خطبۂ ہاشم نہیں سنا
دیکھی یزید نے جو بگڑتی ہوئی فضا ۔ بولا امام پاک سے وہ بانیٔ جفا

کہنا ہے جو بھی آپ کو اِن کو سنائیں آپ
یہ منتظر ہیں آپ کے منبر پہ جائیں آپ

سُن کر یہ بات رونقِ منبر ہوئے امام ۳۸ پہونچے وہاں جو اصل میں تھا آپ کا مقام
خاموش اہل شام تھے ، حیران تھے خاص و عام پھر اس طرح سے ان سے مخاطب ہوئے امام

جو جانتا ہے مجھ کو وہ پھر جان لے مجھے
پہچانتا نہیں ہے جو پہچان لے مجھے

میں اس جہاں میں ہوں پسرِ مکّہ و منا ۳۹ میں اس جہاں میں ہوں پسرِ زَم زَم و صفا
میں اس جہاں میں ہوں پسرِ سیّد الوریٰ میں اس جہاں میں ہوں پسرِ شاہِ دوسرا

میں آیت خدا ہوں ، محمدؐ کی آل ہوں
جس کو نہیں زوال وہ بدرِ کمال ہوں

اس کا پسر ہوں میں، جسے پانی نہیں ملا ۴۰ جو دشت کربلا میں تہِ تیغ ہو گیا
گزرے ہیں جس کی لاش پہ گستاخ اشقیا جس بے کفن غریب پر ہر ظلم تھا روا
مٹی میں جس کا سرخ لہو جذب ہو گیا
آغوشِ کربلا میں جو بے گور سو گیا

کس جرم پر اسیر بنائے گئے ہیں ہم ۴۱ ہم نے کیا ہے کیا جو ستائے گئے ہیں ہم
کس جرم کس خطا پہ پھرائے گئے ہیں ہم کس واسطے یہاں پہ بلائے گئے ہیں ہم
آئینِ مصطفیٰ کی خلافت یہی ہے کیا
اے کلمہ گویو! اجرِ رسالت یہی ہے کیا

یہ سامنے رسن میں کھڑے ہیں جو دل ملول ۴۲ ہیں وہ کہ جن کے گھر ہوا قرآن کا نزول
مرجھا گیا ہے ظلم سے گلدستۂ بتول اہلِ حرم یہی ہیں یہی کنبۂ رسولؐ
تم سب کو کیا ہوا ہے کہ خوفِ خدا نہیں
وہ کون سا ستم ہے جو ہم پر روا نہیں

خطبہ تھا یہ کہ بحرِ صداقت تھا موجزن ۴۳ ڈوبا ہوا تھا درد میں مولا کا ہر سخن
احوالِ اہلِ بیت پہ روتے تھے مرد و زن اور خوف سے یزید کے چہرے پہ تھی شکن
تھی مصلحت نہ مہلتِ زورِ بیان دے
کہنے لگا یزید مؤذن اذان دے

خطبے کے درمیاں جو مؤذن نے دی اذان ۴۴ مولا ہوئے خموش تھما آپ کا بیاں
چھایا ہوا تھا چار طرف درد کا سماں روتا تھا کوئی اور کوئی لیتا تھا ہچکیاں
مشکل پڑی تھی آلِ علیؑ و بتولؑ پر
افسردہ سب تھے غربتِ آلِ رسولؐ پر

لازم تھا سب پہ نعرۂ تکبیر کا ادب ۴۵ سننے لگے کلامِ مؤذن کو سب کے سب
آیا اذاں میں سیّدِ والا کا ذکر جب دربار میں یزید سے بولے امام تب
بخشی ہے خدا نے حیات دوام ہے
سن لے یزید یہ مرے نانا کا نام ہے

سن کر کلام حق وہ تلاطم ہوا بپا ۴۶ جنبش ہوئی زمین فلک کانپنے لگا
بگڑی فضا کو دیکھ کر گھبرائے اشقیا دربار کو یزید نے برخاست کر دیا
منھ بند ہو کے رہ گیا اس بد کلام کا !!
زندہ یہ معجزہ تھا کلامِ امام کا !!

ہاں اے قلم خموش کہ سرکار ہیں خموش ۴۷ پاسِ ادب ہے، عابدِ بیمار ہیں خموش
فرطِ الم سے سب درو دیوار ہیں خموش مجلس ہوئی تمام عزادار ہیں خموش
آغاؔ غمِ امام سے روشن کلام ہو
مثلِ انیسؔ مرثیہ گوئی میں نام ہو

مرثیہ نمبر ۱۶

اوجِ فلک پہ آج قلم کی نگاہ ہے

اوجِ فلک پہ آج قلم کی نگاہ ہے ۱ فانوسِ اعتقاد کی ضُو خضرِ راہ ہے
توسنِ نظر میں سلطنتِ مہر و ماہ ہے عنواں بیاں کا قصرِ سپید و سیاہ ہے
پوشیدہ ہیں قلم میں جو جوہر کمال کے
آغوش شب سے لائے گا دن کو نکال کے

آفاق سے نکال کے لائے گا چار چاند ۲ رُخ پر عروسِ فن کے سجائے گا چار چاند
آئینۂ فلک کو دکھائے گا چار چاند اندازِ گفتگو میں لگائے گا چار چاند
روشن کرے گا یہ سخنِ تابدار کو
بخشے گا نور زلفِ شب مشکبار کو

فردوسِ گوش ہو گا شب و روز کا بیاں ۳ اُترے گی روشنائی میں تصویرِ کہکشاں
اُبھرے گا نقطے نقطے میں خورشیدِ زرفشاں زورِ قلم سے ہو گی یہ تحریر جاوداں
رُخ سے جو حورِ شب کے یہ پردہ اٹھائے گا
نقاشِ بے بدل نیا چہرہ دکھائے گا

نوک قلم پہ آتا ہے ذکرِ بہارِ شب ۴ قرطاس پر چمک اُٹھے نقش و نگارِ شب
آفاق پر محیط ہوا گلعذارِ شب عکسِ غلافِ کعبہ ہے حُسنِ دیارِ شب
پازیب جھماتی ہے زُہرہ کے پاؤں میں
آئی ہے شب دلہن بنی تاروں کی چھاؤں میں

اپنے عروجِ فن پہ ہے رقاصۂ فلک ۵ ہر ہر قدم پہ ملتی ہے فردوس کی جھلک
منظر وہ پرکشش ہے جھپکتی نہیں پلک جنّات ، محوِ دید ہیں حیران ہیں ملَک
موتی گندھے ہوئے جو ہیں زلفِ سیاہ ہیں
جچتا نہیں ہے کوئی فلک کی نگاہ میں

لیلائے وقت محملِ شام و سحر میں ہے ۶ اک کاروانِ نور بیاضِ نظر میں ہے
گردش جہاں کی گردشِ شمس و قمر میں ہے مریخ و مشتری و عطارد سفر میں ہے
پُر نور آسمان کا قصرِ عظیم ہے !!
جھرمٹ میں مہ وشوں کے ثریّا مقیم ہے

افشاں بھری ہے تاروں کے زلفِ سیاہ میں ۷ نورِ ازل کا سرمہ ہے اس کی نگاہ میں
جلوہ فگن ہیں کتنے حسیں اس کی راہ میں خوابوں کا ہے نزول اسی خواب گاہ میں
منبع بنی ہے حضرتِ یوسفؑ کے خواب کی
شاہد ہے یہ عروجِ رسالت مآب کی

قرآن میں ملا ہے اسے قدر کا مقام ۸ نازل ہوا ہے اس میں ہی اللہ کا پیام
آتے ہیں اس میں روح و ملائک پۓ سلام ہے ابتدا جو اس کی ئر ، انتہا ہے شام

قبلہ نما ہے صاحبِ ایمان کے لئے
یہ شبِ ، شب برات ہے انسان کے لئے

شب کے بغیر دن کا تصور محال ہے ۹ گردش سے اس کی سلسلۂ ماہ و سال ہے
بخشے نہ یہ سکون تو بچنا محال ہے بے خواب زندگی ہو تو جینا وبال ہے

وجہِ سکونِ قلب ہے بیمار کے لئے
کحل البصر ہے دیدۂ بیدار کے لئے

روشن دلوں کے واسطے روشن کتاب ہے ۱۰ ہجرت کی شب روائے رسالتماب ہے
حکم نبی سے سونا بھی اس میں ثواب ہے اس کے ثبوت میں عملِ بو تراب ہے

نفسِ نبی ، علیؑ ولی محوِ خواب تھے
حق ہے کہ جانشینِ رسالت مآب تھے

ہجرت سے کم نہیں شبِ عاشور کا بیاں ۱۱ حیرت سے دیکھتی تھی جسے چشمِ آسماں
یہ جانتی تھی مصلحتِ شاہِ انس و جاں مثلِ حجاب تھی حق و باطل کے درمیاں

مخصوص کیوں نہ ہو یہ زیارت کے واسطے
مانگیں جسے حسینؑ عبادت کے واسطے

روشن ہے آج بھی شب عاشورہ کا چراغ ۱۲ نور و کتاب و دین کے دستور کے چراغ
عظمت پہ جس کی رشک کرے طور کے چراغ محرابِ کائنات میں ہے نور کا چراغ

دامن میں اپنے دولتِ ایماں لئے ہوئے
آتی ہے ہر برس یہ چراغاں لئے ہوئے

اس شب کا سلسلہ بھی عجب یادگار تھا ۱۳ ہر فرد فوجِ شہ کا عبادت گزار تھا
پروانۂ حسینؑ ہر اک جان نثار تھا روشن ضمیر عابدِ شب زندہ دار تھا

دنیا میں آخری جو عبادت کی رات تھی
مسرور اہل حق تھے شہادت کی رات تھی

اس شب کو حکمِ شہ سے بجھائے گئے چراغ ۱۴ آزادیٔ عمل کو بڑھائے گئے چراغ
کچھ دیر بعد پھر جو جلائے گئے چراغ روشن دلوں میں اور بھی پائے گئے چراغ

نصرت میں شاہ دیں کے تھیں جانیں لڑی ہوئی
شاہد تھیں ان کی ٹوٹی میانیں پڑی ہوئی

اس شب کو اہلِ حق کا عمل بے مثال تھا ۱۵ پیغامِ مصطفیٰ کی بقا کا خیال تھا
پیشِ نظر جو نصرتِ حق کا سوال تھا چہرہ ہر اک کا شوقِ شہادت سے لال تھا

کھائی وفائے حق کی قسم اہلِ خیر نے
کی پانی کی سبیل جناب بریرؓ نے

کیا تابناک تھا شبِ عاشور کا ورق ۱۶ دیتی تھیں مائیں گود کے پالوں کو یہ سبق
شہ پر نثار ہو تو ادا ہو ہمارا حق مشکل میں ہیں امام کلیجہ ہے غم سے شق
شہ پر نثار ہونے کی تم آرزو کرو
کل صبح جاں دے کے ہمیں سرخ رُو کرو

زینبؑ نے کی یہ عون و محمدؑ سے گفتگو ۱۷ حیدرؑ کی جان حضرتِ جعفرؑ کی آبرو
اے میرے لاڈلو ہے یہی میری آرزو قدموں میں شاہِ دیں کے تمہارا بہے لہو
شیروں کی طرح جان لڑانا لڑائی میں!
لیکن سوئے فرات نہ جانا لڑائی میں!

سوتا تھا ایک خیمے میں ہمشکلِ مصطفےٰ ۱۸ جس کی بلائیں لیتی تھی لیلیٰ کی مامتا
نظریں جمی تھیں بیٹے پہ اور لب پہ تھی دعا فدیہ قبول کر مرا ، اے میرے کبریا
مقبول بات میری بحق رسولؐ کر
اٹھارہ سال کا مرا اکبرؑ قبول کر

آغوش میں لئے علیؑ اصغر کو تھیں ربابؑ ۱۹ ہاتھوں پہ نورِ عین تھا اور دل میں اضطراب
کہتی تھیں چوم چوم کے بیٹے کو وہ جناب کل تو بھی کامیاب ہو اور میں بھی کامیاب
نازک گلے پر بارِ شہادت اٹھائے گا
مقتل میں تو امام کے ہاتھوں پہ جائیگا

آزاد حُر کو یہ شبِ عاشور کر گئی ۲۰ قلب و نظر کو نورِ حقیقت سے بھر گئی
تو بہ خلوصِ دل سے جو کی، خوئے شر گئی مہلت ملی جو رات کی عقبیٰ سنور گئی
پنہاں سوادِ قلب میں بدرِ مُنیر تھا
ثابت کیا یہ شب نے کہ روشن ضمیر تھا!

اس شب کے فیصلے بڑے تاریخ ساز تھے ۲۱ باطل میں اور حق میں خطِ امتیاز تھے
آمادۂ فساد جو فتنہ طراز تھے انصارِ شاہ، زینتِ جائے نماز تھے
تیار ظلم و جور پہ فوجِ یزید تھی
اور مخلصین خوش تھے کہ مرنے کی عید تھی

لکھتا رہا دبیرِ فلک داستانِ شب ۲۲ عینی گواہ بن گئے سیارگانِ شب
آئی سحر تو چھپ گئے سب رازِ داں شب اس طرح اختتام کو پہونچا بیانِ شب
رنگت اُڑی ہے چاند کے چہرے پہ داغ ہے
اُبھری ہے صبح بجھنے کو شب کا چراغ ہے

اُبھرا دیارِ شرق سے خورشیدِ زرد رو ۲۳ پھیلا جہاں میں فتنۂ ابلیسِ کینہ جو
کچھ اور رُو سیاہ ہوا لشکرِ عدو انسانیت کو کھا گئی بدباطنوں کو خُو
باندھی کمر جفا پہ ہر اک رو سیاہ نے
تیغ و سپر اُٹھائے یزیدی سپاہ نے

دجلہ بنی لہو کی جو عاشور کی سحر ۲۴ چشمِ فلک سے خون ٹپکتا تھا خاک پر
آمادہ ظلم و جور پہ تھے بانیانِ شر پیشانیٔ بشر تھی ندامت سے تر بہ تر

خوش اپنی تیرہ بختی پہ فوجِ یزید تھی
گویا یہ صبح اُن کے لئے صبحِ عید تھی

بدبخت خوش تھے اس پہ کہ عزّت ملے گی آج ۲۵ کاٹیں گے سر حسینؑ کا عظمت ملیگی آج
لوٹیں گے اہلبیت کو دولت ملے گی آج عہدے بڑھیں گے رَے کی حکومت ملے گی آج

کہتے تھے بہر ور نہیں کچھ خیر و شر سے ہم
دنیا کو چھوڑتے نہیں عقبیٰ کے ڈر سے ہم

بدر و اُحد کا لیں گے محمدؐ سے انتقام ۲۶ تسکینِ دل کو اپنی جلائیں گے ہم خیام
اسلام کا جہاں میں نہ باقی رکھیں گے نام دیکھے گی آج صبحِ مدینہ، سوادِ شام

لوٹیں گے خاندان علیؑ و بتولؑ کو
برباد کر کے چھوڑیں گے آلِ رسولؐ کو

اس سمت شہ کے ساتھ فقط مخلصین تھے ۲۷ باندھے کفن سروں سے یہ اہل یقین تھے
اہلِ ولا تھے شاملِ فتحِ مُبین تھے دیندار و حق پرست و نگہبانِ دین تھے

ہر فیصلہ حسینؑ کا اِن کو قبول تھا
ہاتھوں میں اِن کے دامنِ ابنِ رسولؐ تھا

سورج چڑھا تو فوجِ مخالف سے آئے تیر ۲۸ اہلِ ستم نے اہلِ حرم پر چلائے تیر
اک بار ظالموں نے ہزاروں لگائے تیر بڑھ بڑھ کے اہلِ خیر نے سینوں پہ کھائے تیر
اس درجہ تیر کھائے کہ چھلنی بدن ہوئے
انصار سب حسینؑ کے خونی کفن ہوئے

جونؑ و بریرؑ و حرِؑ دلاور ہوئے شہید ۲۹ عونؑ و محمدؑ و علیؑ اکبر ہوئے شہید
عباسؑ و قاسمؑ و علیؑ اصغر ہوئے شہید سب خیر خواہِ سبطِ پیمبر ہوئے شہید
اک دوپہر میں گلشنِ حق پائمال تھا
تنہا بوقتِ عصر محمدؐ کا لال تھا

خیمے میں آئے آخری رخصت کو جب امام ۳۰ مولا کے گرد آ گئے اہلِ حرم کے تمام
صدموں سے بیبیوں کو نہ تھی طاقتِ کلام ڈوبے ہوئے تھے سسکیوں میں شاہ کے خیام
حلقے میں لے رکھا تھا شہ مشرقین کو
اور دیکھتی تھیں دور سے فضہ حسینؑ کو

لرزاں تھی کائنات۔ فضا تھی سیاہ پوش ۳۱ آہوں کی آگ بن گیا تھا آنسوؤں کا جوش
اُجڑے ہوئے خیال میں ہر فرد تھا خموش کچھ بھی نہ فرطِ غم سے تھا سیدانیوں کو ہوش
منہ دیکھتی تھی سب کے سکینہ اداس تھی
سہمی ہوئی کھڑی شہ والا کے پاس تھی

اکبرؑ کے غم میں سب کا کلیجہ فگار تھا ۳۲ کیا سانحہ تھا قاسمؑ نوشاہ کی قضا
تصویرِ غم تھیں زوجۂ عباسؑ با وفا اصغر کے غم سے شق تھا کلیجہ رباب کا
زینبؑ کے دل پہ عون و محمدؑ کا داغ تھا
لیکن نظر کے سامنے حق کا چراغ تھا

بولے حسینؑ دیکھ کے سیدانیوں کا حال ۳۳ صدموں پہ صدمے تم نے اٹھائے ہوئیں نڈھال
لیکن رہا جو مرضی معبود کا خیال دیگا جزا عمل کی تمہیں رب ذوالجلال
حق کی بقا کے واسطے دنیا میں ہم رہے
ٹوٹے پہاڑ رنج ، پہ ثابت قدم رہے

مجھ پر ہے فرض وعدۂ طفلی ادا کروں ۳۴ جو کچھ کیا ہے عہد ، خدا سے وفا کروں
جاں دے کے، حق میں اُمتِ جد کے دعا کروں ہنگامِ عصر سجدۂ آخر ادا کروں
حق کا امام ، حق کا علمدار ساتھ ہے
پیارا ہمارا عابدِ بیمار ساتھ ہے

زینبؑ سے بولے پھر یہ شہنشاہِ خستہ تن ۳۵ لے آؤ میرے واسطے نانا کا پیرہن
کر لوں لباسِ سرورِ عالم کو زیبِ تن یعنی بنے گا بعدِ شہادت یہی کفن
دن ڈھل رہا ہے موت کا ہنگام ہے قریب
ہشیار قافلے سے کہ اب شام ہے قریب

زینب جو لائیں پیرہنِ سیّدِ اُمم ۳۶ چھایا کچھ اور خیمۂ اقدس پہ یاس و غم
آنسو رواں تھے سب کے پئے شدّتِ الم ڈوبی ہوئی لہو میں تھی مولا کی چشم نم
اہل حرم کے لٹنے کا دل میں خیال تھا
سیدانیوں کے حلقے میں زہراؑ کا لال تھا

رخصت کے وقت خیمے میں کہرام تھا بپا ۳۷ اہلِ حرم میں شور تھا ہائے حسینؑ کا
غفلت میں تھا مگر اُٹھا بیمارِ کربلا بے چین ہو کے حضرتِ فضّہ سے یہ کہا
کہرام کیوں بپا ہے یہ کیا شور و شین ہے
فضّہ کہو کہاں میرا بابا حسینؑ ہے

فضّہ نے شاہزادے کو رو کر دیا جواب ۳۸ مرنے کو جا رہے ہیں شہ آسماں جناب
یہ رو رہی ہیں زینبؑ و کلثومؑ اور ربابؑ کوئی نہیں، اکیلا ہے فرزندِ بو تراب
ڈوبی فضا ہے غم میں عجب شور و شین ہے
رخصت طلب سبھی سے ہمارا حسینؑ ہے

بولا یہ شاہ زادہ کہ اکبرؑ کہاں گئے ۳۹ قاسمؑ کہاں ہیں ثانئ جعفرؑ کہاں گئے
عباسِ نامدار دلاور کہاں گئے سب خیر خواہِ سبطِ پیمبرؐ کہاں گئے
آئے تھے اپنے ساتھ جو احباب ہیں کہاں
بابا کو جن پہ ناز تھا اصحاب ہیں کہاں

فضہ نے عرض کی کہ وہ سب ہو گئے تمام ۴۰ حق پر نثار ہو گئے اصحابِ نیک نام
گھیرے ہوئے ہیں خیموں کو افواجِ روم و شام باقی نہیں ہے کوئی اکیلے ہیں بس امام
کنبہ ہے اشکبار علیؑ و بتولؑ کا
رونے سے حال غیر ہے آلِ رسولؐ کا

یہ سُن کے شاہزادے پہ صدمہ ہوا کمال ۴۱ بابا کی بے کسی پہ ہوا اس قدر ملال
اُٹھے برائے جنگ مگر ہو گئے نڈھال شدّت ہوئی یہ ضعف کی اُٹھنا ہوا محال
آیا پسینہ ماتھے پہ خاموش ہو گئے
چھایا اندھیرا آنکھوں پہ بے ہوش ہو گئے

دوبارہ ہوش آیا تو خیموں میں آگ تھی ۴۲ ہر سمت گرد و پیش میں پھیلی تھی ابتری
سیدانیوں کے حال پہ روتی تھی بے کسی توہین ہو رہی تھی محمدؐ کی آل کی
بچّے تباہ حال تھے جائے مفر نہ تھی
کیا ہو گا اس کے بعد کسی کو خبر نہ تھی

ڈالی جو اپنے کنبے پہ بیمار نے نظر ۴۳ دیکھا کہ اہلبیت ہوئے ہیں برہنہ سر
خیموں کو لوٹنے میں ہیں مصروف اہل شر ڈر ڈر کے بچّے بھاگ رہے ہیں اِدھر اُدھر
کوئی نہ تھا جو اُن کو زمیں سے اُٹھا سکے
پھولوں کو اپنی گود میں لے کر بچا سکے

اتنے میں آ کے ثانیٔ زہرا نے یہ کہا ۴۴ بیٹا امام وقت ہو تم ، حکم اب ہے ، کیا
باہر ہے اژدحام ، سروں پر نہیں ردا اب کیا کریں کہ آخری خیمہ بھی جل چکا

فرمایا جان بچانے کو باہر نکل چلیں
سب بیبیاں یہاں سے کُھلے سر نکل چلیں

سر کو جھکائے خیموں سے نکلے حرم تمام ۴۵ ظلم و ستم سے اعدا کے جھلسی ہوئی تھی شام
باطل کو زعم تھا کہ لیا حق سے انتقام اور وقت دے رہا تھا زمانے کو یہ پیام

حق کا وقار رکھ لیا نبتِ رسولؐ نے
باطل کا سر کچل دیا آلِ رسولؐ نے

بس اے قلم کہ شب کی سیاہی ہوئی عیاں ۴۶ فطرت ہے اشکبار ، فضا ہے دُھواں دُھواں
بچے ہیں خستہ حال ، ہراساں ہیں بیبیاں گریہ کُناں زمین ہے روتا ہے آسماں

آغا غم والم کا ہے پردہ ردائے شب
اہل حرم کا کوئی نہیں اب سوائے شب

MARSIYA
NAZM KI ASNAF MEIN

ISBN : 0948977-28-0
Educational Pulishing House Delhi
Under License from
INSTITUTE OF THIRD WORLD ART & LITERATURE